سفرِ آرزو

مسرّت سلیم
ایم، اے

MANUSCRIPT PUBLISHING COMPANY
میپکو
اسلام آباد

Marfat.com

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

84153

اشاعت اول ـــــ ۱۹۸۶ء
تعداد ـــــ ایک ہزار
سرورق ـــــ عائشہ ذوالفقار
کتابت ـــــ نوشاد عالم
قیمت ـــــ ۴۵/۰۰ روپے

طابع: ایف ماز پرنٹرز، مرکز جی ۹، اسلام آباد
ناشر: میپکو، پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶۸، اسلام آباد

Marfat.com

امّی، ابّا جی اور بھائی علیم کے نام

شیرینیِ حیات ہے جن ساعتوں کی یاد
ان ساعتوں کو ڈھونڈ کے لائیں کہاں سے ہم

Marfat.com

Marfat.com

فہرست

تعارف: فرخ ذوالفقار ۷
پیش لفظ: رضیہ سیّد ۹
حرفِ چند: ڈاکٹر محمود الرحمٰن ۱۴
سیروا فی الارض ۱۷
لامکاں کے مکان پر ۳۲
آباؤ اجداد کا شہر جدہ ۳۹
لبیک اللھم لبیک ۴۴
روضۂ اقدس کی زیارت ۵۲
بحیرۂ قلزم ۵۵
شاہ عبدالعزیز انٹرنیشنل ایرپورٹ ۵۷
ہٹلر کی سرزمین ـ جرمنی ۶۰
سلفۂ آفاق کے دیس میں ۷۷
جیب میں نہیں دھیلہ ۸۱
ونڈسر کاسل ۸۲
جلاوطنوں کا وطن ـ لندن ۸۶
سکھوں کی بستی ۸۹
دوستی ایسا ناطہ ۹۳
یورپ کی دولہن کا دیدار ۹۷
بادلوں کا گڈریا ـ ایفل ٹاور ۱۰۵
سست رفتار دریائے سین ۱۰۸
یارمن ترکی ۱۱۱
شانزے لیزے کے آس پاس ۱۱۳
جرمن بھی پانی پیتے ہیں ۱۱۴
سیکرے کور کا گرجا گھر ۱۱۵
خانہ بدوش سیاح ۱۱۸
فرانسیسی ریسٹورنٹ ۱۱۹
میٹرو ۱۲۰
فرانسیسی سٹور ۱۲۱
سفرِ مراجعت ۱۲۴
وقفہ بہت ضروری ہے ۱۲۷
لندن کی پاپیادہ سیاحت ۱۲۹
مادام تساد کا مومی گھر ۱۳۷

Marfat.com

بریڈفورڈ۔ ننھا پاکستان ۱۴۲
بلیک پول یا وائٹ اینڈ
برائٹ پول ۱۴۹
یارک و یارک منسٹر و یارک میوزیم ۱۵۸
گراس میتر جھیل، دلآویزی
ورعنائی کا شاہکار ۱۶۸
ایڈنبرا اور گلاسگو ۱۷۵
امریکہ۔ کولمبس کی سرزمین ۱۸۳
سٹورز کی سیر ۱۹۱
امریکہ حسین امریکہ ۱۹۴
نیویارک۔ بلندیوں کا مرکز ۱۹۹
ویلی کا ٹیج ۲۰۸
واشنگٹن ڈی سی ۲۱۳
امریکہ کا قومی ترانہ ۲۱۵
وائٹ ہاؤس ۲۱۷
مونومنٹ ۲۲۰
میوزیم آف نیچرل ہسٹری ۲۲۱
لنکن میموریل ۲۲۱
اسپیس سنٹر ۲۲۱
ڈنر اور سیر سپاٹا ۲۲۴
اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے ۲۲۹
اٹلانٹک سٹی۔ جوتے کی ہٹی ۲۳۴
نیاگرا فال۔ تفریحی جال ۲۳۸
کارننگ سٹور ۲۴۱
ڈراما ان ریبل لائف ۲۴۳
کُہر کی دوشیزہ ۲۴۶
پھول گھڑی ۲۴۷
پیپل لیف ویلج ۲۴۸
ہواؤں کا غار ۲۵۰
سان فرانسسکو ۲۵۵
سنہرا دروازہ ۲۵۸
مچھیروں کی بستی ۲۶۱
ہانگ کانگ۔ خوشبودار بندرگاہ ۲۶۶
دیارِ مصر۔ نگری دولت کی ۲۷۱
سٹار فیری ۲۷۵
بنکاک۔ فرشتوں کا شہر ۲۷۹

Marfat.com

تعارف

مسرت سلیم کو میں اس وقت سے جانتی ہوں جب وہ مسرت الماس ہوا کرتی تھی۔ ہماری دوستی سالوں پر اس طرح محیط ہے کہ ہم اس کی سلور جوبلی بآسانی منا سکتے ہیں۔ ہنستی کھیلتی قہقہے بکھیرتی مسرت نہ صرف کلاس میں سب سے نمایاں تھی بلکہ کھیل کے میدان میں بھی پیش پیش رہی۔ کھیلوں میں اس نے کتنے کپ جیتے، مگر اب جو ادبی میدان میں وارد ہوئی ہے تو جانے یہاں ہارے یا جیتے۔ مگر یہ بھی اس کی سپورٹس مین سپرٹ کا تقاضا ہے کہ حصہ ضرور لینا ہے، فیصلہ تو تقدیر کے ہاتھ میں ہے۔

ہم دونوں نے چار سال کا عرصہ دن رات ایک دوسرے کی معیت میں گزارا۔ مجھے یاد نہیں کہ ہمارے درمیان ایک دن بھی کسی بات پر اختلاف ہوا ہو۔ ہم ایک دوسرے کی پہچان تھے۔ ہماری دوستی بے مثال تھی۔ اگر گیمز سیکرٹری ہونے کے ناتے وہ مجھے گیمز پیریڈ میں بخش دیا کرتی تھی تو میں بھی ہر ماہ دو ماہ بعد ہونے والے کالج فنکشنز کے لئے اس کا اور اپنا ایک جیسا لباس تیار کرتی۔ تب وہ بھیگی بلی بنی میرے لئے چائے پانی کا انتظام کیا کرتی تھی۔

ہوسٹل کی اُن سینکڑوں شاموں میں جو ہم نے اکٹھی گزاریں، صرف ایک شام میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی ہے جب وہ بھائی علیم کی انگلینڈ

Marfat.com

میں شادی کر لینے کا سُن کر رو رہی تھی۔ اس وقت اسے تسلی دیتے ہوتے میں بار بار یہی کہے جا رہی تھی کہ بھلا اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ مگر جب جدائی کی طویل مدت کے دوران بھائی اختر کی انگلینڈ میں ہی وفات کی خبر سُن کر میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی، اس وقت مسرت کا دکھ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔

ادبی لحاظ سے اس سفرنامے کے متعلق میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ میں تو صرف پڑھنے کی حد تک ادبی ہوں۔ لیکن مجھے اپنی دوست کا یہ سفرنامہ اتنا پسند آیا کہ میری ہی تحریک پر اس نے اسے چھپوانے کی جرأت کی۔ اب اس جرأت کا خمیازہ شاید مجھے بھی بھگتنا پڑے، یعنی اگر پڑھنے والوں کو پسند آ گیا تو داد کا کچھ حصّہ مجھے بھی ملے گا۔ اور اگر ناپسند کیا گیا تو بے قدری کا سارا حصّہ میرے کھاتے میں ڈال دیا جاتے گا۔ اس لئے دُعا ہے کہ یہ مقبولِ عام ہو اور ہر دلعزیزی کی سند پاتے۔ آمین

راولپنڈی

فرخ ذوالفقار

ایم، اے

Marfat.com

پیش لفظ

ایک طویل اور دلچسپ سفر نامے کے لئے پیش لفظ یا تعارف لکھنا بے حد مشکل مرحلہ ہوگا، اس کا اندازہ نہ تھا جب میں لکھنے کی تیاری میں تھی تو محض دیباچے کے طور پر مجھے امریکہ کا سفر درپیش آ گیا جس کا یقین نہ جانے سے پہلے تھا نہ اب تک ہے۔ جہاز میں بیٹھتی تھی تو قلم سنبھال لیتی تھی، شاید کچھ لکھ سکوں۔ مگر ہوائی میزبانوں کی میزبانی اور مہربانی سے نپٹ چکتی تو فضا سے زمین کی تلاش شروع ہو جاتی۔ تن تنہا سفر اور نت نئے ہم سفر۔ نئے مقامات نئے تقاضے۔ سفر اور سفر ہی سفر۔

مسرت سلیم جو ایک عرصے سے میری دوست ہے، چھوٹے چھوٹے سفر کو ترستی، مارا مار مغرب سے مشرق ساری دنیا گھوم آئی ہے۔ اس نے یہ سفر نامہ لکھ کر بہت سوں کے لئے نئے افق دریافت کئے ہیں، خصوصاً ایسے شوہروں اور بیویوں کے لئے جو محض سفرِ حیات طے کرنے میں مصروف ہیں اور خدا کی اس خوبصورت، رنگا رنگ، متنوع دھرتی اور اس کی وسعت کو پانے کی کوشش نہیں کرتے۔

مسرت الماس جب کالج میں ہوتی تھی تو بھی ایک بار سے دوسری بار، ایک میدان سے دوسرے میدان تک اسی طرح رواں دواں ہوتی تھی جیسے ابنِ بطوطہ ایک دنیا سے دوسری کو کھوجنے نکل پڑے یا گرم پانیوں کی تلاش میں

Marfat.com

کولمبس امریکہ دریافت کرلے۔ ہم دونوں کالج سے نکلے تو ایک دوسرے کے لئے گم ہو گئے۔ وقت ہمیں مختلف سمتوں میں دھکیلتا، ٹھوکریں لگاتا آگے بڑھتا چلا گیا اور یوں تقریباً بیس سال کا عرصہ گزرنے کے بعد مجھے مسرّت الماس کا سُراغ ملا تو وہ سلیم صاحب کی انارکلی بن چکی تھی۔ میں نے اسے اپنے گھر آنے کو کہا۔ جغرافیہ کی یہ طالبہ اور دنیا کے کھوج کی رسیا پنڈی جیسے ننھے منے شہر میں میرے گھر کا راستہ نہ ڈھونڈ سکی۔ حالانکہ اس کے میاں اور میرے سلیم بھائی کا یہ "علاقۂ واردات"[1] بھی تھا۔ تو خیر بیس سال سے زیادہ عرصہ گزرنے پر اس کا ساتھ ملا تو یہ تمام عرصہ ہماری زندگی میں جیسے شامل ہی نہ تھا، نہ اس کے اثرات، نہ اس کا غم۔ ہماری دوستی جیسی کل تھی، شاید اس سے زیادہ مستحکم اور تازہ دم کیونکہ نوعمری کے جذبے تمام عمروں سے زیادہ جاندار اور پائیدار ہوتے ہیں۔

میں نے اس سفرنامے کا اپنے سفرنامے سے موازنہ نہ کرنے کی کوشش کی جس طرح مسرت کبھی کسی سفرنامے کو اٹلس کی مدد سے واضح کرنے کی کوشش کرتی ہے مگر میرا سفر انگریزی کا SUFFER زیادہ اور اردو کا کم تھا۔ میں یکہ و تنہا ہر آنے والے سفر سے لرزہ براندام، طوالتِ حضر سے خوفزدہ دوبئی، ایمسٹرڈم اور ہیتھرو کے ایئرپورٹ کی بھول بھلیوں میں نوادرات اور جواہرات کو دیکھ کر خوفزدہ ہو رہی ہوں۔ کھانے پینے کی اشیاء کے سٹال پر جہاں شراب سے لے کر دودھ اور دنیا جہان کے پھل اور اشیائے خوردونوش پڑی ہیں، میں حلال و حرام سے متذبذب محض مالٹا اور کیلا کھا کر صبر کر لیتی ہوں۔ اب جو یہ سفرنامہ ہاتھ آیا تو اس کی محبتوں اور شفقتوں کا ذکر پڑھ کر لگتا ہے جیسے میں خود ساتھ ہوں۔ سفر میں حضر میں، یہاں وہاں، ہر

---

[1] سلیم بھائی ان دنوں راولپنڈی کے اسی علاقے کے پولیس افسر تھے۔

Marfat.com

جگہ، ہر سو، ہر طرف۔ کیونکہ یہ سب رشتے ناطے میرے جانے پہچانے، میرے دیکھے بھالے ہیں: بچھڑنے والے امی ابا، بھائی علیم، ان کی یادیں، ان کے نقشِ قدم ذہن پر کندہ ہی نہیں تابندہ ہیں۔ عجیب اتفاق ہے۔ بارہا کتنی طرح کے اتفاقات ہم دونوں کے لئے سانجھے ہو جاتے ہیں۔ دوستیوں میں، محبتوں میں، سفر میں، حضر میں، عزیزوں میں، بچھڑنے والوں میں اور ملنے والوں میں مسلسل اتفاقات ہیں، حادثات ہیں۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ ہم دونوں نے زندگی کو، سفر کو، شریکِ سفر کو مختلف وقتوں میں مختلف نظر سے دیکھا۔ ہر دیکھنے والا اپنی گہرائی اور اپنی بصیرت رکھتا ہے۔ زمانہ وہی ہوتا ہے، مقامات بھی وہی ہوتے ہیں، مگر یہ دیکھنے والے کی نظر ہے جو رنگین محدب شیشے کی طرح نئے پہلو، نئے رنگ، نئی جہتیں اجاگر کرتی ہے۔ روداد ایک ہی کیوں نہ ہو، مگر تجربے کی سچائی اس میں جدّت اور نیا پن پیدا کر دیتی ہے۔ یہ تجربہ ہر ایک کا اپنا ہوتا ہے۔ نیو یارک ہو یا واشنگٹن، برطانیہ ہو یا فرانس، نیاگرا فال ہو یا دنیا کا لمبا ترین لٹکتا ہوا پل، ہر جگہ نئے رابطے، نئے ضابطے، نئی محبتیں، نئی رفاقتیں نظر آتی ہیں۔ یہ صرف رودادِ سفر ہی نہیں، زندگی کی اہم وارداتوں کی روداد بھی ہے۔ یہ آپ بیتی اور سفر نامے کا سنگم ہے جہاں شخصی رنگ حاوی نظر آتا ہے۔ اس کے بغیر تاریخی عمارتیں محض کھنڈرات اور اہرام مصر کی طرح پُر اسرار ہو جاتیں جن کو تلاش کرنا ہمارا آپ کا کام رہ جاتا۔ زندگی کا سفر اتنا طویل، اتنا پُر اسرار اور گھمبیر ہے کہ سوت کے الجھے ڈور کو جتنا سلجھایئے اتنا الجھتے ہیں اور کوئی سرا ہاتھ نہیں آتا۔ ان الجھنوں کو مسرت سلیم نے نہایت مہارت سے سلجھایا ہے: چند مہینوں پر محیط

Marfat.com

سفر کو مختصر اور طویل دونوں طرح سے محسوس کیا ہے۔

اس روداد میں جذبوں کی نرمی اور دلوں کا گداز ہے۔ راتوں کی تیرگی صبحوں کی تابناکی کے ساتھ اس طرح گھل مل گئی ہے جیسے دور پردیس میں بچھڑنے والے اچانک ایک روز ایک دوراہے پر آمنے سامنے کھڑے پائے جائیں۔ نئے راستے، نئے دوراہے، نئے ہنگامے، نئے تقاضے اور نئے جذبے، یہ سب مسرت کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اجنبیت چھٹ جاتی ہے۔ اپنائیت ہی اپنائیت اندر باہر چھا جاتی ہے محبتوں کا احساس، اپنوں کا ساتھ ہر جگہ ہر پل ساتھ ہو تو ایسے میں جہلم ہو یا برطانیہ، جدہ ہو یا فرانس، دیارِ غیر بھی دیارِ یار ہو جاتا ہے۔

کبھی کبھار اس سفر پہ یاسیت اور حزن و ملال کی چھاپ گہری ہو جاتی ہے جب بچھڑنے والوں کا خیال آتا ہے۔ ایسے میں ہر حساس دل کی طرح مسافرہ چپکے چپکے رو کر دل ہلکا کر لیتی ہے، لیکن مہم جوئی کی تڑپ اور سفر کی امنگ اس کو پھر ہم سفر بنا لیتی ہے۔ نئے آسمان اپنی نیلگوں وسعتوں کے ساتھ روشن ہو جاتے ہیں۔ جولائی، اگست انہی جولان گاہوں پر چمکنے لگتے ہیں۔

اس تمام لمحے لمحے کے سفر میں ذہنی طور پر سفر کا احساس غالب ہے۔ کہیں رک بھی جاؤ تو بھی نئی منزل کشاں کشاں کشش کرتی ہے ـــ لپ جھپ، لپ جھپ آگے پیچھے دوڑتے راستے، راہیں، گاڑیاں، ٹرامیں، جہاز، ایئربسیں، سبھی کچھ رواں ہیں اور اس کا ساتھ دیتے ہوئے میں تیز قلم ہونے کی کوشش کرتی ہوں۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح ہنستی مسکراتی کھلکھلاتی لُک چھپ لُک چھپ کرنے لگتی ہے۔ میں پیچھے تعاقب کرتے، وہ آگے سراغ

چھپلتے، سراغ بنا تے. حیات کا یہ سفر رواں دواں ہے۔ ہر سفر میں نئی لذتیں، نئی محبتیں، نئے تجربے، نئی واردات قلب و نظر پنہاں ہوتی ہیں. مجھے امید نہیں یقین ہے کہ مسرت سلیم کا یہ سفر نامہ آنے والے کئی مسافروں کو ان راہوں کے پیچ و خم سے، ان کی سختیوں اور کٹھنائیوں سے ہنستے کھیلتے نکل آنے کی تاب و توانائی بخشے گا۔ وہ جہاں جہاں گئی ہے، قاری انگلی پکڑنے کی کوشش میں پہنچا پکڑ لیتا ہے. اس کا جذبۂ دل ہر جا جوان اور ہر آن رواں. سفر کرنے کے لئے جس حوصلے اور جس تاب و توانائی کا تقاضا ہوتا ہے، مسرت اس سے دل کی گہرائیوں تک نبٹنے اور عہدہ برآ ہونے کی اہل ہے۔

اسکی ذات پر اس کے نصف بہتر کا اثر اور رنگ غالب ہے ہونا بھی کیوں نہیں، برصغیر پاک و ہند کی سرزمین پر پلی بڑھی، پردوں میں ڈھکی چھپی ذات ہے جو پردے سے باہر آتی ہے تو مجازی خدا ہی اس کی دنیائے کل ہوتی ہے۔ مگر الگ تھلگ اپنی دنیا میں گم، دوستوں کا دوست، رفیقوں کا رفیق، محبتوں سے ہم کنار، شہزادہ سلیم سفر میں بھی آرام و سکون کا متلاشی ہے. نیاگرا کا حسن اسے نہیں چونکا تا. بس اتنا غنیمت ہے کہ وہ اپنی رفیقۂ حیات کے ساتھ پیہم رواں ہر دم دواں زندگی نہایت سکون و اطمینان سے گزار رہا ہے۔ دو مسافر ایک ہی راستے کو کھوجتے، ایک دوسرے کے سہارے، ایک دوسرے کے طفیل آگے بڑھ رہے ہیں۔۔ اللہ کرے ان کا ساتھ، ان کا سفر، ان کی منزل ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے اور ان کی ہمت، ان کا عزم، ان کی مسرت ہم آہنگ و ہمسفر!

راولپنڈی

رضیہ سیّد، ایم اے

حرفِ چند

اسلامی معاشرے میں سیر و سیاحت کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے علمِ جغرافیہ سے گہری وابستگی اور فنِ جہاز رانی پر دسترس کاملہ نے مسلمانوں کی "سیر فی الارض" پر عمل پیرا ہونے میں پوری اعانت کی ہے۔ سفر کو وسیلہ ظفر بنانے والے مسلم سیاح کچھ سیکھنے اور کچھ سکھانے کا جذبۂ فراواں لے کر دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہنچتے رہے ہیں۔ ہر خطۂ زمین کا سفر ہی انہیں مرغوبِ خاطر نہ تھا، وہاں کی تہذیب و تمدن کا غائر مطالعہ بھی پیشِ نظر رہا تھا۔ یہی نہیں معاشرت و معیشت کے رنگا رنگ پہلوؤں پر مبنی ایسا سفرنامہ بھی وہ لکھ گئے جس نے تاریخ کے فن کو ابد الآباد تک کے لئے زندگی جاوداں عطا کر دیا۔ ان میں المسعودی، ابوزید سیرافی، البیرونی، ابنِ بطوطہ وغیرہ کے نام خاصے نمایاں ہیں۔ ان سبھوں نے اپنے سفر کے حالات و کوائف تفصیل سے لکھے ہیں۔ ان کے سفرنامے ایسی تاریخ کا درجہ رکھتے ہیں جو مختلف ملکوں کے سیاسی حالات، طرزِ جہاں بانی اور لوگوں کے رہن سہن کا ٹھوس ثبوت فراہم کرتی ہے۔ گویا ہمارے جلیل القدر سیاحوں نے رودادِ سفر کے آئینے میں ہر ملک کے خط و خال کو اجاگر کر دیا ہے۔ اس اسلامی فن کو ہر دور میں مسلم سیاحوں نے سنبھال کر رکھا اور اپنے اپنے مشاہدات و تجربات سے اس کو مزید تاب و توانائی بخشی۔ انہی میں انیسویں صدی کا سیاح ناصر الدین شاہ قاچار تھا جس نے یورپ اور امریکہ کی سیاحت کے بعد فارسی زبان میں اپنا سفرنامہ تین جلدوں

Marfat.com

میں لکھا ــــــ غرض عربی ہو یا فارسی، ہر دو زبان میں سفرناموں کا ایک ایسا سلسلۂ دراز ملے گا جو مسلمانوں کے شوق و جذبے کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ماہ وسال کی دبیز گرد بھی جس کی تابانی کو ماند نہیں کرسکی۔

اردو بھی اسلامیانِ پاک وہند کی ایک دقیع زبان ہے جو ان کی تہذیب و روایات کا مظہر رہی ہے۔ اس قومی زبان میں سفرنامے کی صنف دیگر اصنافِ ادب کی طرح نازہ ولایت نہیں ہے۔ اس کی جڑیں ماضی بعید میں دُور دُور تک پھیلی ہوتی ہیں۔ یوسف خان کمل پوش پہلے شخص تھے جنہوں نے "عجائباتِ فرنگ" کے نام سے اردو کا پہلا سفرنامہ ۱۸۳۷ء میں لکھا۔ بعدازاں سرسید احمد خان نے ۱۸۶۹ء میں "مسافرانِ لندن" لکھ کر اس صنف کو آگے بڑھایا۔ ان ہی کے ہمعصر اور سیرۃ النبیؐ کے مصنف علامہ شبلی نعمانی ۱۸۹۲ء میں ترکی و شام جیسے اسلامی دیار کے سفر پر نکلے اور اپنے تاثرات کو ایک سفرنامے کی صورت میں پیش کر گئے۔

یوں تو سید و شبلی کے بعد خواجہ حسن نظامی، مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ نے گاہے بگاہے سفرنامے کے فن کو رنگ و نور عطا کیا، لیکن باقاعدگی سے اسے موضوعِ تحریر نہیں بنایا گیا۔ مقامِ مسرت ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد اس فن کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ اس صنف کا باقاعدہ احیاء شاہد احمد دہلوی کے ہاتھوں عمل میں آیا جنہوں نے "دلی کی بپتا" لکھ کر سفرنامے کے سرے کو سید و شبلی کے دَور سے ملا دیا، اور اس طرح درمیان کا ایک وسیع خلا رپورتاژ کی شکل میں پُر ہو گیا۔ پھر تو سلسلہ چل نکلا اور ادیبوں کی کھیپ کی کھیپ اس صنفِ گم گشتہ کو رنگ و رعنائی سے مرصع

Marfat.com

کرنے میں منہمک ہو گئی۔

اب اس صنفِ ادب کے افق پر ایک ایسا ستارہ اُبھرا ہے جس نے اپنی ضیا پاشیوں سے آنکھیں چکا چوند کر دی ہیں۔ میری مراد مسرت سلیم صاحبہ سے ہے جنہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز "سفرِ آرزو" لکھ کر کیا ہے اور اس طرح ایک نئی روایت کی داغ بیل ڈالی ہے۔ جغرافیہ کی طالبہ ہونے کے ناطے اٹلس کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ شاید اس انہماک میں شوقِ سفر کی شدت بھی شامل تھی جب ہی تو قدرت نے انہیں ۱۹۸۳ء میں تقریباً پوری دنیا کے گرد سفر کا موقع عنایت کیا۔ اس پاکستانی سیاح نے ابنِ بطوطہ کی طرح اپنی سیاحت کا آغاز مکہ و مدینہ جیسے مقاماتِ مقدسہ سے کیا۔ اور پھر یورپ، امریکہ اور مشرقِ بعید تک ہو آئیں۔ انہوں نے صرف سیر و تماشا پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ ہر ملک کے جغرافیائی خد و خال، تاریخی عوامل، تہذیبی ماحول، ثقافتی رنگ، سائنسی تحقیق اور صنعتی ترقی کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ وہاں کے رہنے والوں کے من میں جھانک کر شعور کی رَو کو بھی گننے کی کوشش کی ہے۔ پھر مسرت نے دیارِ غیر میں بسنے والے پاکستانیوں کے جذباتِ دروں کو صحیح تناظر میں دیکھا ہے۔ غرض "سفرِ آرزو" مصنفہ کے اپنی مشاہدات و تاثرات پر مبنی ایک ایسا سفر نامہ ہے جس میں ہر ملک اپنے مخصوص پیچ و خم کے ساتھ جھلکتا ہے۔ میں یہ کہنے میں غلطی کا ارتکاب نہیں کروں گا کہ "سفرِ آرزو" کی اشاعت "عجائباتِ فرنگ" اور "مسافرانِ لندن" تک اپنا رشتہ جوڑ لیتی ہے۔ ایک ایسا رشتہ جو اردو ادب کے لئے خوش آئند بھی ہے، روح پرور بھی!

اسلام آباد

ڈاکٹر محمود الرحمٰن

سِیرُو فِی الاَرضِ

سفر وسیلۂ ظفر ہے۔ بچپن میں یہ فقرہ بارہا سنا تھا، پڑھا بھی تھا اور ذہن میں ہمیشہ سفر کو تلاشِ روزگار، ذریعۂ آمدنی اور غربت کے خاتمے کا وسیلہ جانا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ اپنے ملک میں گھر گھر سے لوگوں کو حصولِ روزگار کے لئے رختِ سفر باندھتے دیکھا تو بچپن کے سُنے ہوئے الفاظ حقیقت کا روپ دھارنے لگے۔ مگر ان سب حقیقتوں سے پرے، اپنے من میں سفر کسی اور ہی روپ میں جلوہ گر تھا۔ میرا دل یہی چاہتا کہ آوارہ گردوں کی طرح پھرتی رہوں، شہر شہر سے گزروں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیوں۔ کوئی ذمہ داری نہ ہو، کوئی گھرداری نہ ہو، کوئی ناطہ قدم نہ روکے۔ کوئی رشتہ راہ میں رکاوٹ نہ ڈالے۔ مگر یہ سب کیسے ہو؟ کیونکر ہو؟ تو حل یہ نکلا کہ میں نے ایسی کتابیں جمع کرنا شروع کر دیں جن میں مسافر دور دراز کے سفر کرتے، صحراؤں کی خاک چھانتے، دریاؤں کو پھلانگتے، گھنے جنگلوں سے گزرتے، سمندروں کا سینہ چاک کر کے راستے تلاش کرتے اور آخر کار منزل تک پہنچتے تھے۔ ایسے سفرنامے پڑھنے شروع کر دیئے جن میں اَن دیکھی دنیاؤں کے حال درج ہوتے، اجنبی ملکوں کا ذکر ہوتا اور میں سوچتی کہ کتنے خوش نصیب

Marfat.com

لوگ ہیں جو ان علاقوں کی طرف پرواز کرتے ہیں جہاں میرا تخیل بھی نہیں پہنچ سکتا. رات کو سیاہ آسمان پر جگنو کی طرح چمکتے جہاز کو دیکھتی اور ان کے اندر بیٹھے ہوتے مسافروں کی قسمت پر رشک کرتی. سفر نامے پڑھتے وقت اٹلس ساتھ رکھ لیتی. جوں جوں مصنف آگے بڑھتا، توں توں میں نقشہ دیکھ کر ساتھ ساتھ چلتی. میرا چھوٹا بھائی عرفان مذاق اڑاتا اور کہتا: "اصل میں باجی یہ دیکھتی ہے کہ مصنف کہیں جھوٹ تو نہیں بول رہا"۔

رنگ برنگی اٹلس، خوبصورت نقشے، نیلے سمندر، سبز میدان، پیلے صحرا، براؤن پہاڑ، غرضیکہ یہ رنگوں کی دھنک رنگ دنیا مجھے ایسی اچھی لگتی جیسے عورتوں کو خوبصورت پرنٹ کے کپڑے! رات کو دیر تک پڑھنے اور بار بار اٹلس کھول کر مطلوبہ جگہ ڈھونڈنے سے آنکھوں میں آنسو آجاتے، نظر پتھرا جاتی، مگر نقشے سے نگاہ اٹھانے کو جی نہ چاہتا. سچی بات تو یہ ہے کہ حقیقت میں سفر پر جانے سے پہلے میں نے سینکڑوں بار سفر کیا. ویوماسٹر کی کئی فلمیں جمع کیں اور دن میں کئی بار انہیں دیکھتی ۔

کہاں کی سیر نہ کی توسنِ تخیل پر
ہمیں تو یہ سلیمان کے تخت ایسا تھا

شاید یہی خواہش تھی کہ جغرافیہ شروع سے ہی اپنا پسندیدہ مضمون ٹھہرا. کالج میں گئی تو لڑکیاں جغرافیہ کو سخت خشک اور بور مضمون گردانتی تھیں، مگر میرے لئے اس میں دلچسپیوں کا جہان آباد تھا. جغرافیہ کی کلاس میں گنی چنی لڑکیاں نظر آتیں، وہ بھی اکثر بیزار. اپنی کلاس میں جغرافیہ میں میں ہمیشہ فسٹ آتی. ممکن ہے اس میں میرے برج کا بھی اثر ہو جو "قوس"

Marfat.com

ہے۔ قوس لوگوں کو سفر کا جنون ہوتا ہے۔ بی اے میں ہوا یوں کہ میرے علاوہ کوئی اور لڑکی جغرافیہ لینے پر رضامند نہ تھی۔ جغرافیہ کی پروفیسر مس نظام چاہتی تھیں کہ میں بھی نہ لوں ورنہ تو اُن کو خوامخواہ ایک لڑکی کی وجہ سے لیکچر تیار کرنا پڑتا۔ تھرڈ ایر کی کلاس لینی پڑتی۔ انہوں نے خود بھی سمجھایا۔ اکنامکس کی پروفیسر سے بھی کہلوایا۔ ہر حربہ آزمایا کہ میں یہ مضمون چھوڑ کر کچھ اور لوں۔ مگر اپنی تو ایک ہی رٹ یا تریا ہٹ کہ "زمین جنبد نہ جنبد گل محمد" کے مصداق لینا ہے تو جغرافیہ! اس پر کسی اور مضمون کو فوقیت نہ دوں گی۔ آخر بےچاری تھک ہار کر کہنے لگیں: "دیکھو مسرت! میں ایک ہفتہ تمہیں پڑھاتی ہوں، پھر تمہارا ٹیسٹ ہوگا۔ اگر تم کامیاب ہوگئیں تو جغرافیہ لے لینا، اگر فیل ہوگئیں تو کوئی اور مضمون چن لینا۔"

میں نے کہا: "یہ منظور ہے۔" اب ایک ہفتے کے گنے چنے دن کچھ یوں گزرے کہ جغرافیہ کا کمرہ، تنہا طالب علم اور سامنے ڈائس پر استاد! نظریں اٹھتیں تو اُن کو اپنی طرف ہی متوجہ پاتی۔ نوٹس لکھتے لکھتے ہاتھ کانپ جاتے، اُن کی مجبوری اور اپنی ہٹ دھرمی کا خیال آجاتا اور کچھ دیر کے لیے پتہ ہی نہ چلتا کہ وہ کیا بتا رہی ہیں اور میں کیا لکھ رہی ہوں۔ بہرحال، ہر پیریڈ کے بعد لائبریری میں جاتی۔ جو کچھ پڑھایا گیا ہوتا، اس کے ازسرِنو نوٹس تیار کرتی۔ جان سولی پر اٹکی محسوس ہوتی۔ یہی خوف کہ اگر فیل ہوگئی تو! اور دل میں یہ بھی پکا یقین کہ وہ فیل کر دیں گی اور میں جغرافیہ نہ پڑھ سکوں گی۔ بھلا یہ شرط کیوں مانی۔

ہفتہ گزر گیا۔ ٹیسٹ کا دن آن پہنچا۔ امتحان دیا۔ اب ریزلٹ کا

Marfat.com

انتظار، سخت ذہنی کوفت میں دن گزرا۔ دوسرے دن نتیجہ نکلا تو دس میں سے چھ نمبر حاصل کئے تھے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ پاس ہو گئی۔ پھر تو سارا سال تنہا اکیلے کمرے میں بیٹھ کر اپنی پروفیسر سے لیکچر سنتی رہی۔ وہ کہا کرتی تھیں: "مسرت میری وحدہٗ لاشریک لہٗ طالب علم ہے"۔ فورتھ ایئر میں دو اور لڑکیاں آن ملیں جو بی۔اے میں فیل ہو گئی تھیں۔ یوں قدرے سکون سے پڑھائی کی۔

جغرافیہ کا کمرہ کالج میں میرے لئے روحانی خوشی کا سرچشمہ تھا۔ ہر طرف دنیا کے نقشے لٹکتے ہوئے نظر آتے۔ گلوب، سروے کا سامان، خوبصورت اٹلس، رنگین نقشوں سے آراستہ دیواریں، الماریوں میں چنی ہوئی کتابیں دیکھتی تو یہی دل چاہتا کہ دن رات یہیں بیٹھی رہوں۔ آج بھی جب تصور میں وہ کمرہ لاتی ہوں تو انجانی سی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ آج بھی نقشے اور اٹلسیں میرے لئے آرٹ کے بیش قیمت نمونوں سے کم نہیں!

شادی ہوتی تو کچھ عرصے کے لئے سبھی مضمون ذہن سے رفوچکر ہو گئے۔ سارا جغرافیہ بھول گیا۔ رہ گیا تو بس یہی یاد رہ گیا کہ سسرال کا جغرافیہ کیا ہے۔ میرے سسر صاحب مجھے نئے مضامین سمجھاتے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ "مسرت! تمہارے لازمی مضامین تمہاری سگی نندیں ہیں باقی رشتہ دار تو اختیاری مضامین ہیں۔ کوشش کرو کہ لازمی مضامین میں پاس ہو جاؤ"! تو یوں سمجھئے کہ کتنے سال ان لازمی مضامین کو پاس کرنے کی جدوجہد میں بیت گئے۔ جوانی گزر گئی۔ بڑھاپا دستک دینے لگا۔ نندیں اپنے اپنے بچوں میں مگن ہو گئیں۔ ہیں اُن کے حافظے سے اترنے لگی تو میں نے اطمینان

Marfat.com

کا سانس لیا۔ پرانی کتابیں اکٹھی کیں۔ نئی کتابیں خریدیں۔ خوبصورت سی بک شیلف بنوائی۔ کتابوں کو جھاڑ پونچھ کر ترتیب دیا تو دل کا پرانا شوق جو جانے کن کونوں کھدروں میں جا سویا تھا، وقت کی دھول جھاڑ کر ایک انگڑائی لیتے ہوئے بیدار ہو گیا۔ کتابیں کھولیں تو دل میں خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ بازار میں دیکھا نو نت نئے سفر نامے موجود جو میری زندگی میں ہوا کے تازہ آکسیجن سے لبریز جھونکوں کی طرح در آتے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر سفر ناموں کی کتابیں حاصل کرتی۔ جو ہاتھ لگا پڑھا۔ جو کتاب کسی کے پاس دیکھی، مانگ لی۔ جو خرید سکی وہ خرید لی۔ اٹلس لے کر رات گئے تک جاگ جاگ کر پڑھتی۔ جوں جوں لوگ سفر میں آگے بڑھتے، میں ساتھ ساتھ چلتی۔ جن جگہوں کو اُن کے قدم چھوتے، میری روح وہاں تک ہو آتی۔ تصور کی آنکھ سے سارے شہر نظروں سے گزرے۔ قطب شمالی کے برف پوش میدانوں سے لے کر افریقہ کے تپتے صحراؤں تک گئی، چاہے حقیقت میں ساہیوال سے آگے جانے کا بھی اتفاق نہ ہوا تھا مگر تصورات میں جانے کتنی دفعہ دنیا کا چکر کاٹ لیا۔ کبھی کسی راہرو کے ساتھ خانہ بدوشوں کی طرح، کبھی دوسر مسافر کے ساتھ اعلیٰ ترین ہوٹلوں میں رہائش پذیر ہو کر، کبھی نیسرے کے ساتھ خصوصی پروازوں سے حکومتی مہمان کی حیثیت سے! ہر دفعہ سفر کا نیا مزا آیا، نیا لطف محسوس ہوا۔ شاید زندگی اپنی انہی خطوط پر گزر جاتی، مگر وہ جو کہتے ہیں کہ بارہ برس کے بعد خدا رُوڑی کی بھی سنتا ہے تو پندرہ شادی شدہ سالوں کے بعد رحمتِ حق کو جوش آیا، ایک دم کاتبِ تقدیر کو حکم ہوا کہ اس جنم جنم کی پیاسی کو اتنا سیراب کرو کہ اسے کسی چیز

Marfat.com

کی حسرت نہ رہے۔ تو جناب بحکم باری تعالے نے ۲۶ جولائی ۱۹۸۳ء کو ہمارے اس خوشگوار سفر کا آغاز ہوا جس میں ہم دونوں میاں بیوی نگری نگری پھرے۔ ان دریاؤں، پہاڑوں اور میدانوں کو ہوا کے دوش پر سوار ہو کر عبور کیا جو اس سے پہلے نیلی لکیریں، خاکی سبز رنگ اور کالے نقطوں کی صورت میں ذہن میں آباد تھے۔ ان جگہوں کو مجسم رونقوں سے بھرپور، زندگی سے معمور، جیتا جاگتا دیکھا۔ اللہ کا شکر ادا کیا اور اس کی اس آیت پر کامل ایمان اور پکا یقین ہو گیا کہ وہ جسے چاہے اپنی نعمتوں سے نوازے۔

سلیم صاحب کو اس سفر میں ایک اہم کام بھی سرانجام دینا تھا۔ ان کا چھوٹا بھائی سعادت پیرس میں بسلسلہ روزگار مقیم تھا۔ اس کے متعلق اطلاع ملی تھی کہ اس کے دل کا ایک والو (VALVE) بند تھا۔ سلیم صاحب چاہتے تھے کہ چونکہ بیرونِ ملک سرجری کی اعلیٰ سہولتیں موجود ہیں، اس لئے وہاں بھائی کا آپریشن اپنی موجودگی میں کروا دیں۔ انہوں نے تو یہ ضروری جانا تھا، میں نے التجا کی کہ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ سنا ہے وہاں پورٹر نہیں ملتے، لانڈری کا خرچ زیادہ ہے۔ ساتھی کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ میں آپ کا سامان سنبھالوں گی۔ کاغذات درستگی سے رکھوں گی۔ بوقتِ ضرورت بطورِ ذاتی خادمہ، دھوبن، پورٹر، سبھی طرح سے کام آسکوں گی۔ پھر میری دیرینہ آرزو بھی پوری ہو جاتے گی جس کا آئندہ زندگی میں پورا ہونے کا دُور دُور تک امکان نظر نہیں آتا۔ میرے خرچ کی پروا نہ کریں۔ میں اپنا زیور بیچ دونگی۔ والد صاحب مرحوم کے ترکے سے جو رقم ملنی ہے وہ ابھی امی سے لے لوں گی۔ مگر مجھے ضرور لے چلیئے۔

84153

Marfat.com

بارے خدا میری التجاؤں کو شرفِ قبولیت ملا اور یوں میں دنیا کے سفر پر روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگی۔

خیال تو یہ تھا کہ گھر سے اجازت ملنا، حکومت کا راضی ہونا اور رقم کا جیب میں موجود ہونا ہی سفر کی تیاری کے مکمل ہونے کا اعلان ہے۔ مگر یہیں ہم سے غلطی ہو گئی۔ سفر کا اصل مرحلہ تو ویزا لگوانے کا ہوتا ہے۔ فرانس اور انگلینڈ تو ضرور جانا تھا جب امریکہ میں مقیم چھوٹے بھائی ظفر کو پتہ چلا کہ باجی انگلینڈ تک آرہی ہے تو اُس کا فون آگیا کہ میرے پاس ضرور آیئے۔ میں آپ کو کینیڈا بھی دکھا دوں گا، خوب سیر کراؤں گا۔ چلئے جناب فرانس میں سلیم صاحب کے بھائی، انگلینڈ میں میرے بھائی جاوید اور سلیم صاحب کی بہن کشور اور امریکہ میں ظفر کی موجودگی سے رہائش کا مسئلہ بخوبی حل ہو گیا۔ اب ان ملکوں کا ویزا لگوانا تھا۔ کینیڈا اور امریکہ والوں نے تو فوری طور پر ویزا لگا دیا۔ اصل مسئلہ تو لازمی ملکوں یعنی فرانس اور انگلینڈ کے ویزا کے حصول میں پیش آیا۔ ابنِ بطوطہ، مارکوپولو اور واسکوڈی گاما اگر آج کل کے دور میں ہوتے تو ویزا لگوانے کے طویل اور صبر آزما مرحلہ طے کرنے کے بعد ایمبیسی کی عمارت کے اندر ہو آنے میں ہی اپنا سفر مکمل سمجھتے یعنی جس جس ایمبیسی میں گئے، اُس اُس ملک سے ہو آتے۔

انگلینڈ والوں نے تو ویزا نہ لگانا تھا نہ لگایا۔ پنجابی میں کہتے ہیں:
"ایک نہ سو سکھ"۔ بس ان کی ایمبیسی کم از کم ویزا جاری کرنے کا کوئی کام نہیں کرتی۔ ان سے مایوس ہو کر فرانس ایمبیسی کا رخ کیا تو روح فرسا حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ جولائی کا پہلا ہفتہ، رمضان کا مہینہ، گرمی کی حدت،

Marfat.com

پیاس کی شدت، نہ بیٹھنے کی جگہ نہ کھڑے ہونے کی۔ برآمدے میں نوٹس لگا ہوا تھا کہ فرانس ایمبیسی میں حالیہ حملوں کی وجہ سے کمرے کے اندر صرف پانچ آدمی بیک وقت آسکتے ہیں۔ حالتِ زار یوں تھی کہ دروازے کے سامنے پندرہ بیس آدمی پسینے سے شرابور، ایک دوسرے سے چپاں، اسی تاڑ میں کھڑے تھے کہ دروازہ کھلے اور وہ دھاوا بولیں تاکہ اُن پنجتن میں اُن کا بھی وجود ہو۔ بقایا انہی آدمیوں کے رشتہ دار، عزیز، بہن بھائی برآمدے میں ٹکریوں کی صورت میں کھڑے ہیں کیونکہ بیٹھنے کے لئے کوئی چیز دستیاب نہ تھی۔ ہم بھی دوسروں کے ساتھ اندر کمروں میں لگے ایئر کنڈیشنروں کی گرم تپتی ہواؤں کے جھلسا دینے والے تھپیڑوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار کی طرح کھڑے ہو گئے۔ کیسے علم تھا کہ پیرس جیسے خوشبوؤں، روشنیوں اور نت نئے فیشنوں کے شہر یا کینز (CANES) نائیس (NICE) اور مارسیلز (MARSEILLES) جیسے خوبصورت ساحلی علاقوں کے ملک کے لئے ہمیں ایسے روح فرسا حالات سے گزرنا پڑے گا۔ کیا جانئے اس وقت کیا کیا دلِ ناشاد میں آیا۔ بہرحال، سلیم صاحب کی سرکاری حیثیت اور ظاہری وجاہت سے متاثر ہو کر رضوان نے جنتِ ارضی کا دروازہ خصوصی طور پر ان کے لئے الگ کھولا اور یہ اندر چلے گئے، جب کہ میں تصور ہی میں ان کو یخ بستہ کمرے میں بیٹھے دیکھ کر اپنے دل میں ٹھنڈک اتارتی رہی۔

کاغذات کے اندراج اور پاسپورٹ لینے کے بعد ایمبیسی والوں نے سلیم صاحب کو ۱۱ جولائی کو ساڑھے بارہ بجے آنے کو کہا، مگر میں نے ڈھائی بجے پڑھا اور پڑھ کر خوب ذہن نشین بھی کر لیا کہ آئندہ تمام سفر میں

Marfat.com

کاغذات سنبھالنا" تاریخیں یاد رکھنا اپنا ہی کام تھا۔ لیکن پہلا ہی کام غلط کیا۔ سلیم صاحب گیارہ جولائی کو بارہ بجے تک اسلام آباد میں رہے۔ ساڑھے بارہ بجے گھر پہنچے۔ گرمی نے حشر برپا کیا ہوا تھا۔ باہر قیامت کا سماں تھا۔ دو بجے بمشکل ان کو تیار کیا کہ چل کر فرانس ایمبیسی سے پاسپورٹ لے آتے ہیں۔ جب تیار ہو کر کاغذ نکالا تو دیکھا کہ وقت تو ساڑھے بارہ تھا جو گزر چکا ہے۔ سلیم صاحب بیزار ہو گئے۔ کہنے لگے۔ اب رہنے دیتے ہیں۔ میں چونکہ تیار ہو چکی تھی اور سراپا اشتیاق تھی، اس لئے اصرار کیا کہ نہیں، چلتے ہیں۔ شاید دے ہی دیں۔ پھر کل پرسوں تک عید متوقع ہے اور خیال ہے ایمبیسی عید کے لئے بند ہو جائے گی۔ چنانچہ گھر سے تیار ہو کر نکلے۔ ہمارا گھر سیٹلائٹ ٹاؤن میں واقع ہے۔ اس کے چاروں طرف اندھے موڑ ہیں۔ مشرق، مغرب، شمالاً، جنوباً ہر طرف ایک یا دو اندھے موڑوں سے واسطہ پڑتا ہے کونے پر واقع مکین اونچی اونچی باڑیں لگا کر سڑک کا دوسرا حصہ نظر سے بالکل غائب کر دیتے ہیں۔ متوسط طبقے کے لوگ رنگین پھولوں، سرسبز بوٹوں، متنوع پودوں اور باڑوں والے گراسی پلاٹ کا شوق اسی صورت میں پورا کرتے ہیں کہ آدھی سڑک تو دونوں اطراف پر واقع مکان والے اپنا لان بنا کر قبضہ کر لیتے ہیں۔ بقایا کمی وہ لوگ پوری کر دیتے ہیں جن کے گیراج نہیں یا گیراج تو موجود ہے، مگر گاڑیاں دو دو ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ جاپانیوں کی طرح جس کے ہاؤس گیراج نہ ہو، اسے گاڑی خریدنے کی اجازت نہ دی جائے۔ بہر حال، سرکار اپنے طور پر تین چار سال کے بعد جوش میں آکر باڑیں توڑتی، تجاوزات ہٹاتی اور

Marfat.com

سڑک کشادہ کرتی ہے، مگر پھر آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے سے باڑیں بنتی ہیں، لان تیار ہو جاتے ہیں، پودے لہلہانے لگتے ہیں، سڑک شرم سے منہ چھپاتی ہے اور زندگی مخصوص نظریے کے تحت رواں دواں ہو جاتی ہے۔

گھر سے نکلے بمشکل دو منٹ ہوتے ہوں گے کہ ایک اندھا موڑ آیا۔ اُدھر سے ایک گاڑی آئی، اِدھر سے ہماری گاڑی چند سیکنڈ کا فاصلہ اور آمنے سامنے کی ٹکر! سلیم صاحب نے تیزی سے دوسری طرف سٹیرنگ گھمایا تو گاڑی بجلی کے کھمبے سے جا ٹکرائی۔ شیشے ٹوٹ کر میری پیشانی میں آن لگے۔ شکر ہے آنکھیں بچ گئیں۔ اس وقت تو چوٹ کا احساس نہ ہوا، صرف حیرت ہوتی کہ زندہ کیسے ہوں، بچ کیسے گئے۔ سلیم صاحب نے خون ابلتا دیکھا تو پوچھا: "زیادہ تکلیف تو نہیں ہو رہی؟" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ جاننے والے لوگ جمع ہو گئے۔ گھر واپس پہنچے تو بچے حیران کہ ابھی تو بھلے چنگے نکلے تھے، ابھی کیا افتاد آن پڑی کہ زخمی ہو کر آ گئے۔ سلیم صاحب کی ناک سے خون بہہ رہا تھا، میری پیشانی سے کپڑے خون سے رنگین۔ بچوں کو حیران و ششدر چھوڑ کر سنٹرل ہسپتال پہنچے۔ مجھے تو پیشانی پر ٹانکے لگے۔ سلیم صاحب کے زخموں پر روئی کے پھاہے لگا کر فارغ کر دیا گیا۔ ہائے فرانسیسی ویزے! تم نے تو ہماری جان ہی لے لی تھی۔

فرانسیسی ویزے نے ہمارا ایسا جوش و خروش مدھم کیا کہ پھر کسی ملک کا ویزا لگوانے کی ہمت نہ پڑی۔ یوں ہی جولائی کا مہینہ گذرا۔ عید

Marfat.com

آئی اور خاموشی سے گذر گئی۔ دل غم سے چُور تھے۔ جب پچھلی عید آئی تھی، آبا جی زندہ تھے۔ اور اب کے وہ پُر نور چہرہ، وہ پُر شفقت ہستی یاد آئی اور بے اختیار یاد آتی جو ہمارے لئے محبت اور پیار کا سرچشمہ تھی، روشنی کا مینار تھی۔ جس کی قربت مشامِ جاں کے لئے طمانیت و سکون کا باعث تھی۔ جس نے کینسر جیسے موذی اور تکلیف دہ مرض میں ایک دفعہ بھی اُف نہ کی۔ جب تک بیٹھنے کی طاقت رہی، بیٹھ کر نماز ادا کرتے رہے۔ جب سارا جسم بے جان ہو گیا تو سارا سارا دن تلاوت کرتے۔ اُن کے آخری دنوں میں بیشتر وقت یہی خواہش رہی کہ اُن کے قریب بیٹھ کر سورۃ رحمٰن اور سورۃ یٰسین کی تلاوت کی جاتے۔ ان کی زبان ذکرِ الٰہی سے تر رہی۔ خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ان کی یاد تو سرمایۂ حیات ہے۔ مگر بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں کہ آنسو اُبل اُبل پڑتے ہیں۔ یہ کب علم تھا کہ اگلی عید پر ممتا کی ٹھنڈی چھاؤں سے بھی محروم ہو جاؤں گی۔ یوں آگے پیچھے دو مہربان و مشفق ہستیاں چھ ماہ کے قلیل وقفے میں داغِ مفارقت دے جائیں گی ؎

شکیب ویپ سے لہرا رہے ہیں پلکوں پر
دیارِ چشم میں کیا آج رت جگا ہے کوئی

اُن دنوں میں سلیم صاحب کی گاڑی بیکار ہو چکی تھی۔ اگرچہ اُن کے ایک کرم فرما نے اپنی گاڑی عاریتاً دے دی تھی کہ جب تک چاہو چلاؤ۔ اس سے کام تو چل نکلا، مگر اپنا کام اب بگڑا کہ ٹلنگے کی پیشانی کے ساتھ گھر کی چار دیواری میں قید ہو گئے۔ ایک تو پہلے بھی ماشاء اللہ تھے،

Marfat.com

اب سبحان اللہ ہو گئے. لیکن چونکہ یہ زخم اپنے حقیقی اور مجازی خدا دونوں کی دین تھے، اس لئے الحمدللہ اور جزاک اللہ کے الفاظ وردِ زبان رہے۔

عید سے ایک دن پہلے یہ حادثہ ہوا۔ امی سے ملنے عید پر نہ گئی کہ دیکھ کر پریشان ہوں گی. مگر جانے کیسے اُن کو خبر ہو گئی اور وہ عید کے تیسرے روز ہی آ گئیں. میرا صدقہ اتارا، اتنا پیار کیا کہ دل بھر آیا۔ دونوں ماں بیٹی غم سے چُور دلوں کے ساتھ روتی رہیں. پھر اُن کے جانے کے بعد دن ایسی بے تعلقی سے گزرے جیسے سفر پہ ہم نہیں ہمارے ہمسائے جا رہے ہوں۔ ٹانکے کھلے تو سلیم صاحب کو کچھ خیال آیا اور سفر کی تیاریاں پھر زور و شور سے شروع ہو گئیں. کسی نے کہا یورپ جاؤ اور جرمنی نہ جاؤ تو سمجھو کچھ دیکھا ہی نہیں. سوچا کہ انھوں جرمنی کا ویزا بھی لگوا لیتے ہیں، شاید وقت مل جائے، موقع ہاتھ آجائے تو ہٹلر کا دیس بھی دیکھ لیں اور ان لوگوں سے ملیں جن کے آباؤ اجداد نے ہٹلر کی آواز پر لبیک یعنی HALE HITLAR کہا اور ساری قوموں کے مطعون بنے، مگر اب بھی سر اٹھا کر جی رہے ہیں. جرمن ایمبیسی گئے تو وہ بھی فرانس والوں کی طرح اڑ گئے کہ پہلے اپنے کسی جاننے والے کا ایڈریس لاؤ۔ وہاں سے ہم تصدیق کریں گے پھر ویزا لگائیں گے۔ ہم نے بہترا کہا کہ ہمارے واقف کار وہاں موجود تو ہیں، مگر اس وقت ان کا ایڈریس دستیاب نہیں، مگر وہ نہ مانے. جرمن ایمبیسی میں ایک جرمن خاتون مسز احمد ہیں. کمال کی اردو بولتی ہیں۔ ان سے فون پر بات کی مگر وہ کہنے لگیں: "مجبوری ہے۔ ایسے ویزا نہیں لگ سکتا" میں نے کہا کہ جرمنی میں ہمارے صرف ایک حقیقی رشتہ دار ہیں، اور وہ ہے پاکستان ایمبیسی. مگر وہ رضامند نہ ہوئیں۔

Marfat.com

مجبوراً گھر واپس آگئے۔ میں نے ساٹھ پیسے کا لفافہ لیا اور مسز احمد کو خط لکھا:

"بہن جی!

ہمارا مقصد وہاں سیاسی پناہ لینا نہیں، ذرا تمہارے ملک کی خوبصورتی، صفائی ستھرائی اور زیبائش کو نظریے خوش گزرے کے تحت دیکھنا منظور ہے۔ ہم لوگوں نے تم لوگوں کی ہمت و دانش کے قصے سنے ہیں۔ ذرا ایسے لوگوں کو نزدیک سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کا کیا جاتا ہے اگر اجازت مرحمت فرمائیں۔"

قسمت کی خوبی دیکھئے، جواب آن پہنچا کہ ہیلتھ سرٹیفکیٹ اور کریکٹر سرٹیفکیٹ پولیس سے لے کر آجاؤ۔ ویزا لگا دیا جائے گا۔ چنانچہ اُن کی ہدایت کے بموجب گئے اور یہ مرحلہ بھی بخیر و خوبی طے کر آئے۔ گھر سے امی نے ساری تفصیل سنی تو کہنے لگیں "بیٹی! ساری دنیا میں جا رہی ہو۔ اللہ اور اُس کے رسولؐ کے گھر نہ گئیں تو کیا فائدہ! اپنے سفر کا آغاز مکہ اور مدینہ شریف سے کرو۔" اُن دنوں حج نزدیک تھا۔ سعودی ایمبیسی والے عمرہ کا ویزا لگا کر نہیں دے رہے تھے کہ حج کی درخواستوں پر غور ہو رہا ہے۔ مگر سلیم صاحب کے ایک دوست اختر بھٹر صاحب اس آڑے وقت میں کام آئے اور ویزا لگوا کر لے آئے۔ ہم نے نہ صرف اُن کا شکریہ ادا کیا بلکہ اللہ اور اس کے حبیبؐ کے گھر جا کر ان کے لئے دعا بھی مانگی۔

انہی دنوں جب کہ تیاریاں تقریباً مکمل ہو چکی تھیں، سلیم صاحب کے ایک دوست کا لاہور سے فون آگیا کہ لاہور پہنچو اور ضرور میرے بھائی کی شادی میں شرکت کرو، ورنہ دوستی ختم! یہ چونکہ چھٹی لے چکے

Marfat.com

تھے، اس لیے فوراً لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ اِدھر اپنے ایک اور دوست جو ٹریول ایجنسی کے مالک ہیں، سے کہہ گئے کہ "رفیق من! (نام بھی ان کا رفیق ہے) میرے لیے سفر کا کوئی سستا سا تفریحی ٹکٹ دیکھو اور سیٹیں بک کرا دو"۔ لیجئے جناب! سلیم صاحب تو اپنی افتادِ طبع کے باعث لاہور سے آگے، ملتان تک نکل گئے۔ اِدھر رفیق صاحب نے اطلاع دی کہ "بھابھی! آپ کی سیٹیں بک ہو چکی ہیں۔ ۲۳ جولائی کو پنڈی سے کراچی اور ۲۴ کو کراچی سے جدہ اور پھر آگے ہی آگے"۔ حتیٰ کہ انہوں نے ہماری چھٹیوں کے مطابق دو ڈھائی ماہ کے لیے پروگرام مرتب کر دیا۔ مجھے سلیم صاحب پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ گرمی کے موسم میں لاہور، ملتان کا سفر کوئی سرپھرا ہی کرے گا۔ اِن تاریخوں میں تو پنڈی اسلام آباد کے لوگ الامان و الحفیظ پکار اٹھتے ہیں۔ غرضیکہ انہوں نے خود گرمی کھائی اور ہمیں پریشانی کھلوائی۔ میں نے رفیق صاحب کو فون کیا کہ آپ سیٹیں کینسل کروا دیں کہ میاں صاحب کی سواری بادِ بہاری ابھی پنڈی نہیں پہنچی۔ چلئے، سیٹیں کینسل ہو گئیں۔ ہمارے ارمانوں پر اوس پڑ گئی آرزوؤں کا جہان برباد ہو گیا۔ ایک دفعہ پھر یوں لگنے لگا کہ شاید جانا نہ ہو سکے گا۔ ہمارے ساتھ بھی قسمت کوئی خوبی دکھا جائے گی اور کمندِ لبِ بام آ کر ٹوٹ جائے گی۔ ویزے تو پاسپورٹ پر ایسے لگے ہوئے تھے جیسے ساری دنیا کو پاؤں تلے روند دینا ہے۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ سفر میں وقت کتنی تیزی سے گزرتا ہے اور ایک شہر کے لیے ایک دو دن کا قیام بیوقوفی کی انتہا ہے۔ مگر یہ ہمارا پہلا اتفاق تھا۔ نئے نئے پنچھی تھے جو ہواؤں میں اڑنا چاہتے

Marfat.com

تھے۔ اس لئے دن ایسے تقسیم کئے کہ پیرس میں تین دن، لندن میں چار دن، ایڈنبرا میں ایک دن، فرینکفرٹ میں دو دن، نیویارک میں پانچ دن، غرضیکہ دنوں کا شمار کرتے کرتے مہینہ ڈیڑھ مہینہ بن گیا۔ پھر سلیم صاحب کے بھائی کا متوقع آپریشن جس جگہ بھی ہونا تھا، اس کے لئے ڈیڑھ ہفتہ علیحدہ رکھا۔ سردار شوکت حیات صاحب سے امریکہ اور لندن دونوں جگہ ملاقات ہوتی۔ وہ اپنے محسن، مربی اور بے انتہا مشفق بزرگ ہیں۔ ہمیں بچوں کی طرح چاہتے ہیں۔ انہوں نے ہمارا پروگرام دیکھا تو بے حد ہنسے۔ کہنے لگے: "تم دونوں سیر نہیں کر رہے، صرف مہریں لگوا رہے ہو۔ اب موقع ملا ہے تو اطمینان سے گھومو پھرو"۔ مگر کہاں کا اطمینان اور کہاں کی یکسوئی۔

بھاگم بھاگ ایک ایئرپورٹ سے ہوائی جہاز پر چڑھ رہے ہیں، دوسرے ایئرپورٹ سے اتر رہے ہیں اور تیسرے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ڈیڑھ مہینہ کے عرصہ میں سات ملکوں میں گئی۔ جہازوں پر اتنا چڑھی اور اتری کہ اب جب کبھی آسمان پر دھوپ میں چمکتے یا رات کو جگنو کی طرح ٹمٹماتے جہاز گذرتے دیکھتی ہوں تو کہتی ہوں: "اے انجانے دیس کے مسافرو! تمہیں سفر مبارک ہو۔ ہمیں کوئی حسرت نہیں۔ اب تم پیٹیاں باندھ رہے ہو گے یا کھول رہے ہو گے۔ شکر ہے ہمیں اس افراتفری سے نجات ملی ہے

قافلے تازہ سیاحت پہ روانہ ہونگے
یہ مسافر ابھی ٹھٹکا سا رہے گا کچھ روز

Marfat.com

لامکاں کے مکان پر

۲۶ جولائی ۱۹۸۳ء

خدائے ذوالجلال والاکرام کی ذرہ نوازی کے طفیل آج ہم سفر کا آغاز کر رہے تھے۔ سفر بھی وہ جو اعلیٰ ترین نعمت اور عظیم ترین سعادت سے سرفراز تھا۔ جس کی آرزو ہر مومن کے دل میں زندگی بھر پروان چڑھتی رہتی ہے اور جوں جوں عمر بڑھتی ہے، طلب و شوق بھی فزوں تر ہوتا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کی تمنا منزلِ مراد تک پہنچتی ہے۔ لیکن آرزو کی تکمیل ہونے پر بھی انسان پہلے سے زیادہ تشنگی محسوس کرتا ہے۔ پیاس اور بڑھتی ہے۔ از سرِ نو خانۂ خدا پر حاضری دینے اور رسول کریمؐ کے روضۂ پُرنور کی زیارت کرنے کی خواہش دل میں چٹکیاں لیتی ہے۔ آج ہم دو پُر تقصیر اور بے مایہ انسان اپنے لمبے سفر کی ابتدا اُسی لامکاں کے مکان سے کرنے والے تھے۔ دل میں وسوسے و اندیشے ہے

میں اکثر سوچتا ہوں جب وہ جلوہ سامنے ہوگا
کہاں تک ساتھ میرا دے گی یہ میری بینائی

Marfat.com

ہے یہ اک معجزہ اعجاز شاید سرور دیں کا !!
جب اُنکا ذکر کرتا ہوں مہک جاتی ہے تنہائی

پھر دنیا کا بھی خیال ممکن ہے اس سفر میں کوئی جان لیوا حادثہ ہو جاتے پر دلیس میں موت نے آن دبوچا تو میرے بچوں کا کیا ہوگا ؟ شاید میری واپسی نہ ہو۔ یہ سفر آخری سفر بن جائے۔

ابا جی کو فوت ہوتے ڈھائی ماہ ہو چکے تھے۔ گھر میں اُداسی اور ویرانی کا راج تھا۔ امی اپنا غمگین اور پُر نور چہرہ لئے مجھے تک رہی تھیں۔ (تین ماہ بعد وہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں) باتیں کرتے کرتے اچانک اُن کو خیال آیا کہ میں عمرہ کے لئے جا رہی ہوں۔ فوراً آپا فردوس سے کعبہ شریف کی بڑی سی تصویر منگوا کر ایک ایک مقام کی وضاحت کی اور تفصیل سے بتانے لگیں کہ کہاں کہاں نوافل پڑھنے ہیں، کون سی دعائیں مانگنی ہیں جو مستجاب ہوں۔ پھر کہنے لگیں: "بیٹی! تیرے باپ کی وفات کے بعد میرا دل اس دنیا سے اُچاٹ ہو گیا ہے۔ میرے لئے دعا مانگنا کہ وہ مجھے جلد بلالے۔ دوسرے میری اور اپنے باپ کی مغفرت کی دعا مانگنا تاکہ ہماری آئندہ منزلیں آسان ہوں۔"

میرا دل تو پہلے ہی بھرا ہوا تھا۔ میں رونے لگی تو مجھے تسلی دی، بچوں کے متعلق کہنے لگیں: "ان کی بالکل فکر نہ کرنا تمہاری امانت ہیں۔ خدا ان کا حافظ و ناصر ہے۔ مجھ سے جہاں تک ممکن ہو سکا، ان کی دیکھ بھال کرونگی۔ پھر تمہاری بہنیں ہیں۔ وہ اپنے بچوں کی طرح نگہداشت کریں گی۔ بس خدا تمہیں بخیریت واپس لاتے۔"

اسی طرح جاگتے، باتیں کرتے رات بیت رہی تھی۔ بچوں کو رخصت

Marfat.com

کیا اور کہا کہ صبح تم لوگوں کو جگائے بغیر چلی جاؤں گی کیونکہ مجھ سے تمہیں چھوڑ کر جانا برداشت نہ ہوگا۔ بچے پُرنم آنکھوں سے منہ بسورتے سونے چلے گئے۔ بشریٰ، رفعت آپا بھی دیر تک جاگتی رہیں میں جب سونے لگی تو بچوں کے کمرے میں جاکر ایک دفعہ پھر اُن کو سوتے میں پیار کیا، زیرِ لب خدا حافظ کہا اور زندگی میں پہلی بار اُن سے اتنے عرصہ کے لئے جدا ہوئی ے

کیا رخصتِ یار کی گھڑی تھی
ہنستی ہوئی رات رو پڑی تھی

۲۷ جولائی ۱۹۸۳ء

رات کافی دیر سے سوئے تھے، اس لئے دن چڑھے نیند کھلی۔ امّی اور بہنیں جاگ رہی تھیں۔ اُن کو نم آنکھوں سے خدا حافظ کہا۔ بچوں کی طرف نہ گئی کہ کہیں خوامخواہ کی برسات نہ شروع کر دوں۔ اب سلیم صاحب کے ہمراہ اُن کے والد صاحب کو ملنے گلیانہ چل پڑے۔ گاؤں پہنچے تو پتہ چلا کہ سلیم صاحب کے چچا جو کافی عرصہ سے صاحبِ فراش تھے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے ہیں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ٥ خود سلیم صاحب کے والد صاحب بڑے DEPRESSED تھے۔ فرمانے لگے: بھئی مجھے دفنا جاتے تو پھر جانا تھا۔ اب تمہارے جانے کے بعد مجھے کچھ ہو گیا تو کون سنبھالے گا۔" انکو تسلی دی کہ "ابھی آپ کافی عمر پائیں گے آپ ماشاء اللہ تندرست ہیں۔ آپکا نمبر بہت دور ہے"۔ ان کو مطمئن کیا اور چچا صاحب کا آخری دیدار کرنے کے بعد بارہ بجے راولپنڈی کے لئے روانہ ہوئے۔ اندازے سے بڑھ کر لیٹ ہو گئے تھے۔ گھر پہنچ کر جلدی جلدی کھانا کھایا، پھر اٹلی ایمبیسی پہنچے۔ وہاں سے پاسپورٹ حاصل کیا۔ پھر امریکن ایکسپریس کے دفتر سے زرِ مبادلہ حاصل کیا۔

Marfat.com

اسی بھاگم بھاگ میں شام کے چار بج گئے۔ سات بجے ہماری کراچی کے لئے پرواز تھی۔ گھر پہنچے۔ نامکمل تیاری کو مکمل کرنے کی کوشش کی۔ شکر ہے، جہلم میں فردوس سے کہہ آئی تھی کہ آپ شام تک پنڈی آجائیں اور گھر بند کروا دیں۔ تو وہ آچکی تھیں۔ سبھی کام ان کے حوالے کئے۔ اپنا ایک سوٹ کیس اور بریف کیس لیا۔ اتنے میں سلیم صاحب کے دوست الیاس قریشی صاحب مع اپنی بیوی رخسانہ کے آن پہنچے کہ چلیں، آپ کو ایرپورٹ چھوڑ آئیں۔ میں نے جلدی سے نہا کر کپڑے بدلے۔ گاڑی میں بیٹھ کر بالوں کو برش کیا اور سفر کے لئے رواں دواں ہوئے۔ انتظار گاہ میں بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ ہمارے ہمسائے انوار فیروز صاحب کی صاحبزادی نورین جدہ میں ہوتی ہیں۔ جدہ جانا ہے تو اُن کا پتہ لے لیں۔ وہیں سے اُن کے گھر فون کیا۔ مسز انوار حیران کہ آپ جا رہی ہیں، ملیں بھی نہیں۔ معذرت کی کہ واقعی وقت نہ ملا۔ انہوں نے عزیزی نورین کا فون نمبر اور ایڈریس لکھوایا اور کہا کہ "آپ اسے ایرپورٹ پہنچتے ہی فون کر دیں۔ وہ آپ کو لینے آجائے گی۔ میں نے اسے مطلع کیا ہوا ہے کہ آنٹی آ رہی ہیں"۔ لیجئے، ہم سے تو ہمارے مہربان اچھے۔ جدہ کا مرحلہ تو حل ہوا۔ اب کراچی جانے کے لئے بوئنگ میں سوار ہوئے۔ کہاں تو اتنی شدید گرمی پڑ رہی تھی، کہاں اچانک کالی کالی بدلیاں گھر کر آگئیں۔ موسم خوشگوار ہو گیا۔ مگر جو موسم زمین پر خوشگوار تھا، خلا میں خطرناک تھا۔ نیچے بادلوں میں بجلی چمکی تو سلیم صاحب ڈرائیں کہ اب یہ ہمارے جہاز پر گرے گی اور اسے جلا کر بھسم کر دے گی۔ مگر جناب، مجھے تو یہ اڑن کھٹولا آسمانوں کی وسعتوں میں گم، انجانے دیس کی طرف رواں دواں خوشیوں کا ہنڈولا

Marfat.com

لگ رہا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد جہاز کراچی ایئرپورٹ پر منڈلانے لگا۔ رات کے اندھیرے میں جگ مگ کرتا چاند ستاروں کی چادر اوڑھے، کراچی چم چم کر رہا تھا۔ وہاں اترے تو چونکہ کسی کو اطلاع نہ تھی اس لئے ایئرپورٹ سے ٹیکسی پکڑی اور سلیم صاحب کی ہمشیرہ کے گھر پہنچے۔ وہ گھر پر موجود نہ تھیں۔ گھر پر تالا پڑا تھا۔ صرف باہر والا کمرہ کھلا تھا۔ وہیں سامان رکھا اور وہیں بیٹھ گئے۔ رات دیر سے ان کی واپسی ہوئی کہ آج ان کی عزیزوں کے ہاں دعوت تھی۔ ہمیں دیکھا تو حیران ہو گئیں۔ وجہ نزول سنی تو اور بھی حیران کہ اتنے لمبے سفر کی تیاری کر لی اور خبر تک نہ کی۔ ان سے بھی معذرت کی، بازار سے کھانا منگوایا۔ کھانے کے بعد کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹ گئے۔ ساری رات بے چینی سے بسر ہوئی۔ نئی جگہ، نیا ماحول، گرمی اور بچوں کو چھوڑ کر آنے کی فکر، جدائی کی پہلی رات، آئندہ کا خیال، غرضیکہ رات سوتے کم اور جاگتے زیادہ کا قصہ رہا۔ صبح کے قریب آنکھ لگی ہی تھی کہ سلیم صاحب نے جو ہمیشہ سے سحر خیز ہیں، جگا دیا۔ ویسے بھی اٹھنا تو تھا ہی کیونکہ آٹھ بجے فلائٹ کو کراچی سے پرواز کرنا تھا جلدی سے اٹھے اور نہائے۔ پھر کراچی کے ایئرپورٹ کی طرف چل نکلے۔

ایئرپورٹ پر خوب گہما گہمی تھی۔ ہزاروں مسافر، سینکڑوں لوگ رواں دواں۔ ایک چہل پہل تھی چند ایک نے حج کے لئے یہیں سے احرام باندھا ہوا تھا۔ سلیم صاحب پاس بیٹھے مسافروں سے عمرہ کی تفصیلات پوچھ رہے تھے۔ میں نے موقع غنیمت جانا۔ وہیں سے بچوں اور امی کے ساتھ فون پر بات کی، الوداعی پیغام دیئے، ماں کی پرخلوص دعائیں لیں اور سب

Marfat.com

کے ساتھ پاکستان کی سرزمین کو الوداع کہا ؎

اے نگارِ وطن تو سلامت رہے۔

اور سفر کے خوشگوار ہونے کی دعائیں مانگتے جہاز کی طرف چل دیئے۔ ہمارا جہاز السعودیہ کا جمبو جیٹ تھا ہماری منزل جدہ براستہ دہران اور ریاض تھی۔ جہاز میں بے شمار لوگ تھے مگر سبھی اپنے آپ میں مگن۔ مجھے سلیم نے کھڑکی کے ساتھ کی نشست دے دی کہ میری حالت میلے میں آنے والے بچے کی سی تھی۔ ہر چیز کے متعلق اشتیاق، ہر بات کے متعلق تجسس، خیال تھا کہ جہاز سے نیلا سمندر، پُر رونق بندرگاہیں، ہنستے بستے شہر سرسبز سرزمین، سبھی کچھ نظر آئے گا، مگر وہاں سفید بادلوں کی ڈھیریاں روئی کے گالوں کی مانند اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ اُوپر دور دور تک صاف شفاف نیلی چادر تنی تھی۔ تنگ آکر باہر دیکھنا بند کر دیا۔ پھر بھی مارے اشتیاق کے کبھی کبھی کھڑکی سے جھانک لیتی۔ دو گھنٹے گزرے تو دہران کا ایئرپورٹ آگیا۔ اب پھر سے وقت آٹھ بجے ہو گیا۔ سفر میں تو ہم ابن الوقت بنے رہے۔ جس دیس میں گئے وہیں کے مطابق وقت کر لیا۔ دہران ایئرپورٹ پر ہمارے ساتھ ہی ڈیرہ اسماعیل خان اور بنوں کے ستر اسّی کے قریب مزدور اترے۔ ان سب کو انٹری فارمز بھرنا تھے۔ مگر انگریزی اردو میں کسی کا ایک لفظ بھی نہ جانتے تھے۔ مجھے جو فارم بھرتے دیکھا تو لائن لگ گئی کہ بہن جی میرا فارم بھر دیں۔ کافی لوگوں کے فارم بھرے اور افسوس بھی ہوا کہ یہ بے چارے روزی کی تلاش میں اپنی کشتیاں جلا کر چل پڑے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے ساتھ دھوکہ دہی اور بے ایمانی کے سینکڑوں واقعات اخبارات میں روزانہ کی خبروں کا معمول بن گئے ہیں۔ جانے کیسے

Marfat.com

سفاک، بے رحم اور ظالم لوگ ہوتے ہیں جو ان سادہ لوحوں کو لوٹتے ہیں۔ ایسے شقی القلب لوگوں کو تو گردن زدنی قرار دینا چاہیئے۔

ہم لوگ وہاں ایک ڈیڑھ گھنٹہ ٹھہرے اور پھر جہاز میں سوار ہو گئے۔ اب اگلی منزل ریاض تھی۔ پاک سرزمین سعودی عرب کا دارالخلافہ۔ میرے شوق کی فراوانی مجھے بار بار کھڑکی سے باہر دیکھنے کو کہے، مگر چوبیس ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتے ہوتے، ایرکنڈیشنڈ جہاز میں بیٹھے ہوتے سرزمین حجاز کا کیا تصور ہو سکتا تھا۔ کھڑکی سے باہر سرخ اور نارنجی رنگ کا غبار زمین سے لے کر آسمان تک پھیلا ہوا تھا۔ کسی وقت اس میں انگاروں کی سی رنگت آجاتی، پھر اس میں سفید لکیریں سی بنتی دکھائی دیتیں۔ شاید وہ سڑکیں ہوں یا شاید نظر بھٹک رہی ہو۔ ایسی گرم اور حدت سے تپتی سرزمین پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پاپیادہ میلوں کا سفر، سوچ کر ہی ذہن گھوم جاتا ہے۔ اللہ پاک نے اپنے پیارے نبی ؐ کو بچپن میں یتیمی دی کہ اوائل عمری میں اس سے بڑھ کر کوئی اور مصیبت نہیں۔ جوانی میں مصائب دیئے، اپنے اور غیر سب قبائل سے دشمنی دی۔ زندگی جدوجہد سے معمور کر دی۔ دنیا کی اجڈ اور گنوار قوم سے واسطہ ڈالا۔ خشک و سنگلاخ چٹانوں، تپتے صحراؤں میں رہائش دی۔ غرضیکہ زندگی کے تریسٹھ سال ایک جاہل مطلق قوم کو سنوارتے، نکھارتے اور تہذیب و تمدن سے آراستہ کرتے گزرے۔

یہ اسی معلم اخلاق کا کمال تھا کہ وہی بگڑی قوم اپنی بے مثال تہذیب، مضبوط ترین اتحاد، ناقابلِ یقین بہادری اور اعلیٰ پائے کی صلاحیتوں کے باعث ساری دنیا کے لئے قابلِ تقلید نمونہ بن گئی۔

Marfat.com

چالیس منٹ کے قلیل وقفے کے بعد ریاض آ گیا۔ ریاض پر ہمیں اترنے نہ دیا گیا۔ البتہ مزدور نیلی وردیاں پہنے صفائی کے لئے آ گئے۔ السعودیہ کی فضائی میزبانوں کی یونیفارم بھی نیلی گلابی دھاریوں والی قمیص اور نیلی پتلون تھیں۔ لڑکیوں کی اکثریت تو اپنے ملک کی لگتی تھی۔ نمکین رنگت اور تیکھے نقوش، بہرحال بڑا خوش اخلاق عملہ تھا۔ آبِ زم زم پینے کی ابتدا تو جہاز سے ہی ہو گئی۔ الحمد اللہ! سچی بات تو یہ ہے کہ ؏

بن مانگے دیا اور اتنا دیا دامن میں ہمارے سمایا ہی نہیں

آبا و اجداد کا شہر جدہ

ریاض سے اڑتے ہوئے شہر کی ایک جھلک سی دکھائی دی جس سے لگتا تھا کہ فلیٹس بے شمار ہیں اور شہر با قاعدہ پلاننگ کے تحت بنا ہوا ہے۔ اب اگلی منزل جدہ تھی۔ حضرت آدم و حضرت حوا کا شہر شاید اسی اجداد کی وجہ سے جدہ کہلاتا ہے۔ جدہ میں عبد العزیز ایئرپورٹ پر اترے تو آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ بے انتہا خوبصورت، جدید ترین سہولتوں سے مزین یہ ایئرپورٹ دنیا کا دوسرا بڑا ایئرپورٹ ہے۔ میں نے اپنے آئندہ سفر میں لندن، پیرس، فرنکفرٹ، نیویارک، سان فرانسکو، ہانگ کانگ وغیرہ کے ایئرپورٹ دیکھے، مگر جدہ جیسا ایئرپورٹ نظر نہیں آیا۔ اب جانے پہلا بڑا ایئرپورٹ کون سا ہے۔

جدہ شہر کے تین ایئرپورٹ ہیں۔ ایک حاجیوں کے لئے، ایک انٹرنیشنل پروازوں کے لئے اور تیسرا اندرون ملک پروازوں کے لئے ہے۔ سبھی اپنی مثال آپ ہیں۔ ایئرپورٹ کی جگہ کبھی صحرائی علاقہ تھا، اب جو گل گلزار کھلے ہیں تو عقل حیران ہوتی ہے۔

Marfat.com

جدہ ایئرپورٹ پر سلیم صاحب ریال لینے کے لئے رقم تبدیل کرنے کے مرکز (EXCHANGE CENTRE) لگئے اور میں سامان کے پاس بیٹھ گئی۔ ایسے آرام دہ صوفے کشن کہ انسان اندر تک دھنس جائے۔ اتنے میں دو پاکستانی ڈرائیور آگئے کہنے لگے: "ٹیکسی۔ سیارہ"۔ میں نے نورین کا ایڈریس دکھایا اور پوچھا کہ کتنے میں لے جاؤ گے۔ کہنے لگے "ستر ریال میں"۔ میں خاموش ہوگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک دو اور آگئے۔ میں نے ان سے کہا کہ ابھی آپ لوگ ٹھہریں۔ میرے خاوند آئیں گے تو وہ بات کریں گے۔ یہ سن کر وہ لوگ پرے ہٹ گئے۔ تھوڑی دیر گزری تو ایک صاحب اچھے قیمتی لباس میں ملبوس چہرے مہرے سے بھی پر وقار سے' میرے قریب آئے اور کہنے لگے "کہاں جانا ہے"۔ میں نے سمجھا کہ میری طرح سے یہ بھی مسافر ہیں، اُن کو ایڈریس دکھایا۔ انہوں نے پوچھا، "ٹیکسی والے کتنا مانگ رہے ہیں"؟ میں نے کہا: "ستر ریال"۔ کہنے لگے: "مناسب ہے"۔ یہ کہہ کر وہ نزدیک ہی کھڑے ہوگئے۔ تھوڑی دیر کے بعد سلیم صاحب آئے تو وہ صاحب بھاؤ تاؤ کرنے لگے کہ میں ساٹھ ریال پر لے جاؤں گا۔ مجھے سخت تعجب ہوا۔ وہ صاحب قطعی ٹیکسی ڈرائیور نہ لگتے تھے۔ سلیم صاحب نے کہا "پچاس پر لے جانا چاہو تو ٹھیک ہے، ورنہ ہم کوئی اور ٹیکسی دیکھ لیتے ہیں"۔ تھوڑی پس و پیش کے بعد وہ راضی ہوگئے۔ سلیم صاحب کہنے لگے کہ "ابھی تم ٹھہرو، میں واپسی کے لئے سیٹیں کنفرم کروا آؤں"۔ سلیم صاحب کے بہنوئی الحاج قناعت صاحب جو تین دفعہ دنیا کا چکر لگا چکے ہیں نے تاکید کی تھی کہ ایئرپورٹ پر اترتے ہی دو باتوں کا دھیان رکھنا۔ اولاً اس ملک کی کرنسی حاصل کرنا، ایئرپورٹ

Marfat.com

پر ہی اس مقصد کے لئے مراکز کھولے ہیں ۔ دوئم آئندہ سفر کے لئے وہیں سے سیٹیں کنفرم کروالینا۔

سلیم صاحب چلے گئے تو میں نے وقت گزاری کے لئے ان صاحب سے پوچھا کہ پاکستان میں کس شہر سے تعلق رکھتے ہیں۔ کہنے لگے جہلم سے۔ لیجئے۔ یہ تو اپنے گرائیں نکلے۔ پھر جو انہوں نے تفصیلی تعارف کروایا۔ تو پتہ چلا کہ واقفوں کے عزیز رشتہ دار ہیں۔ سعودی عرب میں سپروائیزر ہیں۔ فارغ اوقات میں ٹیکسی چلاتے ہیں۔ روزانہ دو ڈھائی ہزار روپے کما لیتے ہیں۔ بیوی کو امریکہ سیر کے لئے بھیجا تھا۔ ابھی ابھی سیر سے واپس آئی ہے۔ حیدر آباد میں چھ مربع زمین خرید رکھی ہے۔ اسلام آباد میں تین پلاٹ ہیں غرضیکہ پانچوں انگلی گھی میں سر کڑاہی میں کے مصداق خوب وارے نیارے ہیں۔ پھل پھول رہے ہیں۔ بعد میں یہ سلیم صاحب کو بھی پہنچان گئے کہ ایک دفعہ کسی کام کے سلسلے میں دینہ تھانہ جانا پڑا تھا، وہیں دیکھا تھا۔ اب کہاں کا کرایہ، اب تو وہ کہیں کہ آج ہمیں شرف میزبانی سے نوازیں۔ آج ہمارے گھر چلیں۔ راستے میں جوس پلایا۔ ان سے معذرت کی کہ دو دن ہیں، ایک دن مکہ شریف اور ایک دن مدینہ منورہ کے لئے۔ کسی کے ہاں آنے جانے کی قطعاً گنجائش نہیں۔ انہوں نے خود ہی نورین کو فون کرکے گھر کا ایڈریس سمجھا اور ہمیں گھر تک پہنچا آئے۔

نورین ہمیں دیکھ کر بے حد خوش ہوئی۔ اس کا فلیٹ اچھا خاصا کشادہ، کارپیٹڈ اور ائر کنڈیشنڈ تھا۔ ہمیں گیسٹ روم دے دیا گیا۔ بڑی آؤ بھگت کی۔ چائے پی کر جو بیٹھے تو ایسا لگا جیسے کراچی سے روانہ ہوتے صدیاں بیت گئی ہیں۔ مگر دن تھا کہ ابھی وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ چونکہ ہم سورج کے ساتھ ساتھ

Marfat.com

سفر کر رہے تھے۔ اس لئے سارے سفر کے دوران DATE LINE عبور کرنے کی وجہ سے ایک دن کھا گئے۔ بالکل ہی پتہ نہ چلا کہ کہاں گیا۔

سلیم صاحب تو جہاز میں ہی کہنے لگے کہ بس تو روٹی سالن کو ترس گیا ہوں۔ سارے سفر میں ان کی یہی پرابلم رہی کہ کھانا گھر کا کھاؤں گا ہوائی جہاز میں یہ واحد شخص ہوا کرتے تھے جو کھانا نہیں منگواتے تھے، یا اگر لے لیتے تھے تو اکثر چیزیں بن چھوئے واپس کر دیتے تھے کہ دل نہیں چاہتا۔ ایک دفعہ PAN AM کے جہاز میں ایسے ہی کیا۔ ائیر ہوسٹس سمجھی کہ شاید سبزی خور (VEGETARIAN) ہیں۔ وہ آلو اُبال کر اور بھنے ہوئے مکئی کے دانے لے آئی۔ مجھے بڑی ہنسی آئی کہ لو اب کھاؤ۔ جو اچھی بھلی چیزوں کو چھوڑے، اس کے ساتھ یہی حشر ہونا چاہیئے۔ بھئی، اگر گوشت کے متعلق شک ہے تو مچھلی لے لو سویٹ ڈش کھالو، سلاد منگوا لو۔ پیٹ ہی تو بھرنا ہے۔ مجھے تو یہ خیال بھی نہ تھا کہ سلیم صاحب کھانے کے معاملے میں اتنے مذہبی بن جائیں گے۔ واشنگٹن میں ہمیں دوپہر کو بھوک لگی تو سلیم صاحب نے دکاندار سے چپس لے لئے۔ میں نے برگر لیا اور پوچھ کر لیا کہیں پورک کا تو نہیں بنا ہوا۔ اُس نے کہا کہ ٹرکی کے گوشت کا بنا ہوا ہے۔ میں نے ایک نوالہ لیا تو سلیم صاحب نے بولنا شروع کر دیا۔ "سؤر کا گوشت کھا رہی ہو۔" میں نے کہا "نہیں ٹرکی (TURKEY) کا ہے۔" کہنے لگے "اسی کی چربی سے تلا ہوا ہے۔ یا اگر وہ چربی استعمال نہیں ہوتی، تو پیچھے تو وہی ہیں جو وہ سب جگہ استعمال کر رہے ہیں۔" غرضیکہ انہوں نے جو لکچر دیا تو یوں لگے اب ہوئی اُلٹی۔ جو کھایا تھا وہ اُگلنے سے رہی۔ مگر باقی ماندہ ایک درخت

Marfat.com

کے تنے کے پاس پھینک دیا۔

سلیم صاحب کے باہر کھانا نہ کھانے سے اکثر پریشانی رہی، مگر ہم خوش نصیب، عموماً ان کی خواہش کے مطابق دیسی کھانا ملتا رہا۔ پیرس میں ان کا بھائی اور دوست تھے۔ انگلینڈ میں میرا بھائی جاوید اور ان کی بہن کشور تھیں، امریکہ میں میرا بھائی ظفر تھا۔ بقول کسے آپ لوگوں نے خاص ممالک میں اپنے نمائندے بھیجے ہیں، سیر میں آپ کو کیا تکلیف ہو سکتی ہے؟ جن جگہوں میں کوئی رشتہ دار نہ تھا، وہاں ڈھونڈ ڈھانڈ کر پاکستانی ہوٹل تلاش کرتے اور وہیں جا کر کھانا کھاتے۔

بہرحال، رات کو نورین نے کھانے کے لئے جگایا تو خورشید صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جو نورین کے خاوند ہیں۔ خوب باغ و بہار طبیعت کے مالک۔ اس دن کمبل لپیٹے پھر رہے تھے۔ پوچھا اتنی گرمی میں یہ کمبل کی کیا تک ہے۔ کہنے لگے: "بندہ ملتان کا رہنے والا ہے"۔ بڑی ہنسی آئی۔ یہ لطیفہ سنا تھا کہ ملتان کے باسی دوزخ میں بھی سردی سے کانپ رہے تھے، مگر یہاں تو حقیقت بن گئی تھی۔ وہ کہنے لگے: "زوجہ محترمہ اے سی چلا لیتی ہیں، اس لئے اکثر نمونیہ کا شکار ہو جاتا ہوں۔ ورنہ زکام تو مسلسل رہتا ہے۔ کبھی کبھار بخار ہو جاتا ہے"۔ واقعی ملتان کی گرمی تو ضرب المثل ہے۔ اس ضمن میں ابا جی فارسی کا ایک شعر پڑھا کرتے تھے ؎

چہار تحفہ درویش از ملتان — گرد و گرما گدا و گورستان

رات بڑے آرام سے گذری۔ شاید تھکاوٹ تھی اور پچھلی رات کی بے آرامی کہ خوب گہری نیند آئی۔

Marfat.com

لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ

۲۹ رجولائی ۱۹۸۳ء

آج جمعہ کا مبارک دن ہے۔ خورشید صاحب کہنے لگے کہ جمعہ جدّہ میں ہی پڑھیں گے، پھر مکہ روانہ ہو جائیں گے۔ ساتھ ہی انہوں نے تاکید کی کہ پاسپورٹ ہمراہ ضرور لے جانا کیونکہ یہاں سخت قسم کی چیکنگ ہوتی ہے، اگر اقامہ یا پاسپورٹ پاس نہ ہو تو سیدھے جیل! پھر نہ کوئی وکیل، نہ اپیل، نہ دلیل یا سبیل! میں نے کاغذات میں سے سلیم صاحب کا پاسپورٹ نکالا اور میز پر رکھ دیا کہ جاتے وقت ساتھ لے جائیں۔ لیکن سلیم کوئی چیز نہ بھولیں، ناممکن ہے۔ پن، گھڑی، رومال، چابیاں، یہ چیزیں تو اکثر بھول جاتے ہیں۔ اس بھول میں آج کل نیا اضافہ عینک کا ہو گیا ہے۔ درجنوں عینکیں بنوا چکے ہیں، مگر ہر دفعہ غائب ہو جاتی ہے۔ شکر ہے کسی بھی عینک کا بل پچاس یا ساٹھ روپے سے زیادہ کا نہیں ہوتا، ورنہ ہم دیوالیہ ہو جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ مندرجہ بالا چیزوں میں سے کوئی چیز بھی ان کے پاس نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ پاسپورٹ میز پر پڑا رہ گیا اور یہ نماز پڑھنے چلے گئے۔ واپسی پر آتے ہی خود ہی دیکھ کر کہنے لگے: "اوہو! پاسپورٹ تو میں بھول

Marfat.com

گیا تھا خورشید صاحب چونک پڑے اور کہنے لگے: "شکر کریں صاحب کہ خیریت گزری، ورنہ پکڑے جاتے" میں بھی گھبرا گئی تھی کیونکہ پاسپورٹ اور اقامہ نہ ہونے کی وجہ سے بڑی خوفناک کہانیاں سنی تھیں۔ میں نے پوچھا: "اگر وہ چیک کر لیتے تو کیا ہوتا؟" بڑے فخر سے کہنے لگے: "واہ جناب! پکڑے کیوں جاتے۔ گھر میں والد صاحب کو چھوڑ کر آتے ہیں جو دست بدعا ہوں گے"

بات آئی گئی ہو گئی۔ دوپہر کا کھانا تیار تھا۔ نورین کی سہیلی بھی آئی ہوئی تھی، کھانا کھایا اور تیاری کر لی۔ پاسپورٹ اٹھانا یاد نہ رہا۔ سلیم صاحب نے بے دھیانی میں یا احتیاط کی خاطر پاسپورٹ میز سے اٹھا کر دراز میں ڈال دیا۔ خورشید صاحب ہمیں مکہ شریف جانے والی ویگن میں بٹھا آئے۔ تقریباً چالیس منٹ کے سفر کے بعد منزلِ مقصود کی نشانیاں شروع ہو گئیں۔

مکہ شریف پہنچنے تک خوشی و مسرت کے جذبات سے دوچار رہے۔ مکہ شریف پہنچتے پہنچتے عصر کا وقت ہو گیا تھا۔ دل میں عقیدت و احترام کی ملی جلی کیفیت تھی۔ یہی ڈر کہ اللہ کا گھر دیکھنے سے پہلے کہیں دل خوشی سے دھڑکنا نہ بند ہو جائے۔ اپنے جاہ و جلال والے رب کے حضور کسی غلطی کے مرتکب نہ ہو جائیں۔ جو شاہراہ خانۂ کعبہ کو جاتی تھی وہ روشنیوں سے ایسی روشن تھی کہ دن کا اجالا بھی اس کے سامنے ماند پڑ جائے۔ اک خواب سا لگتا تھا۔ بھلا خدائے ذوالجلال کا گھر اور مجھ ناچیز کا یہ مرتبہ کہ یہاں آن پہنچوں۔ لگتا تھا تھوڑی دیر میں یہ سارا طلسم ٹوٹ جائے گا۔ زندگی بھی اس کی بندہ پروری سے گزر رہی تھی اور یہ سعادت بھی اس کی دریادلی

Marfat.com

کا ادنیٰ نمونہ تھی، بس کرم کی انتہا تھی ؎

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

سارا مکہ معظمہ روشنیوں سے منور و تاباں تھا۔ سڑکوں کے کنارے بڑے بڑے بلب گچھوں کی صورت میں روشن تھے۔ اک ہجوم خلائق تھا کہ لبیک لبیک کہنے حاضر تھا۔ ہر طرف چہل پہل اور رونق تھی۔ لوگوں کے چہرے روحانی خوشی کے مظہر تھے۔ جاتے ہی وضو کے لئے دوڑے۔ عورتوں اور مردوں کے لئے وضو کی جگہ علیحدہ علیحدہ تھی۔ ہم نے ایک جگہ مقرر کر لی کہ یہاں دونوں اکٹھے ہو جائیں گے اور دونوں ایک ہی وقت میں خانۂ خدا کا دیدار کریں گے۔ اندر وضو کرنے کی جگہ پر افریقی عورتیں سبھی کے سامنے ٹانگیں دھو رہی تھیں، بلکہ تقریباً نہا رہی تھیں۔ کچھ اپنے بچوں کو پکڑ پکڑ نہلانے کے لئے ٹونٹیوں کے نیچے گھسٹ رہی تھیں۔ یا رب خدا میری باری آئی۔ تو میں نے بھی وضو کیا۔ باہر نکلی تو سلیم صاحب آ چکے تھے۔ خانۂ کعبہ کی چار دیواری کے باہر نمازیوں کی صفیں ترتیب پا چکی تھیں۔ وہیں باہر کھڑے ہوتے نماز ادا کی پھر "باب سلام" سے اندر داخل ہوتے۔ برآمدہ گزرنے کے بعد خانۂ کعبہ پر نظر پڑی۔ اس ایک نظر پر ساری زندگی قربان! مدتوں کی ترسی نگاہوں نے سعادتِ دیدار حاصل کی۔ کتنی دیر تک ہم دونوں دم بخود، خاموش باادب کھڑے یہ نظارہ آنکھوں کے راستے دل میں اتارتے رہے۔ جانے کون کون سی دعائیں مانگیں، اللہ پاک سے کیا کیا التجائیں کیں۔ عقیدت، محبت، خوشی، مسرت کے جذبات نے بے خود کر دیا تھا۔ اتنی بڑی سعادت

Marfat.com

کاتبِ تقدیر نے میری قسمت میں لکھ دی تھی کہ اپنے آپ پر رشک آرہا تھا۔ دل کو وہ طمانیت وسکون مل رہا تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ پھر خانۂ کعبہ کا طواف کیا۔ ہماری طرح اور بھی ڈھائی تین سو مسلمان طوافِ کعبہ میں مشغول تھے۔ دعائیں وردِ زبان تھیں۔ نگاہیں خانۂ کعبہ پر مرکوز! کچھ خانۂ کعبہ کا دروازہ پکڑے آہ وزاری کر رہے تھے۔ طواف کے دوران ہم دونوں نے حجرِ اسود کو بوسہ دیا۔ جانے یہ موقع زندگی میں پھر ہاتھ آتے نہ آتے۔ دل چاہتا تھا کہ زندگی اس گھر کے گرد گھومتے گھومتے ختم ہو جاتے۔ صفا و مروہ کے درمیان سعی کی۔ سلیم کو کافی پاکستانی مل گئے۔ وہاں مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ ہر دوسرا شخص پاکستانی ہے۔ جس طرف نظر دوڑاؤ، اپنے ہی لوگ نظر آرہے تھے۔ ایک صاحب تو اپنے تین بیٹوں کے ہمراہ آتے ہوئے تھے۔ سلیم کے ساتھ سارا وقت چپکے رہے۔ عمرہ کے بعد الوداعی طواف کر کے کچھ دیر صحن میں بیٹھے خانہ کعبہ کو دیکھتے رہے کہ اللہ کے گھر دیکھنے کی بھی بڑی نیکیاں ہیں۔ رات کے دس بجے حسرت ناک نگاہوں سے خانۂ کعبہ کو دیکھتے دیکھتے الٹے قدموں باہر نکلے۔ دل سے بے اختیار دعا نکلی کہ اے باری تعالیٰ! تیری رحمت پر قربان حج کی سعادت بھی میرے نصیب میں لکھ دیجیو۔

بس اسٹینڈ پر پہنچے تو پتہ چلا کہ دس بجے کے بعد بسیں چلنی بند ہو جاتی ہیں۔ اب کوئی ٹیکسی لینی تھی۔ ٹیکسی اسٹینڈ پر گئے تو بڑی آرام دہ ایئر کنڈیشنڈ ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ ایک اور سواری کے ہمراہ ۳۰۰ ریال پر ٹیکسی لی۔ ٹیکسی ڈرائیور نیگرو تھا۔ پچھلی سیٹ پر ہم دونوں بیٹھ گئے۔ اگلی سیٹ پر دوسرا آدمی بیٹھ گیا۔ یہ حیدرآباد دکن (بھارت) کا ایک مسلمان تھا۔ راستے میں بتاتا رہا کہ

Marfat.com

"میں دو تین سال سے اپنی والدہ کے ساتھ یہاں مقیم ہوں. یہاں پاکستانی بے شمار ہیں. اتنی اچھی عربی بولتے ہیں کہ سعودی ہونے کا گمان ہوتا ہے"۔ خود میرے ساتھ ایسا ہی ہوا جس سے پاکستانی سمجھ کر بات کروں وہ کہے "NO URDU" اور جس سے سعودی سمجھ کر انگریزی میں بات کروں تو وہ اردو میں جواب دے دے. سعودیوں کی شکل، رنگت اور جسم کی بناوٹ ہم سے کافی ملتی ہے. میں نے حیدر آبادی مسلمان سے ہندوستان کے حالات پوچھے اور مسلمانوں کی حالتِ زار کے متعلق سوال کیا. لیکن وہ بڑے محتاط طریقے سے جواب دے رہا تھا، جیسے اندرا یا انڈیا کے متعلق کوئی تبصرہ کرنے سے گریز کر رہا ہو. میں نے اس کی جھجک دیکھتے ہوتے زیادہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔

راستے میں رات کے دو بجے کے قریب ایک پاکستانی ہوٹل پر رک کر کھانا کھایا. ہوٹل کیا ہیں، معمولی چھت پڑے ہوتے دو تین کمرے جی ٹی روڈ کے گرد بنے ہوتے ہوٹلوں کی طرح میزیں اور کرسیاں تھیں. کچھ لوگ اپنا کھانا نکال کر کھا رہے تھے. رات تو بالکل نہیں لگ رہی تھی. میزیں گندی تھیں. وہاں حیدر آباد دکن والے صاحب اتر ے اور ایک اور صاحب سوار ہو گئے. یہ صاحب پنڈی میں مری روڈ کے رہنے والے تھے اور مزدوری کے سلسلے میں آتے تھے. میں اور سلیم پچھلی سیٹ پر تھے جو کافی کشادہ اور آرام دہ تھی. سفر پھر شروع ہوا. ایک اور چوکی آئی۔ وہاں چیکنگ ہوتی. پاسپورٹ مانگے گئے. آگے والے صاحب نے ایک کاغذ پکڑا دیا. میں نے اپنا اور سلیم کا پاسپورٹ نکالنا چاہا تو صرف میرا

Marfat.com

نکلا۔ اسے دے کر دوسرا دیکھنے لگی۔ اتنے میں اُس نے کہا: "جاؤ" اب ہم نے سارا پرس، سارے کاغذات کھنگال ڈالے مگر سلیم کا پاسپورٹ نہ ملا۔ بڑی پریشانی ہوئی کہ پاسپورٹ تو جدہ ہی میں رہ گیا۔ پاسپورٹ کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں موجود تھیں، مگر اُن میں بھی سعودی عرب کے ویزا کی فوٹوسٹیٹ موجود نہ تھی کیونکہ یہ ویزا آخری دنوں میں لگا تھا اور فوٹوسٹیٹ میں پہلے کروا چکی تھی۔ اب یہی فکر کہ سفر کے آغاز ہی میں نہ دھر لئے جائیں۔ ہمارا تو خیال تھا کہ فجر کی نماز مسجد نبوی میں پڑھیں گے کیونکہ مکہ سے مدینہ تقریباً پانچ گھنٹے کا سفر تھا۔ مگر یہ سعادت ہمارے نصیب میں نہ تھی۔

۳۰ جولائی ۱۹۸۳ء

مدینہ شریف سے پندرہ میل پہلے ایک اور چیکنگ پوسٹ پر پھر وہی عمل دہرایا گیا۔ جب سلیم صاحب کا پاسپورٹ نہ ملا تو شرطہ صاحب (پولیس کا آدمی) نے ٹیکسی ڈرائیور کو جو حبشی تھا، اپنی زبان میں جانے کیا کہا کہ وہ لمبا تڑنگا آدمی بھیگی بلی بنا زمین پر نظریں گاڑے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔ ہم سے تو وہ پولیس مین مخاطب ہی نہ ہو۔ پنڈی والے صاحب کا اقامہ (رہائشی سرٹیفکیٹ) بھی غلط تھا۔ وہ خاصی عربی بول رہا تھا۔ اُس نے سمجھایا کہ "میرا نیا اقامہ بن رہا ہے اور میرے مالک نے مجھے یہ چٹ دے رکھی ہے تاکہ میں سفر کر سکوں"۔ مگر شرطہ تو سواریوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتا تھا۔ بس بار بار ٹیکسی ڈرائیور پر ہی غصہ نکالے۔ پھر اسے کچھ کہا۔ ڈرائیور نے ٹیکسی کچھ فاصلے پر کھڑی کر دی۔ بعد میں پتہ

Marfat.com

چلا کہ غیر ملکیوں کو پاسپورٹ کے بغیر بٹھانے پر ٹیکسی ڈرائیور کو دس سال تک قید اور جرمانہ الگ ہوجاتا ہے اور کبھی ٹیکسی بھی ضبط ہوجاتی ہے۔

اب رات کا دھندلکا چھٹ رہا تھا اور صبح کی روشنی پھیل رہی تھی۔ دور دور تک کوئی عمارت نظر نہیں آرہی تھی۔ بس یہی ایک عمارت تھی۔ سڑک بل کھاتی مدینہ سے مکہ کی طرف جارہی تھی جس پر تیز رفتار گاڑیاں چیکنگ کے لئے ٹھہرتیں اور چل پڑتیں۔ خاصی سخت چیکنگ ہورہی تھی۔ اسی دوران مدینہ شریف سے ایک کار آئی۔ اس میں دو بوڑھی عورتیں، ایک جواں سال عورت اور ایک ادھیڑ عمر کے صاحب نکلے۔ ان کو بھی ہماری طرح دھر لیا گیا۔ عربی تو ہماری سمجھ میں نہیں آرہی تھی، مگر وہ پنڈی والے صاحب اب مترجم کا فرض سنبھالے ہوئے تھے۔ ان سے پتہ چلا کہ یہ صاحب اپنی بھابی، پھوپھی اور ماں کے ہمراہ جارہے تھے۔ بھابھی چونکہ اپنے خاوند کے ساتھ نہیں، اس لئے ان کو روک لیا گیا ہے۔ وہ صاحب عربی جانتے تھے۔ بار بار اپنا موقف سمجھائیں مگر سپاہی یا ممکن ہے بڑا افسر ہو انہیں تقریباً دھکیل کر ایک طرف کر دیتا۔ ان صاحب کے چہرے کے تاثرات سے یوں لگ رہا تھا کہ رو دیں گے۔ باقاعدہ منت سماجت کر رہے تھے۔ اُن کا بس نہ چلتا تھا کہ پاؤں پکڑ لیں۔ باقی اُن سے جو کچھ بن پڑا کہا اور کیا۔ خیر کافی ردّوکد کے بعد انہیں اجازت مل گئی۔ مگر ہماری گلو خلاصی کے کوئی آثار نہ تھے۔ وہ شاید ہمیں ایک طرف کھڑا کر کے بھول چکا تھا۔

اب پیلی پیلی دھوپ سب طرف پھیل گئی تو ہلکی ہلکی گرمی بھی محسوس

Marfat.com

ہونے لگی۔ جوں جوں دن چڑھ رہا تھا توں توں میری گھبراہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میں سخت پریشان تھی کیونکہ سُنا تھا کہ یہ لوگ اگر بند کر دیں تو ہفتہ بھر خبر ہی نہیں لیتے۔ پھر آج کل تو حج کے دن ہیں۔ میرا تو خون خشک ہو رہا تھا۔ روہانسی ہو کر سلیم صاحب سے کہا کہ یہ ہمیں قید کر دیں گے۔ سلیم صاحب کی ہمت اور اطمینان دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ یوں گاڑی میں بیٹھے چیکنگ دیکھ رہے تھے جیسے حکومت پاکستان کے خصوصی نمائندے کی حیثیت سے چیکنگ کے کورس پر آتے ہوتے ہیں۔ میری بات سن کر ہنس پڑے۔ کہنے لگے: "لوگ تو مکہ کی قید کو ترستے ہیں۔ ہمیں موقع ملا ہے تو خوش ہونا چاہیئے۔" مجھے اس وقت ان کی ہنسی بے موقع لگی۔ میں نے دعا مانگنی شروع کر دی:

"یا رسول اللہؐ! آپ کے در پر آتے ہیں۔ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے دیدارِ روضہ کی خواہش لئے۔ اور یہ کیسا شرفِ میزبانی ہے، یہ کیسی مہمان نوازی ہے۔ یہاں سے رہائی تو بس آپؐ ہی کروائیں گے۔ ہمارا تو کوئی وسیلہ نہیں آپ کے سوا آسرا نہیں۔ ہمارے گناہوں سے درگزر کریں۔ نظرِ کرم کیجئے اور خود کوئی سبب نکالیئے۔"

قدرت خدا کی دیکھئے اور رسول کریمؐ کی مہربانی کہ اسی وقت ایک آدمی بنیان پہنے دھوتی نما لباس میں آنکھیں ملتا عمارت سے نکلا۔ میں نے سلیم سے کہا کہ اس سے جا کر بات کریں۔ سلیم صاحب نے بات کی۔ ٹکٹ دکھایا، پاسپورٹ کی فوٹو سٹیٹ کاپیاں دکھائیں۔ وہ سمجھ گیا یا انؐ

Marfat.com

کا حکم ہوگا کہ اُس نے ہمیں فوراً اجازت دے دی ؎

تیری رحمت ہے اے میرے مالک
میں کہاں اور یہ مقام کہاں

دل ہی دل میں اپنے پیارے حبیبؐ کی میزبانی کا شکریہ ادا کیا۔ حبشی ڈرائیور بھی خوش ہوگیا۔ پنڈی والے صاحب کو البتہ روک لیا گیا۔ وہ کہنے لگے: آپ بے فکر ہوکر جائیں میں اپنے مالک کو فون کروا دوں گا۔ وہ آکر لے جائے گا۔

روضۂ اقدس کی زیارت

حاجیو آؤ شہنشاہ کا روضہ دیکھو
کعبہ تو دیکھ چکے کعبے کا کعبہ دیکھو!

درود شریف پڑھتے ہوئے مدینہ منورہ جا پہنچے۔ اب دن کے دس بج چکے تھے۔ وہاں ایک پاکستانی ہوٹل میں ناشتہ کیا۔ مسجدِ نبویؐ کے سامنے واقع ایک عمارت میں وضو وغیرہ سے فارغ ہوکر دونوں اپنے پیارے حبیبؐ کے در پر آتے۔ مکہ معظمہ میں کعبہ شریف کی اپنی خوبصورتی، جاہ و جلال اور شان و شوکت تھی۔ مدینہ منورہ میں مسجدِ نبویؐ کی خوبصورتی، نزاکت اور حسن کا بہترین امتزاج تھی۔ دونوں جگہوں کی علیحدہ علیحدہ فضا ہے۔ سعودی حکومت نے اپنی عقیدت اور محبت کے اظہار کے لئے مسجدِ نبویؐ کے گوشے گوشے کو آرائشی اشیاء، فانوسوں اور قالینوں سے مزین کر دیا ہے۔ خوش خطی کے شاہکار نمونوں کے لئے ایک ایک ستون اپنی علیحدہ منفرد

Marfat.com

حیثیت رکھتا ہے۔ قدم قدم پر نفل گزارنے کی جگہیں ہیں۔ اپنی قسمت پر نازاں و فرحاں روضہ شریف کی جالیوں کے پاس پہنچے۔ جو جو دعا یاد آئی وہ مانگی۔ جالی سے لگ کر اندر دیکھنے کی کوشش کی کہ شاید روضۂ اقدس نظر آجاتے، مگر جالیوں کے اندر سبز پردہ پڑا ہوا تھا۔ کافی دیر تک مسجد نبویؐ کے صحن میں بیٹھے دعائیں مانگتے رہے۔ نفل گزارے یہی دعا لب پر رہی:

"یارسول اللہؐ دوبارہ یہ سعادت نصیب میں لکھ دیجئو۔ ابھی تو حسرتِ دیدار نہیں مٹی کہ وقتِ رخصت آن پہنچا ہے"!

چونکہ رات کے ۲ بجے جدّہ سے فرینیفکرٹ جانا تھا، آنحضورؐ اور اُن کے محبوب ساتھیوں کو سلام رخصت کیا اور باچشمِ نم مسجدِ نبویؐ سے سے باہر آگئے ؎

الوداع اے شہرِ نبیؐ تیرے درو دیوار کو ہزاروں سلام

اَب بھی پھر مسئلہ کہ اگر ٹیکسی میں جائیں تو راستے میں بار بار چیکنگ کا خطرہ ہوگا۔ سرکاری بس میں چلتے ہیں تو اس کا بھی ٹکٹ بغیر پاسپورٹ دیکھے نہیں دیتے۔ پہلے مدینہ منورہ میں داخلہ مشکل تھا، اب نکلنا ممکن نہ تھا۔ بہرحال، سرکاری بسوں کے اڈے پر جا بیٹھے۔ وہاں ایک کیفے کے پاکستانی مالک نے کہا کہ وہ ہماری مشکل حل کر دیں گے۔ ہم نے آرام سے بیٹھ کر کھانا کھایا، بوتلیں پیں۔ تو پھر اُس سے کہا کہ اب جا کر ٹکٹ لے آؤ تو وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا کہ ابھی میرا واقف کار آئے گا، فلاں سے کہوں گا، وغیرہ وغیرہ۔ سلیم صاحب کو ہمیشہ غلط بات پر غصہ آجاتا

Marfat.com

ہے۔ تلخی سے بولے کہ پھر وعدہ کیوں کیا تھا۔ غصے کے عالم میں اڈے کے دفتر چلے گئے۔ وہاں جانے کیا بات کی کہ ایک سعودی افسر اُن کے ساتھ آیا اور خود ٹکٹ دلوا کر چلا گیا۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔

بس بھی ٹیکسی کی طرح ایر کنڈیشنڈ تھی، لیکن باہر کی گرمی اور تپش اندر بھی اثر دکھا رہی تھی۔ سڑک درمیانِ صحرا بھاگی چلی جا رہی تھی۔ دور دور تک ریت ہی ریت تھی جو دھوپ میں جل رہی تھی۔ سڑک کی دونوں جانب جوس کے خالی ٹن، بوسیدہ ٹائر، خراب موٹریں بکھری پڑی تھیں۔ کہیں کوئی سبزہ یا درخت حتیٰ کہ پرکاہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مدینہ شریف کے اردگرد سیاہ چٹانیں اور کالے پہاڑ سینہ تانے چوکیداروں کی طرح کھڑے تھے، مگر بیس پچیس میل کی مسافت کے بعد مٹی اور ریت کے ہموار میدان شروع ہو گئے۔ راستے میں ہم ایک ہوٹل پر رکے۔ یہ ذرا اچھی حالت میں تھا اور دو منزلہ تھا۔ ہم نے یہاں کی مشہور مچھلی منگوائی۔ ۱۰ ریال یعنی چالیس روپے میں چھوٹی سی مچھلی آ گئی۔ پانچ ریال میں آدھا مرغ آیا۔ دونوں چیزیں بیرا پلیٹ میں دے گیا، لیکن روٹی ہاتھ میں پکڑا گیا۔ لوگ اکھڑ اور لاتعلق سے نظر آتے۔ پاکستان کے مقابلے میں مہنگائی تھی۔ صبح جو مدینہ شریف میں ناشتہ کیا، وہ ایک آملیٹ، ایک روٹی اور دو کپ چائے پر مشتمل تھا۔ جس کا فی آدمی ساٹھ روپے کا بل بنا۔ ہمارے پاکستان میں تربوز سستا ترین پھل ہے۔ وہاں ایک سو یا ایک سو بیس روپے تک مل رہا تھا۔ لوگوں نے فرج میں ایسے سنبھال کر رکھا تھا جیسے ہمارے ملک میں لیچی رکھی جاتی ہے۔ لوگ ایک وقت میں ایک پھانک تراش کر اور اس کے دو دو تین تین ٹکڑے

Marfat.com

کر کے کھاتے ہیں، بقایا اگلے وقت کے لیے رکھ دیتے ہیں۔ اتنے مہنگے پھل کے ساتھ ایسا ہی سلوک روا ہے۔

بحیرۂ قلزم

اس سفر میں سمندر ساتھ ساتھ تو تھا، مگر کبھی کبھار اس کی ایک آدھ جھلک بھی دکھائی دے جاتی۔ اب جانے وہ جھلک بھی پانی تھا یا سراب! ویسے مٹیالے اور گہرے رنگ کے علاوہ کوئی اور رنگ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک آدھ جھاڑی نظر آتی جو جل کر سیاہ ہو چکی تھی۔ پانی کی کمی سے جمادات اور نباتات کا جو حال ہوتا ہے، اس کی بہترین مثال یہاں موجود تھی۔ مدینہ شریف کے نواح میں ایک جگہ کھجوروں کا باغ لگانے کی کوشش کی گئی تھی، مگر پورا باغ تباہ ہو چکا تھا۔ پتے سوکھ کر مرجھا چکے تھے۔ تنے کالے ستون بن چکے تھے۔ جب کافی فاصلہ طے کر لیا تو ائر کنڈیشنڈ کی ہوا بھی گرم ہو گئی۔ سلیم سفر میں زیادہ دیر تک سوتے رہے۔ دو تین دن کے مسلسل سفر نے ان کا رنگ پیلا کر دیا تھا۔

شام کے قریب جدہ پہنچے تو یوں لگا جیسے کسی اور ملک میں آ گئے ہیں۔ سبزہ آنکھوں کو طراوت دے رہا تھا۔ جا بجا خوبصورت متنوع اقسام کے بوٹے، پھول اور پھول دار جھاڑیاں اُگائی گئی تھیں۔ جدہ کی بندرگاہ بھی بڑی خوبصورت تھی۔ سر سبز زمین، نیلا سمندر، بلند و بالا عمارتیں اور سمندر میں چلتی ہوئی کشتیاں بڑا دلفریب منظر دکھا رہی تھیں۔ سُنا ہے پہلے تو دو تین فٹ اونچی جھاڑیوں کے علاوہ کچھ نہ اگتا تھا مگر اب پہاڑ کاٹ کر

Marfat.com

زرخیز مٹی کی نہیں پھاکر ایسے نادرِ روزگار پودے اگائے گئے تھے اور ان کو فواروں کے ذریعہ پانی پہنچانے کا ایسا اعلیٰ انتظام تھا کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ خدا نے تیل سے اس سرزمین کو نوازا ہے۔ یہاں پانی مہنگا اور تیل سستا ہے۔ اسکوٹر بالکل نظر نہیں آتے بلکہ خوبصورت لمبی لمبی گاڑیاں ہیں۔ پاکستانی لوگوں کی اکثریت ٹیکسیاں چلاتی ہے۔ دن کو اپنا کام کیا۔ بعد میں اپنی گاڑی میں مسافر لادے انہیں گھر چھوڑ آتے اور کچھ فالتو رقم کمالی۔ چیکنگ ہوئی تو کہا کہ اپنے پاکستانی رشتہ دار ہیں۔ ان کو گھر لے جا رہا ہوں۔ بعض اوقات پکڑے بھی جاتے ہیں۔

اب ٹیکسی میں بیٹھ کر پھر نورین کے گھر پہنچے۔ انور خورشید صاحب نے دروازہ کھولا تو خوشی سے نعرہ لگایا۔ "نورین! پاسپورٹ والے آگئے"۔ پتہ چلا کہ وہ بھی سخت پریشان رہے ہیں کیونکہ ہمارے روانہ ہونے کے بعد انہوں نے کسی کام کی غرض سے جو دراز کھولی تو پاسپورٹ دیکھ کر اُن کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ خورشید صاحب سارا وقت ٹیلی فون کے پاس بیٹھے رہے کہ اب کسی چوکی سے فون آئے گا کہ ہم نے دو پاکستانیوں کو قید کر رکھا ہے۔ پاسپورٹ لے کر فوراً پہنچو۔ وہ بیچارے تو یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہے تھے کہ ہم کسی جیل میں بند ہوں گے۔ اسی لئے ہمیں دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے۔ ہمارے پڑاؤ کا بھی انہیں کچھ علم نہ تھا، ورنہ پاسپورٹ لے کر خود وہیں پہنچ جاتے۔ اب تو بار بار کہیں کہ آپ لوگ بڑے خوش قسمت ہیں، مقدر کے دھنی ہیں جو یوں بغیر پاسپورٹ کے سبھی مقامات سے بخیر و عافیت گھوم پھر کر گھر آ پہنچے۔ ان کو تو اپنی

Marfat.com

آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ شام کو ان کا ارادہ تھا کہ ہمیں ساحل سمندر پر سیر کے لئے لے جائیں۔ مگر اپنا حال یہ کہ ٹانگیں تھکن سے ٹوٹ رہی تھیں۔ یہی دل چاہتا تھا کہ چپ چاپ بیٹ جائیں اور سو رہیں۔ چنانچہ یہی کیا۔ رات کے بارہ بجے خورشید صاحب مع بال بچوں کے ہمیں جدہ ایئرپورٹ پر چھوڑنے آئے۔

شاہ عبدالعزیز انٹرنیشنل ایئرپورٹ

یہ ایئرپورٹ کیا ہے؟ انسانی ذہن کا شاہکار ہے، اتنا خوبصورت اور شاندار ایئرپورٹ میں نے سارے سفر میں کہیں نہیں دیکھا۔ جدّہ ایئرپورٹ کے تین ٹرمینل ہیں۔ ایک انٹرنیشنل، دوسرا حاجیوں کے لئے، تیسرا مقامی فلائٹس کے لئے۔ شاہ عبدالعزیز انٹرنیشنل ایئرپورٹ رقبہ اور جدید سہولتوں کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا فضائی مستقر ہے۔ علاوہ ازیں اپنے ڈیزائن اور تعمیراتی نمونے کی وجہ سے دنیا بھر میں منفرد ہے۔ حج ٹرمینل ایک نظر میں خیموں کا شہر دکھائی دیتا ہے۔ ایسے غیر معمولی خیمے جو انسانی تاریخ میں پہلی بار تیار کئے گئے ہیں اور ان کی تیاری میں امریکہ، کینیڈا، فرانس، مغربی جرمنی، جاپان اور خود سعودی عرب کی حکومت نے حصّہ لیا ہے۔ ان خیموں کے لئے جو کپڑا استعمال کیا گیا ہے اس کی مضبوطی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک سو ساٹھ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والا باد و باراں کا طوفان بھی اس کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ بلاشبہ یہ دنیا کا سب سے بڑا جدید ترین اور وسیع و عریض ہوائی اڈہ ہے۔

Marfat.com

مشہور امریکی جزیرہ مین ہٹن سے رقبہ کے لحاظ سے دوگنا ہے۔ اگر دنیا کے پانچ بڑے ایرپورٹ یعنی نیو یارک کا کینڈی ایرپورٹ اور لوگا شیا ایرپورٹ، نیوجرسی کا نیوارک ایرپورٹ، شکاگو کا اوہیرا ایرپورٹ اور لاس اینجلز کا ایرپورٹ ملا کر یکجا کر دیا جاتے، تب بھی ان کے رقبے سے یہ ڈیڑھ گنا ہے۔ اس کی تعمیر میں پچاس ارب روپے کی لاگت آئی تھی۔ اس کی رسم افتتاح ۱۲ اپریل ۱۹۸۱ء کو ہوئی۔ اس رسم میں استعمال ہونے کے لئے ۳۸ ٹن تازہ پھول یورپ سے منگوائے گئے اور ان کو افتتاح کے دن تک کے لئے ریفریجریٹر میں بند کر کے تازہ رکھا گیا۔ یہاں سے لوگوں اور حاجیوں کو ٹرانسپورٹ کی سہولتیں بآسانی دستیاب ہیں۔ ہوائی اڈے کے پاس ریگستانی حصے کو ختم کرنے کے لئے بہتر ہزار درخت اور دوسو پانچ ملین پودے لگائے گئے ہیں۔ یقیناً یہ اڈہ کئی اعتبار سے سعودی مہمان نوازی کی بیّن دلیل ہے۔ رات کو جب ہم اس اڈہ پر پہنچے تو سارا ایرپورٹ جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ دُور دُور تک روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

جدہ ایرپورٹ کی طرح سارا راستہ جدہ کی روشن سڑکوں، بلند و بالا عمارتوں اور وسیع و عریض دفاتر کو دیکھنے میں گزر رہا تھا۔ جدہ تجارتی مرکز بھی ہے عظیم بندرگاہ بھی ہے، پھر تسبیح و تقدس اور طہارت و تقویٰ کے شہروں کو جانے کی راہ میں واقع ہونے کی وجہ سے یہاں ہر وقت زائروں، سیّاحوں اور تاجروں کا ہجوم رہتا ہے۔ رات کو جدہ ایرپورٹ زندگی کا ناقابلِ فراموش منظر پیش کرتا ہے، عمارت کے اندر ہر طرف حاجی ہی حاجی نظر آ رہے تھے، حتیٰ کہ بعض لوگ زمین پر بستر لگائے ہوئے تھے، آس پاس

Marfat.com

ساماں رکھا ہوا تھا اور ایسے سو رہے تھے جیسے کسی آرام دہ نرم گداز بستر پر تنہا کمرے میں آسودہ پڑے ہوں. آس پاس بے پناہ شور تھا۔ لوگ چل پھر رہے تھے، مگر وہ مکرّم و محترم ملک اور رفعت وعظمت والی سرزمین پر پہنچ چکے تھے، اس لئے دلی اطمینان اور قلبی سکون ان کے چہروں سے عیاں تھا۔

ہم لوگوں نے خورشید صاحب اور نورین کو الوداع کہا۔ ان سے رخصت ہوتے ہوتے یوں محسوس ہوا جیسے اپنے گھر کے عزیزوں سے رخصت ہو رہے ہیں۔ ان دونوں میں وہ جس اپنائیت اور محبت سے پیش آئے وہ زندگی بھر یاد رہے گا۔

اُن کے ساتھ سعودی سرزمین کو بھی خدا حافظ کہا اور نئی منزل کی طرف کوچ کر گئے۔ اگرچہ ہمارا قیام یہاں مختصر یا مختصر ترین تھا مگر ؎

روح کو لمس گریزاں بھی بہت ہے اس کا
وہ ہوا جس کو مدینہ کی ہوا کہتے ہیں !

Marfat.com

ہٹلر کی سرزمین ۔ جرمنی

۳۱ جولائی ۱۹۸۴ء

ہمیں جس جس ملک میں جانا تھا، وہیں کی فضائی کمپنی کے جہاز میں سفر کیا، سعودی عرب سعودی ایئرلائن کے ذریعے پہنچے تھے۔ اس دفعہ لف تھانسا کے ذریعے فرینکفرٹ جا رہے تھے۔ رات بارہ بجے چلے تو سارا راستہ گہری سیاہ تاریکی میں طے ہوا۔ جانے کن علاقوں پر پرواز کی، کن سمندروں کو طے کیا، کہاں کہاں سے طیارہ گزرا، مگر تمام مسافروں کی طرح ہمارا وقت بھی سونے میں گزرا۔ لف تھانسا والوں کے جہاز اور سروس دونوں اعلیٰ معیار کے تھے۔ فضائی میزبانیں مسلسل گھوم پھر کر لوگوں کی ضروریات پوری کر رہی تھیں۔ لباس اور چال ڈھال سے بڑی چاق و چوبند نظر آ رہی تھیں۔ جہاز کی کھڑکیوں سے اُجالے کی کرنیں اندر آئیں تو نیچے دیکھنے کی تمنا نے کھڑکی سے جھانکنے پر اکسایا۔ مگر وہاں وہی سفید روئی کی ڈھیریاں بادلوں کی شکل میں زمین کو ڈھانپے ہوئے کہہ رہی تھیں کہ یہ اسرار ہے۔ اتنی جلدی اس کا قفل نہیں کھولا جائے گا۔ ایشیا سے یورپ پہنچ چکی ہو، کوئی مذاق تو نہیں۔ بہرحال، دل میں عجب ہل چل سی مچی ہوئی تھی۔ جانے یہ نیا ملک کیسا

Marfat.com

ہوگا۔ کیسے لوگ ہوں گے۔ ہمارا وقت کیسے گزرے گا۔ جہاز ہی میں ہلکا سا ناشتہ کیا۔ ارد گرد کے غیر ملکی بھی انگڑائیاں لیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے۔ ان کی طرف رشک بھری نگاہوں سے دیکھا کہ ان کو کیسا اطمینان ہے۔ شاید جرمنی کے باشندے ہیں یا پہلے بھی جرمنی آتے ہیں کیونکہ جہاز میں پاکستانی تو بس ہم دو ہی تھے۔

جہاز نے فرینکفرٹ پر دو تین چکر لگائے۔ سرسبز علاقہ، بہت سی اونچی عمارتیں اور ایک بلند و بالا مینار بھی نظر آیا۔ پھر ایئر پورٹ پر اترے اور امیگریشن سے فارغ ہو کر سلیم صاحب کرنسی تبدیل کروانے لگے۔ میں نے ٹرالی میں سامان رکھا ہوا تھا۔ سامان کیا تھا، ایک سوٹ کیس اور ایک بریف کیس۔ یہی ہمارا کل سرمایۂ سفر تھا۔ اتنے میں تین سکھوں پر نظر پڑی۔ سوچا کہ یہ تو اہلِ زبان ہیں، ان سے ایڈریس معلوم کر لیتے ہیں کہ کتنی دور ہے، کتنے مارک کرایہ اندازاً ہوگا۔ کیونکہ سارا پروگرام انتہائی جلدی میں بنا تھا۔ اس لئے جہاں بھی گئے، خود ٹیکسی کر کے میزبان کے گھر پہنچے۔ کسی کو پہلے سے اطلاع نہ تھی۔ صرف نیویارک میں ظفر آیا ہوا تھا چنانچہ ایک سکھ کو پتہ بتایا۔ وہ بتاتے بتاتے مجھے ٹرالی سے ذرا آگے لے گیا۔ پیچھے سے اس کے دو ساتھیوں نے میرا بریف کیس اٹھا کر اپنی ٹرالی میں رکھا اور یہ جا وہ جا۔ پتہ کے متعلق بھی اس نے غلط بتایا کہ بالکل نزدیک ہے۔ جب میں پتہ پوچھ کر سامان کی طرف آئی تو بریف کیس غائب! پتہ بتانے والے کی طرف گھوم کر دیکھا تو ایک دو منٹ کے عرصے میں وہ بھی چھلاوہ بن کر نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ سلیم صاحب چند قدم کے فاصلے

Marfat.com

پر EXCHANGE SHOP سے رقم بدلوانے گئے تھے۔ انہیں آواز دی۔ وہ آئے۔ ان کو سارا حال بتایا۔ وہ مجھے وہیں چھوڑ کر ایئرپورٹ سے باہر نکلے۔ اِدھر اُدھر دیکھا، مگر چوروں کو ملنا ہوتا تو بھاگتے کیوں؟ اب مجھے STRIKE ہوا کہ ان تینوں نے ہمیں اجنبی جان کر ملی بھگت سے یہ سارا ڈرامہ لوٹنے کے لئے رچایا تھا۔ لیجئے جناب! یورپ کے سفر کی ابتدا ہی میں مارے گئے۔ میرا کیمرہ، سلیم صاحب کا سفری سوٹ، میرا سوئیٹر اور چند ایک چھوٹی موٹی چیزیں جاتی رہیں۔ بہرحال ڈاکوؤں کو بھی بریف کیس کھول کر مایوسی ہوتی ہو گی، کیونکہ رقم نام کی کوئی چیز اس کے اندر نہ تھی۔ ہم سوٹ کیس لے کر باہر نکلے۔ ایئرپورٹ سے جاننے والوں کو فون کیا۔ مگر نمبر شاید ان کی دکان کا تھا اور آج اتوار کا دن تھا۔ دکان بند ہو گی۔ کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ مجبوراً ٹیکسی لی۔ ڈرائیور کو پتہ دکھایا اور اللہ توکل چل پڑے۔ منزلِ مقصود پر پہنچنے کے بعد پتہ چلا کہ ایک ماہ ہوا وہ یہ گھر تبدیل کر گئے ہیں۔ لیجئے۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ سلیم صاحب کہنے لگے کہ ٹیکسی ڈرائیور سے ہی کہتے ہیں۔ وہ ہمیں کسی درمیانے درجے کے ہوٹل میں چھوڑ آئے۔ جرمنی کے ٹیکسی ڈرائیور شاید سارے ہی بڑے مددگار اور ہمدرد ہوتے ہونگے بہرحال، ہمیں بڑا ہی اچھا ٹیکسی ڈرائیور ملا۔ اس نے ہمیں ایک ہوٹل میں چھوڑا اور اپنا اسی مارک کرایہ لے کر چل دیا۔ ہوٹل کا مینیجر جو جرمن تھا، شکر ہے انگریزی بولتا اور سمجھتا تھا۔ ورنہ جتنے بھی جرمن ملے، انگریزی سے خصوصی اجتناب کرنے والے ملے اگر آتی ہو تو بولتے نہیں، سمجھتے ہوں تو بتاتے نہیں۔ کندھے اچکا کر چل پڑتے ہیں کہ اگر صاحب بات کرنی ہے

Marfat.com

تو جرمن زبان میں کرو، ورنہ اپنا راستہ ناپو۔ ہم نے ایک ڈبل کمرے کا ایک رات کا کرایہ پوچھا تو اس نے ۱۰۰ مارک بتائے یعنی ۵۰۰ روپے۔ ایک تو ہم پاکستانیوں کو غیر ملک جا کر ضرب تقسیم کی بڑی بُری عادت پڑ جاتی ہے۔ جونہی کسی نے قیمت بتائی، ہم نے ضرب لگا کر اپنے روپے میں قیمت دیکھی، توبہ کی اور آگے بڑھ گئے۔ جرمن ایک مارک کو ایک سمجھتے ہیں، مگر ہم پانچ روپے۔ انگلینڈ میں ایک پونڈ کو بھی ایک ہی تصور کیا جاتا ہے، مگر ہم بائیس روپے، پھر یوں حساب لگاتے جاتیے تو قیمتوں میں یک لخت کتنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ بہر حال، سلیم صاحب پہلے جا کر خود کمرہ دیکھ آتے پھر مجھے بھی لے گئے اور ایڈوانس ۱۰۰ مارک جمع کروا دیئے۔

ہم لفٹ میں اوپر کی منزل میں پہنچے۔ لمبی سے راہداری میں آمنے سامنے کمرے تھے۔ دروازہ کھولا۔ کمرہ اچھا خاصا تھا۔ ڈبل بیڈ، صاف ستھری چادریں، الماری، میز، کرسی، ٹیلی فون اور ٹیلی وژن۔ چھوٹا سا فرج بھی پڑا ہوا تھا۔ ایک کھڑکی جو پچھلی گلی میں کھلتی تھی، اس سے گلی کے اس پار واقع مکانوں کے صحن پر بھی نظر پڑ رہی تھی۔ کمرے کا ایک دروازہ تھا جس سے داخل ہو کر اندر آئے تھے۔ وہ دروازہ جونہی بند کیا تو ایک دم سے گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ میں نے جا کر کھڑکی کھول دی۔ مگر گرمی اور حبس پھر بھی دُور نہ ہو۔ سلیم صاحب سردی گرمی دونوں سے جلدی گھبرا جاتے ہیں۔ کہنے لگے کہ فون کرو اور مینیجر سے کہو ہمیں پنکھا چاہیئے

میں نے فون پر اپنی پرابلم سمجھائی تو بڈھا جرمن یوں ہنسنے لگا جیسے میں نے اسے کوئی پُر لطف لطیفہ سنا دیا ہو۔ پھر کہنے لگا یہاں پنکھے نہیں ہوتے کھڑکی کھول لو اور آرام کرو۔" لیکن آرام کیسے! سلیم صاحب کہنے لگے کہ

Marfat.com

"میں تو ایک منٹ بھی یہاں نہیں ٹھہر سکتا" میں انہیں بہتر اسمجھاؤں کہ اب کہاں مارے مارے پھریں گے۔ پردیس ہے، گرمی سردی برداشت کرو۔ کل تک گھر یا کسی اور ہوٹل میں شفٹ ہو جائیں گے۔ مگر سلیم صاحب تو کہیں کہ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ منیجر سے پوچھو کہ نزدیک کوئی ائرکنڈیشنڈ ہوٹل ہے۔ پھر فون اٹھایا۔ بڈھا کہنے لگا: "ائرکنڈیشنڈ ہوٹل تو بس ایئرپورٹ کے نواح میں ہیں۔ اوزار دگرد کے ہوٹل ایسے ہی ہیں۔"

۳۱ جولائی یورپ میں بھی اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ گرمی اور اچھی خاصی گرمی، ہوا بند کمرہ۔ ہم سخت پریشان تھے۔ ہمیں انگلینڈ میں بھی کافی لوگوں نے بتایا کہ انہوں نے پیڈسٹل اور ٹیبل فین اسی سال خریدے ہیں، ورنہ ایسی سخت گرمی کبھی یورپ میں نہیں پڑی۔ میں تو سلیم صاحب سے اکثر کہتی تھی کہ پاکستان سے ہم دو نہیں تین آتے ہیں۔ ایک تم اور میں اور تیسری بی گرمی۔ سلیم صاحب برابر کہیں کہ فوراً اس قید خانے سے نکلو۔ مجبوراً "قہرِ درویش برجانِ درویش" کے مصداق سوٹ کیس اٹھایا اور پورٹر کی ڈیوٹی انجام دیتے ہوتے نیچے آن پہنچے۔ منیجر کو کمرے کی چابی دی، اپنے سوبار کے لئے اور سڑک کے کنارے کھڑے ہو گئے۔

اب اِدھر سے گاڑیاں آ رہی ہیں، اُدھر سے گاڑیاں جا رہی ہیں مگر سب پرائیویٹ۔ کوئی ٹیکسی نہیں گزر رہی تھی۔ سڑک اگرچہ بے حد خوبصورت تھی، سرسبز، سایہ دار درختوں سے گھری ہوئی صاف شفاف۔ مگر اس وقت تو دشمنِ جان لگ رہی تھی۔ غلطی یہاں بھی نو آموز مسافروں والی کی یعنی سڑک پر کھڑے ہو کر ٹیکسی کا انتظار۔ یورپ میں ٹیکسی پاکستان کی

Marfat.com

طرح راستے میں گزرتے نہیں ملتی۔ اس کے لئے باقاعدہ فون کیا جاتا ہے اور ٹیکسی اڈے سے بلوائی جاتی ہے۔ اُس بڈھے جرمن کو ہم سے خار ہوگا، اس لئے اُس نے ہمیں کچھ نہ بتایا، اور ہم دیارِ غیر میں ایک غیر معروف سی سڑک پر کھڑے ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرا رہے تھے۔ میرا مؤقف تھا کہ " جوں جوں دن ڈھلتا آہستہ آہستہ ٹھنڈک ہو جاتی۔ اب کہاں جائیں گے۔" سلیم صاحب کہہ رہے تھے " سڑک کنارے گزارا کرلوں گا مگر اس گرمی میں اُس کمرے میں بند نہ ہوں گا۔"

وہاں کھڑے کھڑے بیس پچیس منٹ گزرے ہوں گے کہ دو لڑکے سڑک کے دوسری طرف سے گزرتے نظر آئے۔ میں نے کہا " سلیم! یہ پاکستانی لگتے ہیں۔" وہ دونوں بھی ہماری طرف دیکھ کر آپس میں کچھ بات کرکے مسکراتے۔ سلیم نے زور سے آواز دے کر انہیں بلایا۔ وہ آ گئے۔ میں نے پوچھا " پاکستانی ہو؟" کہنے لگے: " جی ہاں!" میں نے کہا: " کمال ہے پردیس میں ہم دونوں کو یوں سرگرداں دیکھ رہے ہو اور کان دبا کر گزرے جا رہے ہو۔" شرمندہ سے ہو گئے۔ پوچھنے لگے " آپ کو کہاں جانا ہے؟" سلیم کہنے لگے: " جانا کہاں ہے، کسی ایئر کنڈیشنڈ ہوٹل کا پتا بتاؤ۔ یہاں تو ہوٹل میں پنکھا نہیں اور گرمی ہے کہ برداشت نہیں ہو رہی۔"

وہ کہنے لگے: " ہوٹل تو ہم آپ کو لے چلیں گے مگر آپ یہاں آئے کن کے پاس تھے؟" میں نے اصغر صاحب کا ایڈریس نکال کر دکھایا۔ وہ کہنے لگے: " ان صاحب کو ہمارے کمرے میں رہنے والے ایک صاحب مرزا ولایت جانتے ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں تو وہ آپ کو ان کے گھر

Marfat.com

لے جائیں گے۔"

للہ الحمد! سوٹ کیس انہوں نے خود پکڑ لیا اور آگے آگے چل پڑے۔ خداوند کریم نے اپنی کرم نوازی سے ہمیں غیب سے مدد بھیجی تھی۔ قدرے اطمینان حاصل ہوا تو فرینکفرٹ کی سڑکوں اور فلیٹوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ سرسبز درختوں کی بہتات، بالکونیوں میں سرخ نیلے پیلے پھولوں کی بہار اور صفائی ستھرائی کا اعلیٰ معیار نظر آیا۔ اُن لڑکوں کے ساتھ ہم نے کچھ فاصلہ ٹرام کے ذریعے طے کیا۔ پھر بس میں سوار ہوئے۔ بالآخر ایک سڑک پر واقع ایک عمارت میں داخل ہوئے۔ تنگ سی سیڑھیاں طے کرنے کے بعد ایک گیلری سی آئی جس میں آس پاس تین چار کمرے تھے۔ اُن میں سے ایک کمرے میں ہم داخل ہوئے۔ ایک بستر، ایک صوفہ سیٹ، ایک میز اور دو کرسیاں پڑی تھیں۔ کمرے کے اندر ہی واش بیسن لگا ہوا تھا جس کے پاس ایک شخص کھڑا شیو کر رہا تھا۔ یہی مرزا ولایت تھے۔ ان دونوں لڑکوں نے ہمارا تعارف کروایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ آدھی شیو چھوڑ کر دوسرے کمروں میں اطلاع دینے چلے گئے۔ . . . .

. . . . ان سارے کمروں میں پاکستانی ہی رہتے تھے۔

دو تین منٹ کے وقفے کے بعد سارے کمروں کے مکین آ گئے۔ اُن کے لئے انتہائی خوشی کی بات تھی کہ اپنے وطن سے آئے ہیں اور اُن کے مہمان ٹھہرے ہیں۔ پہلے ٹھنڈی میٹھی لسی آ گئی۔ پیاس لگی ہوئی تھی۔ بڑی غنیمت لگی۔ پھر پراٹھے، چائے، آملیٹ اور باداموں کا حلوہ آ گیا۔ غرضیکہ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ خوب خاطر مدارات ہو۔ بار بار کہہ کر کھلا رہے تھے۔ لالہ موسیٰ

Marfat.com

کے ایک صاحب بشیر نیازی بچوں کی آوازوں کا کیسٹ سن رہے تھے۔ چونکہ اتوار تھا اس لئے سبھی لوگ اپنے اپنے کمروں میں موجود تھے۔ ٹیپ میں ایک بچی معصوم سی آواز میں بول رہی تھی :

" ابا جی! آپ اس عید پر نہیں آئے۔ ہم نے عید نہیں منائی۔ باجی کو بھی بخار تھا۔ ہم سب نے آپ کو بڑا یاد کیا۔ ابا جی! آپ جلدی جلدی آ جائیں اور ہمارے لئے خوب اچھے اچھے تحفے لائیں۔ آپ کا منی آرڈر مل گیا تھا۔ اب پپو کی باتیں سنیں"۔ پھر پپو کی توتلی باتیں۔ پھر امی، دادی، باجی غرضیکہ پورا ٹیپ اسی قسم کے پیغاموں سندیسوں سے بھرا ہوا تھا۔

ہم نے تھوڑی دیر آرام کیا۔ شام کو مرزا ولایت ہمیں اصغر صاحب کے گھر لے گئے۔ اصغر اور ان کی بیوی خالدہ بڑی خوشدلی سے ملے۔ ان کی بچی حیران نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ چونکہ پہلی دفعہ ملی تھی، اس لئے اجنبی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ مگر دو دن کے بعد جب ہم انگلینڈ کے لئے رخصت ہونے لگے تو کہنے لگی: " امی! پہلی دفعہ جب آنٹی کو دیکھا تو میں نے سوچا کہ ان کو تو میں جانتی ہی نہیں مگر اب تو یہی دل چاہتا ہے کہ یہ ہمارے پاس بہت دن رہیں۔"

شام کو اصغر اور خالدہ ہم دونوں کو فرینکفرٹ کی سیر کے لئے لے گئے۔ پہلے ہم لوگ PALMER GARTEN گئے جس میں انواع و اقسام کے پھول پودے، درخت اور رنگ برنگی نباتات تھی۔ اسی میں کھیل کے وسیع گراؤنڈ بھی تھے۔ جہاں بلا مبالغہ پچاس پچپن کی عمر والی بوڑھیاں اچھل اچھل کر ٹینس کھیل رہی تھیں۔ کیا چستی کیا تیزی تھی۔ لباس ان کے

Marfat.com

خوشنما، رنگین پھولوں سے مزین۔ دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ اصغر صاحب کی ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان تھی۔ وہ بتلانے لگے کہ "جرمن بوڑھی عورتیں کپڑے خریدتے وقت سب سے زیادہ وقت لیتی ہیں اور خوب شوخ اور جدید ڈیزائن کے کپڑے خریدتی ہیں" یہ بات میں نے بھی نوٹ کی کہ بوڑھیوں کے کپڑے جوان لڑکیوں سے زیادہ خوبصورت تھے۔ وہیں بیٹھ کر ہم نے مشروب پیئے اور ان کا کھیل دیکھا پھر فرینکفرٹ ٹاور دیکھنے چلے جو جہاز کے نیچے اترتے وقت بھی شہر کی دیگر عمارتوں میں نمایاں نظر آ رہا تھا۔ نام تو شاید اس کا HENNINGER TURM تھا یا کچھ اور تھا، کیونکہ جرمن زبان خاصی مشکل لگی۔ خالدہ تو خوب دکانداروں سے جرمنی میں بحث مباحثہ کرتی۔ مگر میں بس منہ دیکھتی رہ جاتی۔ کچھ پلے نہیں پڑتا تھا۔ فرینکفرٹ ٹاور کے اوپر گھومنے والا ریسٹورنٹ تھا۔ اب یہ طے پایا کہ اس پر بیٹھ کر فرینکفرٹ کا نظارہ کیا جاتے اور ناؤ نوش کا دور بھی چلے۔ وہاں پہنچے تو وہ ٹاور بند تھا۔ ارد گرد گھوم کر اسے دیکھا، مگر فرینکفرٹ کا ہوائی نظارہ اپنی قسمت میں نہ تھا، اس لئے وہاں سے واپس ہوئے اور شہر کی سڑکوں پر گھومتے رہے۔ دن تھا کہ ختم ہونے کو نہیں آ رہا تھا۔ بارے خدا خدا کر کے شام ہوئی۔ گھر واپس آتے۔ کھانا کھایا اور بے سدھ ہو کر سو گئے۔ سلیم صاحب کو اکثر بے خوابی کی شکایت رہتی تھی۔ انہیں خواب آور گولی سے نیند آیا کرتی تھی۔ مگر میرا حال برعکس تھا۔

ہیں صورتِ گل دستِ صبا کا نہیں محتاج
کرتا ہے مرا جوشِ جنوں میری قبا چاک

Marfat.com

پنجم اگست ۱۹۸۳ء

آج صبح سے ہی موسم ابر آلود تھا، گرمی قدرے کم محسوس ہو رہی تھی۔ خالدہ گھر کے کام کاج میں مصروف تھی۔ ہم دونوں نے ناشتہ کیا اور خالدہ سے ٹیوب ٹرین میں سفر کرنے کے طریقے معلوم کئے۔ اس نے بڑی تفصیل سے او بان (انڈر گراؤنڈ ٹرین) اشٹل بان (تیز رفتار ٹرین) ٹرام اور بسوں میں سفر کرنے کا طریقہ سمجھایا۔ گھر کا پتہ لکھ کر دیا اور ان ٹراموں کے نمبر بھی لکھوائے جو ان کے گھر واقع روڈ لہم کی طرف آتی تھیں۔ گھر اور دکان کے ٹیلی فون نمبر دیئے۔ غرضیکہ سپاہیوں کی طرح جو میدانِ جنگ کو جاتے ہیں، پوری تیاریوں سے لیس ہو کر شہر کے اندر گھومنے پھرنے چل پڑے۔ پہلے تو روڈ لہم کے سٹیشن پر گئے اور انڈر گراؤنڈ ٹرین کے ذریعے شہر میں جا نکلے۔ اب ایک نامعلوم سڑک پر کھڑے تھے۔ نزدیک ہی ٹرام کا اسٹاپ نظر آیا۔ اس پہ پہنچے تو ٹرام کے اسٹاپ کا پورا نقشہ بنا ہوا تھا کہ کس طرف کو کون سے نمبر کی ٹرام جاتی اور کس کس وقت روانہ ہوتی ہے۔ حیران تھے کہ اب ٹکٹ کس سے لیں کہ اتنے میں ایک اسمارٹ سی خوبصورت لڑکی ایک ٹرام سے اتری۔ ہمیں دیکھ کر مسکراتی ہوئی ہمارے پاس آ گئی۔ کہنے لگی: "آپ پاکستانی ہیں؟" ہم نے کہا: "آمنا صدقنا"۔ کہنے لگی کہ سیر کے لئے آتے ہیں۔ ہم نے کہا: "یہ بھی ٹھیک ہے"۔ پوچھا کہ پھر کھڑے کیوں ہو۔ ہم نے کہا کہ پتہ نہیں چلتا کہ کدھر جائیں۔ کہنے لگی "اگر صرف سیر کرنا مقصود ہے تو بس HIN AND ZURCK (آنے جانے کا ٹکٹ) لے لیں اور ٹرام میں بیٹھ جائیں۔ یہ چلتی رہے گی اور آپ مناظر

Marfat.com

دیکھتے رہیئے گا۔ آخری اسٹاپ سے پھر دوسری ٹرام لے لیں۔ یہ ٹکٹ شام کے ۷ بجے تک کارآمد ہوگا۔ اس وقت آپ جہاں چاہیں گھومیں پھریں۔"

ہم نے اپنے اس حسین گائیڈ کا شکریہ ادا کیا جو فیصل آباد کی رہنے والی تھی۔ پھر اسٹاپ کے ساتھ ایک پول پر لگی ہوئی مشین کے سامنے جا کھڑے ہوتے۔ اس پر ٹکٹ HIN AND ZURCK پر انگلی رکھی۔ پھر دو آدمیوں پر یعنی دو ٹکٹ چاہئیں۔ مشین نے فوراً بتایا کہ ہر شخص کا ۷ مارک کا ٹکٹ ہوگا۔ ہم نے مشین کے منہ میں ۱۴ مارک ڈالے۔ اس نے کھٹ سے دو ٹکٹ نکال دیتے۔ بس پھر کیا تھا۔ ایک ٹرام پر چڑھے۔ پھر اس سے اتر کر دوسری پر سوار ہوتے۔ شہر کو دیکھتے پھر رہے ہیں۔ درمیان میں کوئی خوبصورت مارکیٹ دکھائی دیتی تو وہاں اتر جاتے۔ واپسی پر اوبان کے لئے اسٹیشن کے نزدیک آتے تو ایک بڑی سی مارکیٹ نظر پڑی۔ جہاں بڑے بڑے اسٹور تھے۔ ایک انڈر گراؤنڈ مارکیٹ KOUF HOF سے اپنے کھانے کے لئے کھاجا خریدا۔ شیشے کی ایک خوبصورت پلیٹ لی۔

اب باتھ روم جانے کا مسئلہ تھا۔ مگر جس سے انگریزی میں بات کریں، کندھے اچکا کر آگے روانہ ہو جاتے۔ سخت جسمانی مصیبت اور ذہنی کوفت۔ اتنے میں ایک صاحب پر نظر پڑی۔ سوٹڈ بوٹڈ تھے، مگر چال ڈھال سے اپنی طرف کے دکھائی دیتے تھے۔ بھاگ کر اُن کے پاس پہنچے۔ پتہ چلا کہ جالندھر کے ہندو ہیں۔ اپنی پرابلم بتائی۔ وہ تھوڑے سے فاصلے پر لے گئے جہاں عوامی لیٹرین تھیں۔ اُن کا شکریہ ادا کیا اور اپنی الجھن حل کی۔

جرمنوں کی اس عادت سے بڑی تکلیف ہوتی تھی کہ انگریزی بولنے

Marfat.com

والوں سے خاصی رکھاتی کا برتاؤ کرتے تھے۔ خالدہ جرمن زبان جانتی تھی۔ اس سے بڑی خوش اخلاقی سے بات کرتے تھے۔ ہمیں تو ان کی گنتی بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ جتنی رقم مانگتے کچھ مارک نکال کر ہتھیلی پر رکھ دیتے تھے۔ وہ اس میں سے اپنی چیز کی قیمت لے لیتے تھے۔ بقایا رقم دے دیتے تھے۔ اگرچہ جرمن زبان میں بھی کچھ الفاظ انگریزی زبان سے ملتے جلتے ہیں، مگر اکثریت غیر مانوس سی لگتی تھی۔ بہرحال میرا خیال ہے کہ اگر میں ایک آدھ مہینہ ٹھہرتی تو ان کی زبان سیکھ لیتی کیونکہ ایک دن کے سفر میں ہی خاصا تجربہ ہو گیا تھا۔

دوپہر کو گھر واپس آکر سو گئے۔ شام کو خالدہ کہنے لگی " باجی! مجھے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔ اگر آپ بازار جانا چاہیں تو چلیں"۔ ہمارے سفر کا مقصد چونکہ پھرنے پھرانے کے علاوہ کچھ نہ تھا، اس لئے کمر باندھے ہوئے چلنے کو پھر تیار بیٹھے ہیں کے مطابق فوراً اٹھ کھڑے ہوتے۔ بازار میں خوب رونق چہل پہل تھی۔ سلیم اکثر ہم سے علیحدہ ہو کر اِدھر اُدھر کی دکانوں میں تاک جھانک کر رہے تھے۔ خریدنا تو انہیں کبھی بھی کچھ نہیں ہوتا، نہ پاکستان میں نہ باہر، البتہ جائزہ ہی لیتے رہتے ہیں۔ مجھے یہ خدشہ تھا کہ ایسے بھرے پُرے بازار میں اگر یہ گم ہو گئے تو ملیں گے کیسے کیونکہ سلیم صاحب نہ ہی کوئی ایڈریس پاس رکھتے تھے، نہ فون نمبر۔ سبھی کچھ اس ناچیز پر تقصیر کے حوالے کیا ہوا تھا۔ مجھے اپنے ساتھ لانے کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہے تھے اور سبھی فرائض سونپ کر چین کی بانسری بجاتے تھے۔ میں نے خالدہ کی بچی سے کہا کہ اپنے انکل پر نظر رکھنا۔ نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینا۔

Marfat.com

خالدہ کی بچی بڑی ذہین اور ہوشیار تھی۔ اگرچہ چھ سات سال کی ہو گی، مگر اتنی سمجھ داری سے بات کرتی تھی کہ حیرت ہوتی تھی۔ جونہی سلیم ادھر اُدھر ہونے لگتے، فوراً ہمیں خبردار کر دیتی۔ پھر میں اور خالدہ ان کے پیچھے وہیں پہنچ جاتے۔ واپسی پر کہنے لگی: "آنٹی! انکل نے تو پوری کوشش کی ہے کہ گم ہو جائیں۔ مگر میں نے گم نہیں ہونے دیا۔" جس پر ہم بڑے محظوظ ہوتے۔

شام ۷ بجے سبھی بازار بند ہو جاتے ہیں۔ صرف چھوٹے چھوٹے سڑک کے کنارے بنے ہوتے کیفے اور ہوٹل کھلے رہتے ہیں۔ بھاگم بھاگ شاپنگ کی، پھر سڑک کے کنارے بنے ہوئے ایک کیفے میں بیٹھ کر آئس کریم کھائی۔ اب ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ لوگوں نے بوندوں سے بچنے کے لئے دکانوں کے چھجوں کے نیچے پناہ لینی شروع کر دی۔ کیفے کے بیرے اور نوکر کرسیاں اٹھا کر اندر رکھ رہے تھے۔ میزوں پر سے کپڑے اتار کر لے جا رہے تھے۔ چند منٹوں کے اندر گہما گہمی میں بے حد کمی آ گئی۔ بارش رکی تو پھر ہاؤ ہو اور نا ؤ و نوش کا سلسلہ چل نکلا۔ بازار سے اکٹھے واپسی ہوئی۔ گھر پہنچے تو اصغر صاحب بھی دکان بند کر کے آ گئے تھے۔ رات گئے تک گپ شپ کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ غیر ملک میں رہنے والے پاکستانیوں کا دکھڑا لے بیٹھے کہ ہم واپس اپنے وطن جانا چاہتے ہیں مگر یہ لمبی چوڑی تنخواہیں، پھیلے ہوتے کاروبار اور بے انتہا سہولتیں۔ ع

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است

کے مصداق دامن تھام لیتی ہیں۔ جان پاکستان میں ہے تو جسم انگلستان، جرمنی یا امریکہ میں ہے۔ اگرچہ سبھی لوگ بڑے معیار سے

Marfat.com

رہتے ہیں مگر سب غیر مطمئن ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ پاکستان جائیں، مگر اس صورت میں کہ یہی تنخواہیں ہوں، یہی سہولتیں ہوں، یہی زندگی کی گہما گہمی ہو بھلا چپیڑی اور دودو کیسے نصیب ہوں۔ یہ تو چند گنے چنے قسمت والے خاندان ہیں جو پاکستان میں بھی غیر ملک جیسی آسائشوں اور آرائشوں سے استفادہ حاصل کر رہے ہیں۔ بہر حال، وہ بھی یہی کہنے لگے کہ پاکستان آنا چاہتا ہوں۔ اسلام آباد میں رہائش رکھنا چاہتا ہوں۔ آپ کوئی مدد کیجیے گا۔ رات کو کھانا کھانے بیٹھے تو سلیم صاحب دسترخوان سے جلد اٹھ گئے۔ ممکن ہے بھوک کم ہو، کیونکہ دن کو باہر الا بلا کھاتے رہے تھے۔ بہرحال، یہ فارغ ہو کر ہاتھ دھونے چل پڑے۔ ہم باتیں کر رہے تھے کہ اچانک مجھے احساس ہوا کہ سلیم صاحب موجود نہیں۔ اب مجھے فکر ہوئی کہ سلیم کہیں سیر کے لئے نہ نکل پڑے ہوں۔ ایسی صورت میں دن کو بھی گھر ڈھونڈنا مشکل ہے۔ اب تو سیاہ رات آچکی تھی۔ پھر جرمنی میں تو قطار اندر قطار ایک جیسی بڑی بڑی عمارتیں ہیں۔ ان میں فلیٹس ہیں جہاں لوگ رہتے ہیں میں نے خالدہ اور اصغر کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے اٹھ کر گھر سے باہر نکلی اور اتنے اعتماد سے کہ ڈائری بھی ساتھ نہ لی۔ ہم دونوں کے نکلنے کے بعد ان میاں بیوی کو احساس ہوا کہ یہ دونوں غائب ہیں تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔ اصغر صاحب ہم دونوں کو ڈھونڈنے نکلے۔ اب ہم تینوں روڈلہم کی سڑکوں پر ایک دوسرے کو ڈھونڈ رہے تھے۔ پاکستان میں کسی عمارت کی نشانی رکھنا بڑا آسان ہے کسی عمارت کے نزدیک مسجد ہے۔ کسی کے نزدیک کوئی دفتر تو کہیں

Marfat.com

کچی کوٹھریاں ہیں اور کہیں کچرا گھر، یعنی متنوع قسم کی عمارتیں ہیں۔ بڑی بڑی عالیشان بلڈنگوں کے دامن میں تباہ حال کوارٹر بھی نظر آجاتے ہیں۔ مگر وہاں تو ہم شکل عمارتیں ایک جیسے قد اور بناوٹ کی ہوتی ہیں کہ نمبروں کے بغیر یاد رکھنا ناممکنات میں سے ہے۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اصغر صاحب کو سلیم صاحب تو مل گئے اور میں نہ صرف خود راستہ بھول گئی بلکہ ان دونوں کو بھی کافی چکر لگوا دیئے۔ بہرحال کچھ دیر کے بعد ایک سنسان اندھیری سڑک پر سامنے سے یہ دونوں آتے دکھائی دیئے اور یوں ہم دونوں بدھومع میزبان کے گھر کو لوٹ آئے۔ اگر اصغر صاحب نہ آتے تو ہمارا یہ حال ہوتا۔ع

بھٹکتے پھرتے ہیں دشتِ جنوں میں مثلِ غبار

اور گھر پھر بھی نہ پہنچ سکتے کیونکہ دونوں کے پاس نہ ایڈریس تھا اور نہ فون نمبر۔

۲ر اگست ۱۹۸۳ء

آج ہمیں دوپہر دو بجے کی فلائٹ سے جرمنی سے انگلینڈ پرواز کرنا تھا، اس لئے صبح اٹھ کر یونہی سیر سپاٹے کے لئے روڈلہم کے بازار میں نکل پڑے۔ سلیم صاحب نے ایک چھوٹے سے کیفے میں سینک کھانے کا ارادہ کیا۔ اندر گئے تو ایک بھاری جسم جثے کی مالک ادھیڑ عمر عورت آرڈر سرو کر رہی تھی۔ ہم نے اس ڈر سے کہ یہ لوگ انگریزی زبان تو سمجھتے نہیں، جانے کیا مانگیں اور کیا کھلادیں، آئس کریم ہی منگوا لی۔ سلیم صاحب کو پیاس لگی ہوئی تھی۔ اب اسی عورت کو بلایا، پانی مانگا مگر اس نے کندھے

Marfat.com

اچکاتے کہ سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر PLAIN WATER کبھی MINERAL WATER کہا، مگر اس نے نہ سمجھنے کی قسم کھائی ہوئی تھی۔ تنگ آکر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی کہ شاید کسی طرف سے مدد مل جائے۔ ساری جرمن عورتیں اور سارے جرمن مرد خوش گپیوں میں مصروف نظر آتے۔ ایک میز پر ایک گلاس میں پانی پڑا ہوا دیکھا تو اس کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ چاہیئے۔ وہ گئی اور گلاس بھر کرلے آئی۔ سلیم صاحب نے منہ لگایا تو عجیب قسم کا مزا پایا۔ کہنے لگے کہ یہ کیسا پانی ہے، تم چکھو۔ میں نے کہا "مجھے تو معاف ہی رکھیں۔ خود ہی نوش فرمائیں۔"

چکر لگاتے لگاتے ایک سڑک سے گزر ہوا۔ وہاں دو تین پاکستانی لڑکے کھیل رہے تھے۔ پوچھا "آپ لوگ کہاں کے رہنے والے ہیں؟" کہنے لگے کہ انگلینڈ کے۔ سبحان جناب! ہمارا خیال تھا کہ پاکستان کے کسی شہر کا نام لیں گے، مگر اس نئی نسل کو پاکستانی شہروں کا کیا پتہ۔ پوچھا "یہاں کیسے آتے ہو؟" کہنے لگے "خالہ کے پاس چھٹیاں گزارنے آئے ہیں۔" اور سنیں، بیرون ملک پاکستانی بیرون ملک پاکستانیوں کے پاس چھٹیاں گزارنے جاتے ہیں۔ ایک ہم لوگ ہیں کہ اپنے ملک میں ایک شہر سے دوسرے شہر جانا بھی کارے دارد ہے۔

ہم جرمنی کے قیام کے دو دنوں میں کوشش کرتے رہے کہ انگلینڈ کشور (سلیم صاحب کی بہن) کو اطلاع دے دیں کہ ہم لوگ پاکستان سے کشور کشور گھومتے بنجاروں کی طرح چل پڑے ہیں۔ مگر اس کا فون نہ مل سکا۔ بہرحال، انگلینڈ میں بھی ہماری قسمت میں بغیر اطلاع کے وارد ہونا

Marfat.com

لکھا تھا۔ بارہ بجے اصغر صاحب کے ہمراہ ایئرپورٹ روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچنے پر انہوں نے گم شدہ چیزوں کے مرکز پر ہمارے بریف کیس کا پتہ کیا۔ مگر جناب جو اٹھا کر لے گئے تھے وہ اب واپس کرنے کیوں آنے لگے۔

بریف کیس پر فاتحہ پڑھی اور چیکنگ کے مراحل سے گزرتے ہوئے لاؤنج میں جا بیٹھے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے مجھے غنودگی سی آگئی تو خواب میں دیکھا کہ جہاز کو آگ لگ گئی ہے۔ سلیم صاحب سے ذکر کیا تو کہنے لگے۔ تمہارے وہم تمہیں تنگ کر رہے ہیں۔ کیونکہ جہاز اپنے مقررہ وقت سے لیٹ ہو رہا تھا اور چیکنگ ہو رہی ہے، اس لئے تمہیں ایسا خیال آیا ہے۔ بہرحال پین امریکن کی فلائیٹ تیار ہوئی۔ ہمارے ہمراہ نیویارک اور لاس انجلز جانے والے مسافر بھی سوار ہوئے کیونکہ اس جہاز کو لندن ہیتھرو ایئرپورٹ پر صرف دو گھنٹے رکنا تھا اور ہم دونوں کے علاوہ چند ایک اور کو اتار کر بحر اوقیانوس پر لمبی پرواز کے لئے روانہ ہو جانا تھا۔ ہم نے جرمنی کو الوداع کہا اور اپنے سابقہ آقاؤں کے دیس کو چل پڑے تاکہ دیکھیں کہ وہ ہم سے کیا سلوک کرتے ہیں۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

سابقہ آقاؤں کے دیس میں

لندن کو دیکھنے کا اشتیاق بچپن سے تھا کیونکہ بھائی اختر مرحوم کافی عرصہ یہاں بھی مقیم رہے تھے۔ چنانچہ ڈیڑھ دو گھنٹے کے سفر کے بعد جہاز جب ہیتھرو ایئرپورٹ پر اترنے لگا تو دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ یہی دل چاہتا تھا کہ فوراً نکلوں اور اس سرزمین کو دیکھوں۔ مگر یہ کیا؟ ایئرپورٹ پر چکر لگاتے ہوئے کپتان نے اعلان کیا کہ جہاز کے دائیں ونگ سے دھواں نکل رہا ہے۔ شاید کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ سبھی مسافروں سے استدعا ہے کہ خاموشی سے اپنی سیٹوں پر بیٹھے رہیں۔ ہیتھرو فائر سروس والے پہلے چیک کریں گے، پھر دروازے کھولے جائیں گے۔ یک لخت سارے جہاز میں خاموشی پھیل گئی۔ میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ سارے مسافر پرسکون انداز میں اپنی اپنی سیٹوں پر یوں براجمان تھے جیسے تقسیم انعامات کا جلسہ ہے اور انہیں اپنے نام کے پکارے جانے کا انتظار ہے۔ سلیم صاحب پریشان ہو گئے، کہنے لگے: "ہمیں تو اتار دیں، بعد میں چیک کرتے رہیں۔ ہمیں کیوں بند کیا ہوا ہے" مجھے خود اختلاجِ قلب کی شکایت ہونے لگی۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو پیلی پیلی تین چار گاڑیاں جہاز کی طرف دوڑتی نظر آئیں۔

Marfat.com

پندرہ بیس منٹ سخت پریشانی میں گزرے۔ پھر اعلان ہوا کہ سب مسافر باہر نکل سکتے ہیں۔ وہ مسافر تو بے حد خوش ہوئے جنہیں نیویارک اور لاس اینجلز جانا تھا۔ انہوں نے جوش میں آکر تالیاں بجائیں۔ پھر سامان اٹھا کے بھی باہر کے دروازوں کی طرف لپکے۔ امیگریشن ہال میں ہمارے پہنچتے پہنچتے دس پندرہ گز لمبی لائن لگ چکی تھی۔ یقیناً یہ لوگ کسی اور جہاز سے آئے ہوں گے۔ میں تو اپنی قسمت پر شاکر، لائن کے آخر میں جا کھڑی ہوئی۔ مگر سلیم صاحب سدا کے پارے کی طرح بے قرار، لائن کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سب سے آگے جا کھڑے ہوئے۔ پھر پیچھے مڑ کر مجھے بھی اشارا کیا کہ تم بھی آجاؤ۔ میں جب تک لائن کے سرے پر پہنچی، یہ امیگریشن آفیسر کے پاس کھڑے کاغذات دکھا رہے تھے۔ میں جب اسی آفیسر کے پاس جانے لگی تو مسافروں نے شور مچا دیا "پیچھے سے آگے مت آئیں" میں نے لائن کے سرے پہ کھڑی عورت سے کہا کہ مجھے جانے دیں۔ میرا خاوند آگے جا چکا ہے۔ ادھر امیگریشن آفیسر نے بھی اشارہ کیا کہ مجھے بھیج دیں۔ یوں ہم دونوں امیگریشن سے فوراً فارغ ہو گئے۔ اصل میں سلیم کے متعلق تو مسافروں نے سمجھا کہ شاید ایئرپورٹ کے عملے کا شخص ہے جو یوں بے دھڑک لائن پھلانگ کر جا رہا ہے۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی شخص یوں قطار بندی کی خلاف ورزی کر سکتا ہے۔ مگر جب میں گئی تو ان کو پتہ چل گیا کہ یہ مسافر ہیں۔ آئندہ کے لئے خود توبہ کی اور سلیم سے توبہ کروائی۔ ان ممالک میں تو ہر جگہ فوراً لائن بن جاتی ہے اور گھنٹوں کا کام منٹوں میں ترتیب اور انتظام سے ہو جاتا ہے۔ اب

Marfat.com

توہمارے ملک میں بھی شہری باشعور ہو گئے ہیں۔ مگر پھر بھی کبھی کبھار دھاندلی اور افراتفری نظر آ ہی جاتی ہے۔

امیگریشن سے فارغ ہو کر سامان لینے چلے تو ہندوستانی عورتیں ہال میں صفائی کرتی نظر آئیں۔ برقی بیلٹ پر ہمارا اکلوتا اٹیچی کیس دوسرے سامان کے ساتھ چکر پر چکر لگا رہا تھا۔ لپک کر پکڑا۔ اسلیم ایک ٹرالی لے آئے۔ اس پر لادا اور باہر کی طرف چل پڑے۔ باہر نکلے تو لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ کچھ لوگ کارڈ بورڈ اٹھائے ہوئے تھے۔ ان پر مختلف جگہوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ شاید وہ لوگ اس طرف جانے والوں کو تلاش کر رہے تھے۔ کچھ لوگ اپنے رشتہ داروں کو دیکھ کر خوشی سے شور مچا رہے تھے۔ بہرحال ان لوگوں میں ہمارا کوئی نہ تھا کیونکہ کسی کو اطلاع نہ تھی۔ سڑک کے کنارے آئے تو ہوا میں تیرتی ایک کالے رنگ کی ٹیکسی آن کھڑی ہوئی۔ باوردی ڈرائیور باہر نکلا۔ ہم سے ہماری منزلِ مقصود پوچھی۔ ہم متذبذب تھے۔ میری نند کشور کہتی رہتی تھی کہ ہم لوگ ایئرپورٹ کے نزدیک SLOUGH میں رہتے ہیں، مگر جو ایڈریس ہمارے پاس تھا اس میں HIGH WYCOMBE درج تھا۔ اب کیا بتائیں کیا نہ بتائیں۔ ہائی وکیمب کا کرایہ ۴۵ پونڈ اور SLOUGH کا کرایہ ۳۲ پونڈ تھا جس کا مطلب تھا کہ پہلے سلو آئے گا۔ بعد میں ہائی وکیمب چلیے، سلو ہی چلتے ہیں۔ ٹیکسی میں بیٹھے اور چل پڑے۔ لندن نے ہمیں کچھ خاص متاثر نہ کیا تھا، بلکہ جرمنی کے مقابلے میں دبا دبا سا لگ رہا تھا۔ نہ ایئرپورٹ اچھا لگا نہ رستے۔ ہم چراغوں سے جگمگاتے جدہ ایئرپورٹ سے ہو کر آئے تھے۔ فرینکفرٹ کے دو منزلہ رونقوں سے بھرپور ہوائی اڈے اور پھولوں

Marfat.com

سے لدے ہوئے شہر بے مثال سے آتے تھے۔ لندن بس یونہی سا لگا۔ اتنے میں RUTLAND AVENUE آ گئی۔ اس ایونیو میں کشور کا مکان تھا۔ ہم اتر پڑے کہ بس منزل آ گئی ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور کرایہ لے کر چلا گیا مگر جناب اُن کے مکان کا نمبر نہ مل رہا تھا۔ پاس ہی ایک اسٹور تھا۔ اس میں گئے تو ایک سکھ عورت تھی۔ وہی اسٹور کی مالک تھی۔ اسے اپنی پرابلم بتائی۔ اس نے ایڈرس لیا اور کہا کہ وہ لوگ تو ہائی ویکمب میں رہتے ہیں۔ ہمیں کہنے لگی کہ "آپ اطمینان سے بیٹھیں۔ میں ٹیلی فون پر ان کو اطلاع دیتی ہوں۔" اطلاع ہو گئی تو ہم بھی مطمئن ہو کر کوک پینے لگے۔ ہلکی پھلکی گفتگو شروع ہوتی۔

ان دنوں پنجاب میں سکھوں کے نئے نئے جھگڑے شروع ہوئے تھے۔ وہ سکھنی بھی بڑی مایوس تھی۔ کہنے لگی "ہمارا تو بالکل واپس جانے کو دل نہیں کرتا۔ ہندوستان ہندوؤں کا ہے، پاکستان مسلمانوں کا ہے، ہمارا تو کوئی ملک نہیں۔ ہمارے بچوں نے تو ہندوستان ایک دفعہ بھی نہیں دیکھا۔ اب تو جینا مرنا یہیں پر ہے۔" ہم نے جہاں اپنے پاکستانیوں کو غیر ممالک میں غیر مطمئن دیکھا، وہاں سکھوں کو مطمئن دیکھ کر حیرت ہوتی۔ اتنے میں امجد (سلیم صاحب کے بہنوئی) آن پہنچے اور خوشی سے بغل گیر ہو گئے۔ گلہ کیا، مسرت آمیز ناراضگی کا اظہار کیا۔ مجھ سے سلام دعا ہوئی اور گھر کے لئے چل پڑے۔ راستے میں انہوں نے بتایا کہ کشور تو فون ملتے ہی نقشہ نکال کر بیٹھ گئی کہ تم لوگ کس جگہ پر ہو گے۔ گھر پہنچے تو کشور حیرت اور خوشی کے ملے جلے احساسات کے ساتھ ملی۔ فوراً فون کر کے تمام رشتہ داروں کو بتایا کہ دونوں

Marfat.com

بالآخر آن پہنچے۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ سب خوش ہونے کے ساتھ ساتھ حیران تھے کیونکہ ہم ہر سال پروگرام بناتے تھے کہ اس دفعہ آئیں گے مگر گھریلو مصروفیتیں اور سرکاری مجبوریاں آڑے آ جاتی تھیں اور سال گزر جاتا تھا۔ اب جو سعادت نے آپریشن کا لکھا تو "آناً فاناً" پروگرام بن گیا۔ چونکہ سلیم صاحب الیف آئی اے میں پوسٹڈ تھے، تھکانے والے کا چارج نہ تھا، اس لیے فوراً چھٹی مل گئی۔ آج مجھے سخت تھکاوٹ تھی اس لیے میں تو سو گئی، مگر سلیم صاحب اپنی بہن کے ساتھ گپ شپ لگاتے رہے۔

جیب میں نہیں دھیلا دیکھنے چلے ہیں میلہ

۴۔ اگست ۱۹۸۳ء

آج میری بھی نیند صبح سویرے کھل گئی اور سلیم تو ہوتے سدا کے سحر خیز۔ میں نے کچن میں جا کر چائے بنائی۔ پی کر بیٹھے مگر گھر والے ابھی تک سو رہے تھے۔ اب کیا کریں؟ چلیں لندن کی صبح دیکھیں۔ پروگرام بنا تو فوراً دونوں باہر نکلے۔ سڑکوں پر ٹریفک برائے نام تھی۔ اومنی بسیں چلنا شروع ہو گئی تھیں۔ ایک بس اسٹاپ پر جا کھڑے ہوتے۔ بس آئی، ٹکٹ لیا اور آخری اسٹاپ کا لیا۔ راستے میں سڑک کے کنارے چھوٹے چھوٹے گڑیا گھر نظر آتے۔ کئی گھروں پر "برائے فروخت" اور "برائے کرایہ" کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ سلیم دیکھیں اور کہیں کہ ہائے یہ کتنا خوبصورت ہے۔ کاش ہم اسے خرید سکتے۔ مجھے ہنسی آئی کہ خواہش تو اس بڑھیا جیسی ہے

Marfat.com

جو سوت کی انٹی کے عوض حضرت یوسف علیہ السلام کو خریدنے آئی تھی۔
بھلا لندن کے مکان اور ہم نادار لوگ ع

تو کجا و من کجا ساز سخن بہانہ است

والا معاملہ تھا۔ گھروں کے علاوہ تھوڑے فاصلہ پر بار بھی بنے ہوتے تھے۔ لوگ کم ہی چلتے پھرتے نظر آتے۔ ورنہ اپنے پاکستان میں تو صبح کے وقت سے ہی نمازیوں کی چہل پہل شروع ہو جاتی ہے ہاں دودھ تقسیم کرنے والی گاڑیاں تھیں بعض میں تو ڈرائیور کی مدد کے لئے چھوٹا سا لڑکا تھا جو خالی بوتلیں اکٹھی ہے آتا اور دودھ سے بھری بوتلیں رکھ دیتا۔ بعض گاڑیوں میں ڈرائیور خود ہی یہ کام کرتا۔ آخری بس اسٹاپ پر گاڑی آدھ گھنٹہ کھڑی رہی۔ ہم دونوں فرنٹ سیٹ پر بیٹھے رہے۔ پھر واپسی کا سفر شروع ہوا۔ اب کافی چہل پہل تھی۔ گھر پہنچے تو کشور پریشان اور ہراساں کہ تم لوگ کہاں چلے گئے تھے؟ ناشتہ کیا تو امجد کہنے لگا۔ آج آپ کو ونڈسر کاسل دکھاتے ہیں۔ کشور کہنے لگی تم جاؤ میں نے کاسل بارہا دیکھا ہے۔ اس لئے ہم بچوں کے ہمراہ چل پڑے۔

ونڈسر کاسل ؎

یہ دنیا کی قدیم ترین شاہی رہائش گاہوں میں سے ایک ہے۔ پرانے زمانے کا ایک مضبوط قلعہ سمجھئے جو دریائے ٹیمز کے دائیں کنارے

؎ ونٹر ریزیڈنس آف رائل فیملی WINTER RESIDENCE OF ROYAL FAMILY

Marfat.com

پر بنا ہوا ہے۔ یہ بارہویں صدی میں تعمیر ہوا تھا۔ پھر جو بھی بادشاہ بنا وہ اس میں اضافہ کرتا رہا۔ ہر ایک کی اپنی پسند ہوتی ہے موجودہ ملکہ الزبتھ کے والد جارج ششم نارفوک میں واقع سنڈرنگھم پیلس کو پسند کرتے تھے۔ کوئین وکٹوریا بالمورل پیلس میں رہنا پسند کرتی تھیں جو اسکاٹ لینڈ میں واقع پریوں کا محل لگتا ہے۔ حالانکہ ملکہ وکٹوریا کو اپنا محبوب البرٹ ونڈسر میں ہی ملا تھا۔ لیکن موجودہ ملکہ الزبتھ نے اپنی بہن مارگریٹ کے ہمراہ اپنا بچپن اور اپنی جوانی اسی محل میں گزاری، اس لئے اس کی خواہش اسی محل کو اپنا گھر بنانے کی تھی۔ مگر پبلک لائف کے خیال سے یہ خواہش مسترد کرنی پڑی۔ پھر بھی وہ اپنا ویک اینڈ یہیں گزارتی ہے۔ ونڈسر کاسل میں ملکہ کی موجودگی کا اعلان گول ٹاور پر جھنڈا لہرا کر کیا جاتا ہے۔ سیاحوں کے لئے اگلا حصہ ہمیشہ کھلا رکھا جاتا ہے۔ لوگ اِدھر اُدھر جھانکتے پھرتے ہیں کہ شاید انہیں ملکہ کی ایک جھلک نظر آجائے۔ ویسے یہ محل ملکہ کی سردیوں کی رہائش گاہ کے طور پر مشہور ہے۔ یہ ہیتھرو ایئرپورٹ سے زیادہ دور بھی نہیں، اس لئے غیر ملکی سربراہانِ مملکت کے لئے آرام ہے کہ وہ فوری یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ مگر یہاں کے مکینوں کے لئے یہ ضرور ہے کہ جہازوں کا شور بے پناہ ہوتا ہے۔ ونڈسر پیلس کا بکھنگم پیلس سے ۲۲ میل کا فاصلہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان ہیتھرو ایئرپورٹ واقع ہے۔ اسی سے ساری صورتحال واضح ہو جاتی ہے۔

جب ہم گیٹ سے داخل ہوتے تو اس کے اوپر تین بڑے بڑے سوراخ بنے ہوتے دیکھے۔ پتہ چلا کہ وہ دشمنوں پر گرم تیل یا پگھلا ہوا سیسہ

Marfat.com

ڈالنے کے کام آتے تھے۔ اندر ایک وسیع صحن تھا جہاں سردیوں میں گارڈز کی تبدیلی کی رسم ہوتی ہے۔ ہم چونکہ گرمیوں میں گئے تھے اس لئے اس نظارے سے محروم رہے۔ پھر بائیں ہاتھ پر چھوٹے چھوٹے گھر بنے تھے جو محل کے عملہ کے لئے مخصوص تھے۔ اس سے آگے کرفیو ٹاور تھا جس کے اندر زمین دوز راستہ تھا جس سے حملہ ہونے کی صورت میں خفیہ طور پر باہر نکلا جا سکتا تھا۔ اصل میں ونڈسر کاسل کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ تماشائیوں اور سیاحوں کے لئے مخصوص ہے۔ اسے LOWER WARD کہتے ہیں۔ دوسرا حصہ MIDDLE WARD کہلاتا ہے۔ تیسرا حصہ UPPER WARD ہے جو شاہی خاندان کی ذاتی رہائش کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور پبلک سے بالکل علیحدہ ہے۔ ونڈسر کاسل میں ملکہ الزبتھ اپنے خاندان کے افراد کے ہمراہ کرسمس منانے آتی ہیں۔ ونڈسر کاسل کے باہر ایک شاپنگ سنٹر بھی ہے جس میں لیڈی ڈیانا و لیم اور شہزادہ چارلس کی تصویریں اور دیگر پوسٹ کارڈز بک رہے تھے۔ شہلا کے لئے یہ کارڈز خریدے کیونکہ گھر سے روانگی سے پہلے بچوں نے اپنی اپنی فرمائشیں لکھوائی تھیں۔ بڑی بیٹی شہیلہ نے VIEW CARDS، علی نے غیر ملکی ٹکٹ، اسد نے KEY RINGS، سکے اور مختلف ممالک کی ماچسیں اور عاصمہ نے خوبصورت پھول۔ مجھے جہاں جہاں بھی موقع ملا سبھی کی چیزیں خریدتی رہی۔ مگر پھول اس لئے نہ لئے کہ راستہ میں بار بار کی پیکنگ سے خراب ہو جائیں گے۔ سوچا تھا آخر میں ہانگ کانگ سے لوں گی اور یہی غلطی ہوئی اس کی چھوٹی خواہش حسب خواہش پوری نہ ہو سکی۔ کاسل سے پھر پھرا کر نکلے تو ٹانگوں کی اچھی خاصی ورزش ہو چکی تھی۔ گھر پہنچے تو

Marfat.com

اپنی پاکستانی برادری جمع تھی۔ خوب مہمان آتے ہوتے تھے۔ کافی باتیں ہوئیں۔ رات کا کھانا اکٹھے کھایا۔ کشور نے مہمانوں کے ساتھ مل کر برتن دھوتے وہاں یہ عجیب طریقہ دیکھا کہ جونہی لوگ کھانا کھانے سے فارغ ہوتے تھے، میزبان اور مہمان عورتیں مل کر برتن دھونے اور پونچھنے کے عمل میں مصروف ہو جاتی تھیں۔ الماریوں میں برتن سجا کر اور قہوہ یا چائے کا ایک ایک کپ پی کر اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتی تھیں۔ یہ طریقہ مجھے بڑا اچھا لگا جو وہاں کے ماحول کے مطابق ضروری بھی تھا کیونکہ وہاں نوکر کی سہولت نہیں ہوتی۔ پاکستانیوں کا آپس میں ملنا ملانا کافی ہوتا ہے، پھر ہم جیسے سیاح بھی وارد ہوتے رہتے ہیں۔ دعوتوں کا اہتمام بھی مشرقی مہمان نوازی کے مطابق ہوتا ہے جس کی وجہ سے برتنوں کا بے انتہا استعمال ہوتا ہے، کھانے بھی بڑے مزیدار پکائے جاتے ہیں۔ مصالحے صاف اور پاکیزہ، چیزیں عمدہ، گوشت اعلیٰ، چھیچھڑوں سے پاک، سبزیاں صاف ستھری، کٹی ہوئی ڈبوں میں بند مل جاتی ہیں۔ کھانا اچھا کیسے نہ ہو۔ اتنے لذیذ اور مرغن کھانے کھاتے ہوئے ہمیشہ یہ فکر ہی دامن گیر رہی کہ کہیں واپسی پر لوگ پہچاننے سے انکار نہ کر دیں۔ ہم نے وہاں موسمی اور بے موسمی سبھی قسم کی سبزیاں کھائیں۔ حلیم گوشت مرغی اور سبزیاں کھا کھا کر اتنے تنگ آ گئے کہ کشور سے بار بار منت کریں کہ آج دال پکا دو، مگر وہ بھی اپنی ہٹ کی پکی۔ کہنے لگی کہ جو کہو گے پکاؤں گی،

Marfat.com

مگر دال نہیں۔ ورنہ پاکستان جا کر کہو گے کہ لندن گئے تھے، دال کھا کر آئے۔" سلیم کو اپنے موٹاپے سے زیادہ میری فکر رہتی تھی۔ خود تو کھاتے رہتے مگر میں جونہی کھانا شروع کرتی، ایک ہی رٹ لگاتے: "بس کرو بس کرو۔" بچپن میں ہمارے سکول میں ایک ڈرامہ ہوا تھا۔ اس میں دو آدمیوں کی لڑائی دکھائی گئی تھی۔ ایک آدمی خاصا چالاک تھا اور ایک بیوقوف۔ چالاک آدمی بیوقوف سے کہتا تھا کہ تم ہمیشہ لڑائی شروع کروایا کرو اور میں ختم کروایا کروں گا۔ چنانچہ جب لڑائی شروع ہوتی تو چالاک آدمی تابڑ توڑ حملے کر کے بیوقوف کی خوب ٹھکائی کرتا۔ جب بیوقوف اسے مارنے لگتا تو وہ فوراً لڑائی ختم کروا دیتا۔ یہی حال سلیم کا تھا۔ خود پیٹ بھر کر کھا لیتے۔ میری باری آتی تو بس کرو بس کرو کی رٹ لگا دیتے۔ مگر جناب! ان سے کہیے یہ جو بس کرنے والے ہوتے تو آج یہ حشر نہ ہوتا۔ ہم دونوں کا معاملہ کچھ یوں ہے۔ ع

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

جلاوطنوں کا وطن[1]

۴ اگست ۱۹۸۳ء

آج پھر کل کی مانند ہم دونوں جاگ اٹھے جب کہ گھر والے دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کی آغوش میں پڑے ہیں۔ اب کیا کریں؟ چائے بنا لی اور پی لی۔ ذرا فراغت ملی تو بچوں کی یاد آئی اور بے اختیار آئی۔ پاکستان فون ملانے کی کوشش کی، بڑی مشکل کے بعد کال ملی۔ امی سے بات ہوئی۔

---

[1] لندن

Marfat.com

پتہ چلا کہ سب بچے اوپر کھیل رہے ہیں. یہاں صبح کا اجالا مدھم سا تھا وہاں بھری دوپہر تھی. شہنیلہ، علی، اسد اور عاصمہ سے بات ہوتی. عاصمہ کی شاید اسی وقت کسی سے لڑائی ہوئی تھی۔ وہ ہوں ہاں میں جواب دے رہی تھی۔ شہنیلہ بار بار کہے "امی پروگرام چھوٹا کریں"۔ مگر علی اور اسد بڑے حوصلے سے بات کر رہے تھے. علی کہنے لگا "امی آرام سے سیر کریں، ابھی کچھ دیکھیں. جو دل چاہتا ہے کریں ہم بالکل آرام سے ہیں"۔ میں نے کہا "شہنیلہ تو اداس ہے"۔ کہنے لگا "اس کا کیا ہے یہ اداس ہی رہتی ہے۔ آپ پروا نہ کریں"۔ لیجئے، امی سے اندازہ لگایئے، شہنیلہ بڑی ہے، علی اس سے چھوٹا. مگر لڑکے شروع سے ہی بہادر، دلیر، حوصلہ مند اور مضبوط دل کے مالک ہوتے ہیں جب کہ لڑکیاں بیچاری گداز دل، نرم و نازک احساسات کی مالک. ادھر سلیم صاحب بڑے حوصلے سے بات کر رہے تھے جب کہ میرا رو رو کر برا حال تھا. یہی دل چاہتا تھا کہ ابھی واپس چلی جاؤں۔ بچوں کو گلے لگاؤں ع

ہم بہت روئے جب وہ یاد آیا

میری یہ حالت دیکھ کر سلیم تنگ آ گئے اور اکیلے ہی سیر کو نکل گئے۔ میں لیٹی سوچ رہی تھی کہ ابھی تو پاکستان سے نکلے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوتے ہیں مگر اداسی دل میں یوں جاگزیں ہے کہ ذہن کا ایک حصہ نئی نئی جگہیں دیکھتا ہے، دوسرا بچوں کے متعلق سوچتا رہتا ہے. مجھ سے تو بچوں کی پانچ چھ دن کی جدائی برداشت نہیں ہو رہی۔ جب یہ بڑے ہوں گے، اپنے گھر بار والے ہوں گے تو میرا کیا بنے گا. مگر خدا ہی صبر دینے والا ہے۔ ہمارے

Marfat.com

ماں باپ کی گذر گئی۔ ہماری بھی گزر جائے گی۔ ہمارے ماں باپ بھی ایسے ہی ہماری دید کے خواہاں ہوتے ہیں، بہانے بہانے سے بلاتے ہیں' عید سے کئی دن پہلے فون آنا شروع ہو جاتے ہیں کہ اس دفعہ ضرور آنا' ویسے ہی ہمارا حال ہوگا۔ اب تو ابا جی کی وفات کے بعد امی اور بھی زیادہ اصرار کرتی ہیں کہ میرے پاس آکر رہو۔ مگر گھریلو جھمیلوں میں کم ہی فرصت ملتی ہے۔ ایک دفعہ رفعت کے بچے یوسف کو دیکھ کر ابا جی نے بڑا خوبصورت شعر پڑھا تھا۔

ہم سانجھ سمے کی چھایا ہیں تم چڑھتی رات کے چندرما
ہم جاتے ہیں تم آتے ہو' پھر میل کی صورت کیونکر ہو؟

اس وقت تو سبھی ہنس پڑے کہ واہ ابا جی! آپ کی صحت اچھی خاصی ہے' ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ مگر ان کا فرمانا واقعی درست ثابت ہوا۔ یوسف ابھی سوا سال کا ہی ہوا تھا کہ ابا جی اگلی دنیا سدھار گئے۔ چھ ماہ کے اندر ہی جسم گھل گیا۔ اس وقت وہ ساری بھولی بسری باتیں یاد آرہی ہیں۔ اکیلی تڑپ تڑپ کر رو رہی ہوں ؎

کون اب دیس سے اشکوں کو گنے گا آکر
چشم پُرآب کو چلکے سے سمندر لکھ دے

جانے کتنی دیر گزر گئی۔ اب گھر میں ہل چل شروع ہو گئی رونے سے مجھے کچھ حوصلہ ہو گیا۔ سلیم صاحب واپس آگئے۔ سبھی نے مل کر ناشتہ کیا۔ اتنے میں سلیم صاحب کا بھانجا انجم کار لے کر آگیا کہ آج کا سارا دن آپ میرے نام لکھ دیں۔ آج میں آپ کو سیر کراؤں گا۔ پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ جانے کن کن سڑکوں پر گھومے۔ کن کن علاقوں میں سیر کی مقصد

Marfat.com

تو صحرا نوردی تھا منزل تھی نہیں. لندن کی شاہراہیں تھیں اور ہم تھے.
کار میں بیٹھے بیٹھے ہی لندن کا نظارہ کرتے رہتے سردار شوکت حیات خان
صاحب سے بھی ملاقات کے لئے CAVALARY CLUB
گئے. وہ کلب سے باہر آکر ملے کہ وہاں عورتوں کا داخلہ ممنوع ہے. یعنی دنیا
ایک جگہ ایسی موجود ہے جہاں بی حوا نہیں جاسکتی ہے نا کمال کی بات
ورنہ عورت تو خلا نوردی بھی کر چکی ہے۔

سکھوں کی بستی [۱]

گھومتے پھرتے پیاس لگی تو میکڈ انلڈ کا ٹھنڈا میٹھا دودھ پیا، جو اتنا
گاڑھا تھا کہ لگتا تھا آئس کریم پی رہے ہیں. دوپہر کا وقت آیا تو سلیم صاحب کہنے
لگے: "اب تو دل چاہتا ہے کہ تکے کباب کھاتے جائیں". انجم کہنے لگا: "یہ کون
سا مشکل ہے ابھی لیں". وہ ہمیں سکھوں کی بستی ساؤتھ ہال میں لے آیا. کہنے
لگا کہ انگریز اس علاقے سے اس قدر الرجک ہیں کہ تمام علاقوں کے نام جلی
حروف میں لکھے ہوتے ہیں. مگر ساؤتھ ہال کا نام بھی چھوٹے سے بورڈ سے
DEPICT کیا گیا ہے۔

یہ علاقہ انگریزوں کے دیس میں اپنا دیس لگتا تھا. جس طرف نظر
دوڑاؤ، شلوار قمیض میں ملبوس مسلمان عورتیں، ساڑھیاں پہنے تلک لگاتے
ہندو عورتیں، لمبی لمبی داڑھیوں اور کیسوں والے سکھ آجا رہے تھے. لندن میں
یہ چھوٹا سا جزیرہ پنجابی بولنے والوں کا ہے. لگتا تھا کسی پاکستانی یا
ہندوستانی سڑک پر چل رہے تھے. انگریز اکا دکا ہی تھے. سکھوں کے کئی
اسٹورز سپر مارکیٹ اور جیولری کی دکانیں تھیں. کاروبار پر یہی لوگ چھائے ہوتے
تھے. سڑک کے کنارے دکانوں کے باہر میزوں پر اٹلی کی جوتیوں کے

[۱] SOUTH HALL

Marfat.com

ڈھیر لگے تھے۔ "بہن جی! چوڑیاں لیں"۔ "پراجی! ٹھنڈی بوتلیں پیئیں"۔ میں نے ایک سٹور سے عطیہ کے لئے سوٹ خریدا۔ بڑی خوبصورت سکھنی تھی۔ بڑی اچھی گفتگو کر رہی تھی۔ میں نے کہا: "آپ یہ کپڑا مہنگا دے رہی ہیں۔ پاکستان میں اس سے کم قیمت پر مل جاتا ہے"۔ پاس ہی سلیم کھڑے تھے، کہنے لگے "پردیسی سمجھ کر لوٹیں نو بہتہ" کہنے لگی: "پراجی! جو قیمت تسی آکھو گے وہی سہی۔ ہُن میں نہیں بولاں گی"۔

مسلمانوں کے ہوٹل بھی تھے۔ وہاں جاکر پہلے سموسے پکوڑے تکے کھاتے۔ پھر تنوری مرغ منگوایا۔ بڑی بڑی پراتوں میں ہر قسم کے سالن پڑے تھے۔ اپنی پسند کا سالن لو اور گرم گرم نان کے ساتھ کھاؤ۔ انگلینڈ میں یہ مزا رہا کہ اپنی زبان بولنے والے بے شمار مل جاتے تھے جب کہ جرمنی میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی اجنبی دیس میں آ بھٹکے ہیں۔ انگلینڈ میں اجنبیت اور غربت کا احساس بے حد کم ہوتا ہے ہم ایک دفعہ ایک جگہ انگریز سے پتہ پوچھنے کے لئے انگریزی بگھار رہے تھے کہ وہ صاف اور شستہ اردو میں مطلوبہ جگہ کا پتہ بتانے لگا۔ ہم حیران اُس کا منہ دیکھنے لگے۔ وہ کہنے لگا "میں بمبئی لاہور مدراس، کلکتہ اور جانے کہاں کہاں رہا ہوں مجھے آج بھی وہ جگہیں اور وہ علاقے یاد آتے ہیں" یقیجئے جناب! ہم تو ان کے علاقے میں آنے کے لئے مرے جا رہے ہیں اور یہ اپنے دل میں ہمارے شہروں کی حسرت لئے ہوئے ہیں اور حسرت بھی کیوں نہ ہو، کہاں وہ برِصغیر کی وسیع و عریض زمین اور کہاں یہ چھوٹا سا جزیرہ کہ ہر ساٹھ ستر میل کے بعد سمندر سینہ تانے راستہ روکے کھڑا ہے۔ وہ طمطراق، وہ دبدبہ، وہ شان و شوکت، وہ حکومتیں اِن

Marfat.com

بے چاروں کو آج بھی تڑپاتی ہیں جن میں سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ مگر اب تو اس منے سے قطعۂ زمین پر سکڑے سمٹے پڑے ہیں۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ ہاتھی مرے بھی تو سوا لاکھ کا۔ جمہوریت ان کی سی ہم کو کہاں نصیب؟

ہاں تو بات ہو رہی تھی ساؤتھ ہال کی۔ ہوٹل سے کھانا کھا کر نکلے تو کشور کو اپنی عورتوں والی شاپنگ یاد آئی۔ گوشت، سبزی، پھل، کپڑا، مصالحے، چوڑیاں، غرضیکہ دنیا جہاں کی چیزیں۔ اب بار بار ساؤتھ ہال تھوڑی آنا ہے۔ ہمارا تو خیر ہر جگہ سے جوگیوں والا ایک ہی پھیرا ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی لڑھکتے رہے۔ اسٹورز میں سکھ لڑکیاں ساڑھیاں باندھے ایسی میٹھی لہجے دار گفتگو کر رہی تھیں کہ مزا آ گیا۔ اپنی زبان جہاں بھی سنی دل خوش ہو گیا۔ سچ ہے انسان اپنے اصل کی طرف لوٹتا ہے۔ ہمارے ایک عزیز کہنے لگے کہ میں انگلینڈ گیا تو ایک دن اپنی بیوی کے ہمراہ بس پر چڑھنے لگا۔ سکھ کنڈکٹر اندر کھڑا ہر ایک سے کہہ رہا تھا: " NO PLACE —

NO PLACE " میری بیوی کہنے لگی، اس میں تو جگہ نہیں۔ سکھ نے سن لیا۔ پنجابی میں کہنے لگا: " بہن جی! آپ آ جائیں NO PLACE

NO PLACE NO PLACE پراجی تسی وی آ جاؤ جی NO PLACE "

آج اس بازار سے نکلنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ یہاں اپنی زبان سننے کو مل رہی تھی اور اپنے لوگ دیکھنے کو۔ انسان چاہے جہاں کہیں بھی رہے وطن کی خوشبو اُس کی سانسوں میں رچی بسی رہتی ہے۔ وطن کی مٹی کی کشش تا زندگی اس کے سینے میں زندہ و پائندہ رہتی ہے۔ مجھے بھی اپنے

Marfat.com

ملک سے اتنی شدید محبت کا احساس بیرون ملک ہی جاکر ہوا۔ سچ کہا ہے حضرت سعدیؒ نے ع

قدر عافیت کسے داند کہ بمصیبتے گرفتار آید

گھر آتے تو مہمان ملنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ باتیں کرتے کھانا کھاتے سونے کا وقت آپہنچا۔ میں تو سوگئی، سلیم جاگتے رہے۔ نیند ہمیشہ سے اُن کی روٹھی محبوبہ ہے۔ پردیس میں یہ رت جگے اُن کے لئے نعمت غیر مترقبہ بن گئے۔ مگر اپنی نیند سے اتنی دوستی کہ کیا بتاؤں۔ ایک دفعہ بچپن میں ابا جی ہر بچے سے اس کی خواہش پوچھ رہے تھے کہ بڑا ہوکر وہ کیا بنے گا۔ سبھی بچے انجینئر ڈاکٹرز اور پروفیسر بن رہے تھے۔ جب میری باری آئی تو میں نے کہا: "ابا جی! میرا تو بس یہی دل چاہتا ہے کہ ہر وقت سوتی رہوں۔ جاگوں تو چاول کھاؤں اور پھر سو جاؤں۔ انہی دو کاموں میں عمر بیت جائے"۔ بچپن گزرا، جوانی آئی مگر پسند نہ بدلی۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں گھنٹوں ناشتہ نہ کرتی چاول پکاتی اور کھاتی۔ یہی ناشتہ، یہی ظہرانہ، یہی عصرانہ، یہی عشائیہ ہوتا۔ اب بڑھاپا آگیا ہے مگر پسند وہی ہے۔ چاول اور نیند!

میری دوست اور سہیلیاں میری اس کمزوری سے واقف ہیں سو وہ کہتی ہیں "مسرت کی خاطر کے لئے تردد نہیں کرنا پڑتا۔ چاول پکاؤ اور مسرت خوش اسم بامسمیٰ بن جاتی ہے"۔ کسی کے ہاں سے چائے پی کر نکلنے کی تیاری کروں تو رکنے کے لئے کہتی رہے، میں نہیں مانتی کہ بھئی بڑے کام ہیں۔ مگر جہاں اس نے کہا: "مسرتی! ٹھہر جاؤ۔ پلاؤ پکاتی ہوں۔ کھا کر جانا"۔ سارے ضروری کام ختم۔ عمر خیام نے اپنی رباعی میں ایک دفعہ اپنی پسند کا کچھ یوں اظہار

Marfat.com

کیا ہے : میں شراب پیوں، شراب میں نہاؤں، حتیٰ کہ مرنے کے بعد مجھے شراب کے مٹکے میں دفنا دینا" میرا بھی یہی خیال ہے، چاول کھاؤں اور چاول کھاتے مرجاؤں تو چاولوں میں ہی دفنا دینا، کیوں کیا خیال ہے؟

دوستی ایسا ناطہ جو سونے سے بھی مہنگا

۵ اگست ۱۹۸۴ء

آج صبح بڑی تازہ دم اٹھی۔ دیکھا تو سلیم کسل مندی سے بستر پر کروٹیں لے رہے تھے۔ کہنے لگے رات بڑی بے آرام گزری ہے۔ آج تو دن کو سوؤں گا۔ اس لئے بستر پر لیٹے رہے۔ میں نے کشور کی بیٹی عطیہ کو ہمراہ لیا اور ہائی ویکمب کی مارکیٹ کی طرف نکل پڑی کیونکہ پاکستان سے رخصت کرتے وقت سبھی نے نصیحت کی تھی کہ سوئیٹر لندن سے لینا، ڈائمنڈ امریکہ سے لینا (جو ہمارا قطعی لینے کا ارادہ نہ تھا۔ مگر اپنی پردہ دری بھی منظور نہ تھی اس لئے خاموش رہے)، الیکٹرک کی چیزیں ہانگ کانگ سے لینا۔ لوگوں کی نصیحتوں سے تو لگتا تھا جیسے ہمارا ٹور تفریحی نہیں تجارتی دورہ ہے۔ بہر حال، ان سب نصیحتوں میں ایک ہی کارآمد تھی کہ سوئیٹر لندن سے ہی لینے ہیں۔ مگر جناب سبھی اسٹورز میں پھری، سبھی دکانوں میں قدم رنجہ فرمایا۔ سوئیٹر قطار اندر قطار بے شمار پڑے تھے، مگر کسی کی آستین غائب، کوئی اتنا کھلا کہ لگے کسی پاگل کا ہے۔ کسی کے بازو لمبے، کسی کا گلا بارڈر تک پہنچا ہوا۔ بھلا ہو ان انگریزوں کا، ان کی تو مت ہی ماری گئی ہے۔ غرضیکہ سوئیٹر خریدنے کی حسرت ہی رہی۔

Marfat.com

سلیم صاحب کی دو بنیائن اور ایک قمیض رفع شر کے خیال سے لی پھر اِدھر اُدھر گھوم کر واپس آ گئے۔ سلیم صاحب بھی اپنی نیند پوری کر چکے تھے اکٹھے مل کر کھانا کھایا اور قیلولے کے لئے لیٹ گئے۔

تین بجے اٹھے تو میری سہیلی مبارک کے خاوند منظور صاحب ہمیں لینے کے لئے آ گئے کہ آج رات کا کھانا ہمارے گھر کھائیے۔ ان کا گھر WAT FORD میں تھا جو بڑا خوبصورت اور نہایت نفاست اور دلکشی سے سجا یا ہوا تھا وہاں پہنچے تو مبارک کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ سلیم اور منظور آپس میں باتیں کرنے لگے۔ ہم دونوں کچن میں آ کر پرانی یادیں تازہ کرنے لگے۔ میں نے مبارک سے کہا کہ میں تمہارا ہاتھ بٹا دیتی ہوں۔ وہ کہنے لگی "مجھے پتہ ہے تم کتنی قابل ہو بس میز پر برتن لگا دو، یہی بہت ہے" مبارک سے کیا پردہ تھا، مجھے کھانا کھانے سے ہمیشہ رغبت رہی، کھانا پکانے سے ہمیشہ نفرت! ہم دونوں کچن میں آ کر پرانی یادیں تازہ کرتی ہیں۔ ہاسٹل میں ایک دفعہ نانی کسی وجہ سے چلی گئی۔ ہم سب کو خود کھانا پکانا پڑا کسی نے ہنڈیا پکانے کا کام لیا کسی نے برتن دھونے کا ذمہ لیا۔ کسی نے روٹیاں پکانے اور کسی نے صبح کے پراٹھے تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ مجھ سے پوچھا کہ تم کون سا کام کرو گی۔ میں نے کہا کہ تم سب کام کرنا، میں ٹرانسسٹر لے کر پاس بیٹھی رہا کروں گی۔ تمہیں گانے، خبریں، ڈرامے، سبھی کچھ سنوایا کروں گی۔ چنانچہ اتفاق رائے سے میرے سپرد یہی کام ہوا جسے میں نے بڑی ذمہ داری سے نبھایا۔

مبارک کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں اس کے پاس موجود ہوں۔ بار بار کہے "مسرت! تو سچ آ گئی ہے نا!" ان کے گھر کے نزدیک ایک

Marfat.com

بڑا وسیع پارک تھا۔ ہم وہاں سیر کے لئے چلے گئے۔ وہاں کافی پرانے گھنے درخت چھتر تانے کھڑے تھے۔ دُور دُور تک خاموشی کا راج تھا۔ اسی میدان میں ایک طرف تیرنے کے لئے تالاب بھی بنا ہوا تھا۔ ذرا آگے نکلے تو بچوں کا پبلک اسکول تھا جس میں مبارک کے دونوں بچے پڑھتے تھے۔ ماشاءاللہ اس کے بچے بڑے ذہین و فطین ہیں اور اس پر طرّہ یہ کہ پاکستان کے شیدائی۔ اکثر ماں باپ کے ساتھ جھگڑتے ہیں کہ ہم پاکستان جا کر کیوں نہیں رہ سکتے۔

سیر سے واپس آتے تو مبارک چائے تیار کر چکی تھی۔ کہنے لگی: "مسّرتی میرے ہاتھ کا بنا ہوا کیک کھاؤ۔ بیکنگ ساری گھر کی ہے۔ کیونکہ مجھے یہی خوف رہتا ہے کہ کہیں اُنہوں نے گھی کی جگہ سؤر کی چربی تو استعمال نہیں کی۔" لیجئے، یہاں بھی سلیم کی طرح وہمی موجود ہیں۔ چائے پی کر ہم چار دل ویٹ فورڈ کی مارکیٹ کی طرف گئے۔ پھرتے پھراتے رہے۔ لوگوں کو دیکھا کہ سبھی اپنے کاموں میں سنجیدگی سے مصروف، کسی کو کسی سے غرض نہیں۔ ان کی عیاشی، شراب نوشی، مستی اور بے حیائی کے قصّے جو سن رکھے تھے سبھی من گھڑت اور جھوٹ معلوم ہوتے۔ اصل میں نوجوان طبقہ ان باتوں کا شیدائی ہے، مگر عمر رسیدہ لوگ ایسی باتوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ خالدہ نے بھی جرمنی کے لوگوں کی بڑی تعریف کی تھی اور کہا تھا: "اگر میں سڑک پر یہاں اکیلی جا رہی ہوتی ہوں اور کوئی دوسرا آدمی آ جائے تو دل کو ڈھارس ہوتی ہے۔ مگر پاکستان میں اکیلی عورت خود کو محفوظ خیال کرتی ہے جب کہ کسی دوسرے آدمی کی موجودگی میں خوفزدہ ہو جاتی ہے کہ اکیلی جان کو دیکھ کر ضرور کوئی

Marfat.com

شرارت کرے گا۔ بعد میں جب انگلینڈ میں خوب پھرے، امریکہ گھومے تو دو چار ایسے کردار بھی نظر پڑے مگر اُن کو کوئی قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا۔ یہ بھی ان لوگوں کے کردار کی خوبی ہے۔ ورنہ ہمارے یہاں تو ذرا مروجہ طریق سے ہٹ کر لباس پہنا نہیں کہ دیکھنے والوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔

سیر سے واپسی پر کھانا کھایا۔ باتیں کرتے کرتے رات کے گیارہ بج گئے۔ اب دونوں میاں بیوی ہمیں چھوڑنے کے لئے کشور کے گھر آئے۔ راستے میں بہتری کوشش کی کہ مبارک سے باتیں کروں، مگر نیند نے پاگل کیا ہوا تھا۔ جانے اس نے کیا پوچھا اور میں نے نیند میں کیا جواب دیا کہ گاڑی قہقہوں سے منور ہوگئی۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور سوگئی۔ گھر چھوڑ کر جانے لگے تو مبارک نے وعدہ لیا کہ اب جس دن فرصت ہو مجھے فون کرنا تاکہ میں آکر اپنے گھر لے جاؤں گی۔ میرا بھی خیال تھا کہ پھر ملیں گے مگر دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی۔ اس طوفانی دورے میں ایک سے زائد بار کسی سے بھی نہ مل سکے۔ کسی کے ہاں کھانا کھایا تو کسی کے ہاں ناشتہ کیا۔ کسی کے گھر چائے پی، کسی کے گھر بس دس پندرہ منٹ ہی ٹھہرے۔ حتی المکان کوشش کی کہ سبھی راضی رہیں مگر نتیجہ الٹ ہی نکلا۔ سب کو شکایت سب کو گلہ ؎

یہ ایک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے
تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے

Marfat.com

یورپ کی دلہن کا دیدار[1]

۱۶ اگست ۱۹۸۳ء

آج ہماری پیرس روانگی تھی، کوچ کے ٹکٹ ہم دو دن پہلے ہی جا کر لے آتے تھے۔ بس کو ۸/۱ بجے لندن سے روانہ ہونا تھا۔ اب چونکہ چارج کشور کا تھا اس لئے ہر کام بڑے انتظام سے ہو رہا تھا۔ پیرس میں سعادت کو اطلاع دی جا چکی تھی کہ فلاں اسٹیشن پر پہنچو۔ چنانچہ یہ اسی کی مستعدی کا نتیجہ تھا کہ جب ہم پیرس پہنچے تو سعادت اور بھائی نواز (سلیم کے دوست) مع تینوں بھائیوں کے دو گاڑیاں لئے تین چار گھنٹے سے وہاں بیٹھے انتظار کی صعوبت اٹھا رہے تھے۔ مجھے تو یہی خدشہ تھا کہ سعودی عرب، جرمنی اور انگلینڈ کی طرح خود ہی گھر ڈھونڈنا پڑے گا۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا اور یہ روایت ٹوٹ گئی، بلکہ کشور کی بار بار تاکید کی وجہ سے وہ لوگ وقت سے کافی پہلے آکر بیٹھ گئے۔

آج صبح سے ہی موسم بڑا خوشگوار تھا۔ موسم کو بھی خبر تھی کہ ہم دنیا کے خوبصورت ترین شہر جا رہے ہیں۔ گہرے کالے بادل چھائے ہوئے تھے جن سے کبھی کبھی سورج منہ نکال کر زمین پر اپنی سنہری کرنوں کا جال بچھا دیتا تھا تو اس کی روشنی سے خوابیدہ ماحول فوراً جاگ اٹھتا تھا۔ آس پاس ایک

---

[1] PARIS

Marfat.com

دم تازگی سی آجاتی تھی۔ یہ انگلستان کی ہمیں DOVER تک رہی۔ اگرچہ موسم گرما کا وسط تھا مگر ہمارے جیسی تپش والی گرمی نہ تھی۔ ہریالی درختوں اور میدانوں سے پھوٹ نکلی تھی۔ مکانوں کی دیواروں سے چپاں بیلیں بڑا دلکش منظر پیش کر رہی تھیں۔ اس پر مستزاد کوچ بڑی آرام دہ تھی۔ سفر شروع ہوا۔ پہلے دریائے ٹیمز پار کیا۔ پھر لندن رخصت ہوا۔ اب لندن کی کنٹری سائیڈ شروع ہوئی۔ کہاں ہمارے گاؤں کہ کیچڑ، گندگی، کچی سڑکوں، کوڑے سے اٹی نالیوں، مکھیوں مچھروں کی آماجگاہ بنے میدانوں سے عبارت ہیں، کہاں وہاں کے گاؤں کہ جنت کے ٹکڑے، صفائی، پاکیزگی، حسن و لطافت، سبزہ، پھول، پھل پھلواری، امن و سکون، روح پرور فضا لئے ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ کنٹری سائیڈ میں رہنا باعثِ فخر سمجھتے ہیں اور ہم لوگ شہروں میں بسنا امارت کی نشانی جانتے ہیں۔ قصور نہ ان کا ہے نہ ہماری سوچ کا، فرق سہولتوں کا ہے۔ ان کے گاؤں میں بجلی، پکی سڑکیں، ٹیلی فون یعنی ساری سہولتیں اور سب سے بڑھ کر فطرت کی ہمسائیگی میسر ہوتی ہے جو ہمارے ہاں مفقود ہے۔ بعض جگہوں پر بڑے بڑے پارک بنے ہوتے تھے۔ آگے بڑھے تو دور سرسبز چراگاہیں نظر آئیں جن میں گائیں سر جھکائے پیٹ پوجا میں مصروف نظر آئیں، بالکل ویسے ہی جیسے اکثر ہم انگلینڈ کی سینری وغیرہ میں دیکھتے ہیں۔ پھر DOVER کی بندرگاہ آگئی۔ سفید رنگ کی انتہائی بلند CLIFF کے نیچے بڑا وسیع میدان اور آگے سمندر ہی سمندر۔ میدان میں ڈوور کا کسٹم ہاؤس اور چیکنگ کا دفتر ہے۔ مختلف ٹورسٹ اور بسوں کے مسافروں کے علاوہ گاڑیوں والے، سائیکلوں والے بھی موجود تھے۔ بعض لوگ تو کاروں نما گاڑی لئے ہوئے

Marfat.com

تھے جس میں سارا سامان بھرا ہوا تھا۔ ان کا ارادہ شاید سیر کے ساتھ کہیں مستقل رہائش کا بھی تھا۔ بعض نے گاڑیوں پر سائیکلیں فٹ کی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا سبھی فرانس جانے کو نکل آتے تھے۔ اصل میں جن دنوں ہم لوگ یورپ گئے وہ تفریح کا خاص موسم تھا۔ انگلینڈ کے باسی فرانس کی کشش کے باعث کھنچے چلے آرہے تھے۔ ہماری کوچ کو بھی چیکنگ کے بعد فیری پر لاد دیا گیا۔ ہم کوچ میں ہی بیٹھے رہے جب کوچ جہاز میں آکر رکی تو ہم اتر کر اور کچھ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی منزل میں آگئے۔ اب جھاگ اڑاتا، فیری سے ٹکراتا سمندر دور تک پھیلا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے سنا تھا کہ انگلینڈ اور فرانس کے درمیان یوں سمجھئے ایک نالہ سا بہتا ہے جس کا نام ENGLISH CHONNCL ہے۔ رات کو انگلینڈ کے ساحل سے فرانس کی بتیاں نظر آتی ہیں، آتی ہوں گی، مگر ہمیں نظر نہیں آئیں۔ جاتی دفعہ تو خیر دن کا سفر تھا، بتیاں کہاں سے نظر آتیں مگر واپسی کا سفر رات کا تھا، تب بھی نظر نہ آئیں۔

فیری ایک ننھا سا بحری جہاز تھا۔ P&O FERRICS کمپنی کے ایسے کئی جہاز روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں مسافر لانے لے جاتے ہیں۔ اوپر کی منزل میں پورا بازار تھا۔ سووینیر کی دوکانیں تھیں، بار تھے، ہوٹل تھے، کمرے تھے جہاں پکچر چل رہی تھی۔ سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے فیری آگے ہی آگے چلی جارہی تھی۔ اب پیچھے بھی سمندر، آگے بھی سمندر، لو دیکھو اور جی بھر کر دیکھو۔ میں خدا کی فیاضی اور مہربانی پر حیران و ششدر فیری کی ایک سائیڈ پر بیٹھ کر سمندر کو دیکھنے لگی جو سبز رنگ کی ایک جیلی کی مانند تھر تھرا رہا تھا۔ سلیم سے اکثر کہا کرتی تھی : "میں نے کیا دیکھا کہ سمندر بھی نہیں دیکھا"۔ مگر آج دیکھنا ایک طرف تھا، سمندر پر

Marfat.com

سرگرم سفر ہوں ہم سے کچھ فاصلے پر ایک ہوورکرافٹ جارہا تھا۔ وہ بھی فرانس کے ساحل کی طرف رواں دواں تھا۔ تصور کی آنکھ سے وہ زمانہ دیکھا جب انگلینڈ کے بھگوڑے اور سزا یافتہ لوگ چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں فرانس کے ساحلوں کا رخ کرتے تھے تاکہ سزا سے بچ جائیں۔

سلیم صاحب کیبن سے کھانا لے آئے۔ ہم دونوں نے وہیں بیٹھ کر کھایا۔ پھر باری باری جاکر دوکانیں دیکھیں کیونکہ جو زادِ سفر تھا وہ پاس ہی تھا۔ اس کی رکھوالی بھی منظوری تھی۔ فیری دو بجے فرانس کے ساحل سے جالگی۔ اب وقت تبدیل کیا گیا، کیونکہ اس وقت فرانس میں تین بجے تھے۔ سب نے گھڑیاں ٹھیک کیں۔ اب کیلے (CALIS) کی بندرگاہ پر اترے۔ انگلینڈ اور فرانس کے درمیان یوں تو کافی بندرگاہوں سے آمدورفت ہوتی ہے، مگر نزدیک ترین فاصلہ صرف ڈوور اور کیلے کے درمیان ہے اور یہی زیادہ آنے جانے کے لئے مخصوص ہے۔

اب پھر کوچ میں سفر شروع ہوگیا۔ ہم فرانس کی کنٹری سائیڈ سے گزر رہے تھے۔ اکا دکا مکانات اور وسیع و عریض کھیت دکھائی دیتے۔ مکانوں کے مکین یا کھیتوں کے کسان کہیں نظر نہیں آتے۔ ان دنوں گندم کی کٹائی ہوچکی تھی۔ جا بجا ترتیب سے گٹھے بندھے پڑے تھے جو انسان سے زیادہ مشین کا کام لگتا تھا۔ ویسے بھی آج کل ہر جگہ مشینوں کی حکومت ہے۔

کیلے (CALIS) سے چلے تو خیال تھا کہ راستے میں کہیں نہ کہیں رکیں گے تو پانی پی لیں گے مگر ع ایں خیال است و محال است و جنوں

والا معاملہ تھا۔ ڈرائیور تو بس کوچ کو اڑائے لئے جارہا تھا۔ ہم دونوں کو وہاں اکثر پیاس لگتی تھی۔ بس کے بقایا مسافروں کو یا تو پیاس محسوس ہی نہ ہوتی

Marfat.com

تھی اور بعض کو اگر ہوتی تو FROST کی طرز کے جوس نکال کر پی لیتے۔ ہمارا پہلا پہلا سفر، ہمیں معلوم نہ تھا کہ کھانے پینے کا سامان ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے۔ دل کو یہی کہہ کر تسلی دے لینی تھی ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

باہر نظر دوڑاتی تو ایک ہی طرز کا سرسبز علاقہ اور اس کے درمیان گڑیا گھر کی طرح کا چھوٹا سا مکان جس کی سمت کھیتوں سے بل کھاتی پگڈنڈی راستہ بنائے دکھائی دیتی ہیں سوچتی اِن اکیلے دکیلے مکانوں کے مقیم گھراتے تو ہوں گے یا پھر یوں کہہ لیتے ہوں گے ؎

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

ایک دفعہ ایک رسالے میں کنیڈا کے جنگلات میں رہنے والے لوگوں کے متعلق پڑھا تھا کہ اُن کی تنہائی دُور کرنے کا واحد ذریعہ ٹیلی فون ہے۔ یعنی جن دشوار گزار علاقوں میں کوئی ساتھ دینے کو تیار نہ ہو، وہاں بے چارا ٹیلی فون ہی سنگت اور ساتھی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اپنے ملک میں یوں فاصلے پر بنے مکان کم ہی نظر آتے ہیں۔ مگر اِن لوگوں کو اِن مکانوں میں تمام جدید سہولتیں میسّر ہیں اور اُس پر طرّہ تنہائی جیسی یہ خوبصورت نعمت!

AMIENS کا شہر آیا تو یہیں دریائے سوم کو پار کیا۔ شہر صاف ستھرا، دلکش، خوبصورت عمارتیں۔ رنگین پھولوں سے لدے ہوئے چھوٹے چھوٹے باغیچے، کہیں کہیں دریا کے کنارے یا گھنے درختوں کے جھنڈ میں لوگوں نے تازہ

Marfat.com

دم ہونے کے لیے گاڑیاں روک رکھی تھیں۔ کچھ کھا پی رہے تھے، کچھ گھاس کے میدان پر بیٹھے تکان زدہ اعضا کو آرام پہنچا رہے تھے۔ پھر سب کو چل پڑنا تھا کیونکہ چلنا مدام، چلنا ہی اُن کا کام تھا۔ ان دنوں چونکہ تفریحی موسم تھا۔ سب کو گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ اس لیے سبھی "سیروفی الارض" کے لیے چل نکلے تھے۔ خدا خدا کر کے ہمارے پڑاؤ کا بھی موقع آ گیا اور کوچ CAFF DE ROUTE پر جا ٹھہری۔ وہاں سے کچھ کھایا پیا اور پونڈز فرانک میں تبدیل کروائے کئی لوگ ٹیلی فون پر اپنے عزیزوں کو مطلع کر رہے تھے کہ ہم بس پیرس آیا ہی چاہتے ہیں، ہمیں ریسیو کر لو۔ باتھ رومز میں لڑکیاں اور عورتیں میک اپ کر رہی تھیں۔ اب پھر ہم کوچ میں سوار ہوئے۔ سب لوگوں کے چہرے تروتازہ لگ رہے تھے۔ منزل کی قربت کا اثر تھا یا سرخی غازے کا کہ ہر طرف لالیاں گلابیاں ہی رقصاں تھیں۔ پیرس آخر پیرس ہے شہروں کی بے تاج ملکہ! ہر دل کی آرزو، سیاحوں کا خواب، پریوں کا دیس، لاتعداد قصے، بے شمار کہانیاں جو پیرس کے متعلق پڑھی تھیں، مجسم بن کر راہوار شوق کو ہوا دے رہی تھیں۔

تیز ترک گامزن منزل ما دور نیست۔ اب تو ہم اُن حسینوں کو دیکھیں گے جو گرمیوں سردیوں کے موسم شروع ہوتے ہی دنیا کے جدید ترین فیشنوں، لباسوں کی نمائشیں کرتی ہیں اور اخبارات کے ذریعے ہم غریبوں تک بھی ان کی جھلک پہنچ جاتی ہے اور لوگ باگ لباس سے زیادہ حسینہ کے جسم کے پیچ و خم پر توجہ دیتے ہیں۔ بہرحال، پیرس کی آمد آمد تھی۔ کوچ شہر دلآویز میں داخل ہوئی سڑکوں سڑکوں ہوتی کوچ سروس اسٹیشن پہنچی مگر صاحب! پیرس نے مجھے ذرا متاثر نہ کیا۔ میں نے بچپن میں سنا تھا کہ پیرس میں سڑکیں شیشے کی ہوتی ہیں خیر بچپن میں

Marfat.com

تو پریوں کی کہانیاں بھی سنی تھیں۔ لیکن پھر بھی پیرس کو ایسا تو نہ سوچا تھا جیسا یہ نکلا۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہماری کوچ شہر کے عام سے علاقے سے گزری ہو یا شاید وہی بات ہو کہ تاج محل دیکھنے جاؤ تو مایوسی ہوتی ہے کیونکہ ذہن میں اس کی تعریفیں سن سن کر اتنا شاندار امپریشن بن چکا ہوتا ہے کہ ہمیں اس سے کم تر کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ لیکن بعد میں جب پیرس سے تفصیلی ملاقات ہوئی تو اُس کا حسن نکھر کر سامنے آیا۔ پیرس ایسی حسینہ ہے جو پہلی ملاقات میں فوری طور پر اپنی تمام ادائیں اور غمزے آپ پر ظاہر نہیں کرتی۔ وہاں جائیں آرام و اطمینان سے اسے دیکھیں تو آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے سے اس کا حسن واضح ہوتا جاتا ہے۔

لباس کے معاملے میں پیرس میں بھی لوگ لاپروا نظر آئے۔ کسی کا لباس چھوٹا کسی کا لمبا، کوئی جینز میں پھنسا ہوا تو کوئی بیل باٹم میں پاؤں مار رہا ہے۔ کسی کو کسی سے غرض نہیں۔ لباس سب کا ذاتی معاملہ ہے اور وہ لوگ ذاتیات میں دخل اندازی پسند نہیں کرتے۔ وہاں کالے گورے، مشکی، گندمی، لال گلابی، غرضیکہ ہر قسم کے ہر نسل کے لوگ گھوم پھر رہے تھے۔ کوچ سے سروس اسٹیشن پر پہنچے تو ہمارے میزبان ہمارے انتظار میں سوکھ رہے تھے۔ بارے خدا ہم پہنچے تو وہ ہمیں لے اڑے۔ گھر پہنچے تو کھانا کھا کر آرام کے لئے لیٹ گئے۔ بھائی نواز کی بیوی پروین مہمان نواز، خوش خلق اور پُرخلوص پہلی ہی ملاقات میں ایسی گرمجوشی سے ملی کہ اجنبیت کا لمحہ بھر کو بھی احساس نہ ہوا۔ جتنی خاطر مدارات ہماری پیرس میں ہوئی، سارے سفر میں کہیں بھی نہ ہوئی۔ کبھی سموسے اور پکوڑے تلے جا رہے ہیں، کبھی آلو چھولے مرچ مصالحے

Marfat.com

والے تیار ہو رہے ہیں۔ کرارے اور مزیدار شامی کباب بن رہے ہیں۔ کبھی کڑھی پک رہی ہے۔ ساتھ گرم گرم پراٹھے ہیں۔ ناشتے کی میز پر پیسٹریاں، کیک، آئس کریم، پھل، انڈے، توس، مکھن، جام، پنیر، غرضیکہ اُن کا بس نہ چلتا تھا کہ دنیا جہان کی نعمتیں ہمارے سامنے ڈھیر کر دیں۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم باہر جائیں گے اور ہلکا بے مزہ انگلش فوڈ کھائیں گے تو جسم پر چڑھی چربی کی تہیں گھلنا شروع ہو جائیں گی مگر حسرت ان خواہشوں پر رہی جو تکمیل تک نہ پہنچ سکیں۔ یہاں تو جس جگہ گئے دیسی مرغن کھانوں اور نت نئے مزوں سے ہم کنار ہونا پڑا۔

۷ اگست ۱۹۸۲ء

آج ہمیں وہ کام سرانجام دینا تھا جو اس سفر کے لئے MOMENTUM تھا، یعنی سعادت کے ڈاکٹر سے مل کر اس کے آپریشن کے لئے تاریخ لینی تھی۔ چنانچہ صبح سویرے تیار ہو کر بھائی رب نواز کے ہمراہ چل دیتے۔ پیرس کے گرداگرد "پیرس فیری روڈ" ہے جس سے تمام ارد گرد کے گاؤں اور شہروں کو سڑکیں نکلتی ہیں۔ پہلے تو بھائی رب نواز نے اس کا چکر لگوایا۔ ساتھ ساتھ مختلف علاقوں عمارتوں کے نام بتاتے گئے، مگر اپنے پلے کچھ نہ پڑا۔ پھر گھومتے گھماتے سعادت کے ڈاکٹر کے آفس پہنچے تاکہ وقت لیا جا سکے۔ فرانسیسی لوگ بھی انگریزی زبان سے جرمنوں کی طرح الرجک ہیں۔ مگر یہاں بھائی رب نواز کی فرانسیسی کام آئی اور دوسرے دن کا وقت خاص نوازش کے تحت مل گیا۔ وجہ نوازش یہ تھی کہ سعادت کی فیملی پاکستان سے خاص اس

Marfat.com

مقصد کے لئے آتی ہے اور اپنے سامنے آپریشن کروانا چاہتی ہے ورنہ وہاں ایک ماہ پہلے وقت لینا پڑتا ہے۔ اس طرف سے دل مطمئن ہوا تو کچھ دیر اور سیر کی سب سے پہلے ایفل ٹاور گئے۔

بادلوں کا گڈریا۔ ایفل ٹاور

یہ پیرس کی پہچان ہے۔ اس پر سیاحوں کا ہجوم اور ایک لمبی قطار ٹکٹ لینے والوں کی لگی ہوئی تھی جو لفٹ کے ذریعے ایفل ٹاور کی پہلی دوسری اور تیسری منزل تک جانا چاہتے تھے۔ ایفل ٹاور کے ایک طرف گستاف ایفل کا کٹے ہوتے بازو کا مجسمہ بنا ہوا تھا۔ اس کی تصویر کھینچی۔ جب ۱۸۸۹ء میں فرانس کی حکومت نے فرانسیسی انقلاب کی یادگار بنانے کا سوچا تو عام دعوت دی گئی کہ صنعتی انقلاب میں چونکہ ہر طرف دھات کی حکمرانی ہے۔ اس لئے کسی دھات کا ایسا ڈھانچہ کھڑا کیا جائے جو آئندہ نسلوں کے لئے ایک یادگار رہے۔ چنانچہ مختلف انجینئرز اور فرموں کی طرف سے ۷۰۰ منصوبے پیش ہوئے جن میں گستاف ایفل کا منصوبہ قابل قبول سمجھا گیا۔ ایفل نے سارا لوہے کا ڈھانچہ علیحدہ تیار کیا اور منتخب جگہ پر لا کر نصب کر دیا۔ اس منصوبے پر ۲ سال تک ۲۰۰ آدمی کام کرتے رہے۔ پہلی منزل یکم اپریل ۱۸۸۸ء کو مکمل ہوئی اور دوسری منزل اسی سال ۱۴ اگست (کہ ہمیشہ سے اہم دن چلا آرہا ہے) کو پایہ تکمیل تک پہنچی۔ تیسری منزل ۳۱ اگست ۱۸۸۹ء کو تقریباً ایک سال کے وقفے کے بعد تیار ہوئی۔ اس وقت سے لے کر آج تک دنیا کے کونے کونے سے لوگ اس لوہے کے ڈھانچے کو دیکھنے آتے ہیں۔ ان دنوں میں بھی اس کا شہرہ عالم میں چار سو پھیل گیا۔ اس وقت کے پرنس آف ویلز

Marfat.com

جو بعد میں ایڈورڈ ہفتم بنے، اپنی فیملی کے ہمراہ آئے۔ شاعروں نے اس پر نظمیں کہیں۔ پہلے سال ہی انیس لاکھ ٹکٹ فروخت ہوئے۔ ۱۹۷۹ء میں چونتیس لاکھ! اب تو شاید کروڑوں تک کے ٹکٹ فروخت ہوتے ہوں گے۔ ایک انگریز شاعر نے اسے بادلوں کا گڈریا کہا ہے۔ لیکن جب حیرت و استعجاب کی منزل ختم ہوئی تو اعتراضات کا سلسلہ چل نکلا۔ کسی نے اسے HOLLOW CANDLE STICK کہا جو ابھی گرا کہ گرا۔ بننے کے دوران بھی دو دفعہ کام روک دیا گیا کہ آس پاس رہنے والے لوگ ڈرتے تھے۔ انہوں نے عدالتوں میں مقدمات دائر کر دیئے کہ مینار ان کے سروں پر گرے گا۔ خود ایفل کو بے شمار تنقید اور بے عزتی کا نشانہ بننا پڑا۔ ۱۹۱۰ء تک فیصلہ ہو گیا کہ یہ یادگار جو پیرس کی خوشنما پیشانی پر بدنما کالا داغ ہے گرا دی جائے۔ مگر ابھی یہ فیصلہ ہو رہا تھا کہ پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء-۱۸) چھڑ گئی۔ حکومتِ فرانس نے یہاں تیسری منزل پر ریڈیو ٹیلی گراف کا سنٹر بنا دیا۔ اسی سنٹر پر ماتا ہری (مشہور جاسوسہ) کے جرمنی بھیجے جانے والے سگنل سنے گئے۔ جنگ کے دوران اس ٹاور سے پچاس ملین الفاظ بھیجے گئے اور سُنے گئے۔ اب لوگوں کو اس کی قدر محسوس ہوئی۔ اب تو یہ مینار ایک ملٹری ایڈ کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ گستاف ایفل نے تنقید بھی سہی اور تعریفوں کے ڈونگرے بھی سنبھالے۔ ۱۹۲۳ء میں جب وہ مرا تو اس کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندۂ جاوید ہو چکا تھا۔ سنٹرل اسکول آف انجینئرنگ (جہاں کا وہ طالب علم تھا) کے میگزین کے سرورق پر آج بھی اس کی تصویر بمعہ ایفل ٹاور کے چھاپی جاتی ہے۔ آج ایفل ٹاور کے ماڈل، رومال، گلاس، پلیٹ، چابیوں کے چھلے، بیج اور تصویریں دنیا کے

Marfat.com

ہر ملک میں پہنچ چکی ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں اس کا نام قومی یادگاروں کی لسٹ میں درج ہو گیا اور فرانس اب بجا طور پر اس پر فخر کرتا ہے۔ پیرس خراجِ عقیدت کے طور پر اپنا خوبصورت ترین نظارہ اس پر چڑھنے والوں کو پیش کرتا ہے۔

میرا خیال تھا کہ ہمیں ٹکٹ نہ مل سکے گا۔ مگر بھائی رب نواز نے جانے کون سی کرامت استعمال کی کہ دس پندرہ منٹ کے بعد ٹکٹ لے کر آن کھڑے ہوئے۔ سلیم صاحب چونکہ اونچائی اور بلندی سے ہراساں رہتے ہیں اس لئے یہ نیچے بیٹھے رہے۔ مجبوراً بھائی رب نواز نے ان کا ساتھ دیا اور میں اور سعادت لفٹ کے ذریعے دوسری منزل پر پہنچ گئے۔ وہاں جا بجا دوربینیں لگی ہوئی تھیں جن میں اکثر خراب تھیں۔ بہر حال اتنی باریک بینی سے ہمیں دیکھ کر کیا لینا تھا۔ پیرس شہر کا نظارہ سبھی کو دعوتِ عام دے رہا تھا۔ اتنا دلنشین، اتنا دل ربا، اتنا حسین کہ انسان سانس لینا بھول جائے۔ حدِ نظر تک عمارتیں ہی عمارتیں سورج کی چمکیلی سنہری دھوپ میں بے حد خوبصورت نظر آ رہی تھیں۔ درمیان میں بل کھاتا دریائے سین اور اس پر بنے ہوئے پل۔ دریا میں چلتی ہوئی کشتیاں، سڑکوں پر دوڑتی ہوئی رنگ برنگی موٹریں، ننھے منے دھبوں کی صورت میں انسان، غرضیکہ عجیب دلفریب و دلکش نظارہ تھا۔ بعد میں نیچے آ کر سلیم صاحب کو خوب ستایا کہ آپ ایسے پیارے منظر سے محروم رہے۔ آپ کا حساب تو اس وقت کے وزیرِاعظم فرانس سے بھی بُرا رہا جو اپنے وقت میں تیار کردہ اس یادگار کو دیکھنے گیا تو پہلی منزل سے آگے نہ جا سکا کیونکہ اس بے چارے کی عمر ۶۲ سال کی تھی اور وہ بلندی سے خوفزدہ تھا۔ اس نے اپنے جواں سال وزیرِ تجارت کو دوسری اور تیسری منزل تک بھیجا اور پھر اسی کی رپورٹ پر ایفل کو اعزازات

Marfat.com

سے نوازا۔

آج کل ایفل ٹاور کی تیسری منزل میں جغرافیائی آلات لگائے گئے ہیں۔ ایک تجرباتی ہوائی چکی بھی فرانس کی بجلی کمپنی نے لگائی ہے اور اب یہ ٹاور تین ٹیلی ویژن اسٹیشنوں کے پروگرام نشر کرتا ہے تیسری منزل پر عوام کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ اس پر مرمت کا کام جاری تھا۔ اس لیے پہلی اور دوسری منزل پر ہی گئے اور شاداں و فرحاں واپس آتے۔ پہلی منزل پر نوادر کی ایک چھوٹی سی شاپ بھی تھی۔ وہیں سے ایفل ٹاور کے کارڈ لیے۔

سست رفتار دریائے سین

ایفل ٹاور سے تھوڑا سا آگے بڑھے تو سامنے ہی چند قدم کے فاصلے پر دریائے سین میں تفریحی کشتیاں چلتی ہیں۔ وہاں ایک تفریحی کشتی میں بیٹھے جو یکے بعد دیگرے تقریباً بائیس پلوں کے نیچے سے گزرتی ہوئی دوبارہ چلنے والی جگہ پر آن پہنچی ممکن ہے کوئی پل دوبارہ گنا گیا ہو کیونکہ کشتی جونہی کسی پل کے نیچے سے گزرتی اسے میں گنتی میں شامل کر لیتی۔ ارد گرد کے کناروں پر مشہور زمانہ عمارتیں ہیں جن میں نوٹرے ڈم کا گرجا بھی تھا۔ یونیورسٹی آف پیرس، سپریم کورٹ کی عمارت، وہائٹ ہاؤس اور واشنگٹن کے طرز پر بنائی گئی عمارتیں جن پر امریکی ٹورسٹ ہنس رہے تھے۔ ایک فرانسیسی لڑکی اگرچہ انگریزی میں بہت کچھ بتا رہی تھی مگر اپنے پلے کم ہی پڑ رہا تھا۔ ہر کشتی میں جتنے آدمیوں کی گنجائش تھی اتنی ہی لائف بوٹس لگی تھیں۔ بھلا دریائے سین بھی کوئی مرنے

Marfat.com

کی جگہ ہے۔ ایسا دیواروں میں جکڑا، پلوں کی زنجیروں سے باندھا ہوا، تھکے ہارے شکستہ حال آدمی کی طرح زمین پر لیٹا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ یہ بھلا کسی کو کیا مار سکتا تھا۔ کشتی کا ہر چکر تقریباً دس میل کا ہے۔ ۲۰ فرانک یعنی تقریباً پچاس روپے فی شخص کرایہ لیا گیا۔ بچے کا کرایہ ۱۰ فرانک لے رہے تھے۔ ایک چکر میں ہزاروں روپے کماتے تھے۔ جب سفر کے ختم ہونے کا موقع آیا تو فرانسیسی گائیڈ نے اپنا مائیکروفون ایک طرف رکھا اور سووینیز کی ٹوکری سنبھال ہر ایک کے آگے دامن پھیلایا کہ کچھ لے لو۔ دریائے سین میں دریاؤں والی شوریدہ سری نظر نہیں آتی۔ اب تو ہمارے دریا بھی بس نام کے دریا بن گئے ہیں۔ ورنہ بچپن میں دریائے جہلم کو کئی دفعہ کناروں سے نکلتا طغیانی کی صورت میں گھروں میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اب تو ایسے نظارے کو آنکھیں مدتوں ترستیاں ہیں۔ جب کبھی جہلم جاؤں تو دریا کو دیکھ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ دریا کیا ہے؟ جابجا مٹی کے چھوٹے چھوٹے جزیزوں میں بٹا ہوا جیسے یہ دریا کی جوانی نہ ہو، دریا کا میدانی علاقہ نہ ہو ڈیلٹا ہو۔ دریائے سین کا حال ذرا مختلف قسم کا ہے۔ یہ ایک تہذیب یافتہ قوم کا دریا ہے۔ اس لئے اس کا حال وہی ہے جو فرانس کے زیر اطاعت قوموں کا تھا۔ مودب، مقید، محکوم و مجبور۔ یورپ میں تقریباً سبھی دریاؤں کا یہی حال دیکھا۔ اونچی اونچی دیواروں میں بند ہوتے ہوتے خاموشی اور سست رفتاری سے بہے چلے جا رہے ہیں۔ جا بجا ان پر اپنی اجارہ داری کی نمائش کے لئے پل بنا دیئے گئے ہیں۔ کشتیاں اور اسٹیمر چلتے ہیں۔ لوگ بیٹھتے ہیں اور ارد گرد کی کائی زدہ عمارتوں کو دیکھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ دریائے ٹیمز میں بھی ایسی کشتیاں چلتی ہیں۔ گائیڈ بتا رہی تھی کہ ہر پانچ سال کے بعد دریا کی ریت نکال کر صفائی کی جاتی ہے۔

Marfat.com

میں نے سوچا جو کچھ بھی کر دکم ہے. تم سے اس سے زیادہ کی توقع تھی ہمیں دیکھو، آج تک اپنے چھوٹے سے نالہ لیّ کو پابہ زنجیر نہیں کر سکے ہیں. اب آہستہ آہستہ رات کی پرچھائیاں بڑھ رہی تھیں" اگرچہ کشتی سے اترنے کے بعد کافی دیر تک دن رہا یعنی آٹھ بجے تک رات کا دُور دُور تک نشان نہ تھا. اندھیرا پھیلنے لگا تو ہم نے میزبانوں سے استدعا کی کہ اب گھر چلیئے. وہ کہنے لگے کہ بھلا پیرس آ کر رات کو سوتا کون ہے؟ رات کو جگمگاتا جھلملاتا پیرس نہ دیکھا تو کیا دیکھا. سڑک کے کنارے بنے ہوئے کیفے سے سینڈوچ لئے، بوتلیں پیتیں اور پھر سے تازہ دم ہو کر سیر کے لئے تیار ہو گئے. اب گاڑی روشنیوں کے جزیرے پر رواں دواں تھی. صبح کا منظر ایک دم بدل گیا تھا. رات کو پیرس نے بالکل ہی چولا بدل لیا تھا. جا بجا رنگین روشنیوں میں اچھلتے فوارے، جاگتی سڑکوں کے کنارے آباد کیفے، بقعۂ نور عمارتیں، غرضیکہ رونق ہی رونق! رات کو بھی دن کا سماں تھا. دن کو تو لوگ سنجیدہ، بردبار، اپنے کاموں میں مصروف معلوم ہو رہے تھے. رات کو سبھی عمر خیام کے چیلے لگ رہے تھے. پینا پلانا، گانا بجانا ہو رہا تھا. سڑکوں کے کنارے سیمنٹ کی بنی ہوئی کرسیوں پر بوڑھے بیٹھے جوانوں کی چہلوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے. جوان لڑکیاں اس آزادی سے گھوم رہی تھیں کہ اپنے ملک میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا.

ہمارے میزبانوں نے گاڑی RUE SAINT MARTE میں کھڑی کی اور پیدل گھمانے کے لئے چل پڑے کہ اصل لطف پیرس کی سڑکوں پر رات کو آوارہ گردی میں آتا ہے. اب آپ خود اندازہ لگایئے کہ پیرس کے کتنے روپ ہیں، کتنی شکلیں ہیں. سیاح کو پیرس کیسے کیسے چکر دیتا ہے. چلتے چلاتے ہم

Marfat.com

پومیڈوسنٹر کے سامنے ایک بنچ پر چپ کر بیٹھ گئے۔ کچھ فاصلے پر مختلف نسلوں کے لوگ ایک گروپ کی صورت میں بیٹھے گا رہے تھے، ساتھ ساتھ جب جوش میں آتے تو بوتلیں توڑ دیتے اور اُن کے چھناکے بھی میوزک کا حصّہ بن جاتے۔ رات کافی گزر چکی تھی، اس لئے واپسی کا ارادہ کیا۔ گھر پہنچے، کھانا کھایا اور یوں سوتے جیسے گھوڑے تو کیا سبھی اثاثہ بیچ کر فارغ ہو گئے ہیں ؎

بند آنکھیں ہوتی جاتی ہیں پسارے پاؤں
نیند سی نیند ہے ہمیں اب نہ اٹھانا لوگو!

یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

۸ر اگست ۱۹۸۳ء

آج صبح میں گھر پر رہی۔ سعادت سلیم اور بھائی رب نواز ڈاکٹر کے پاس چلے گئے۔ بھابھی پروین نے ایک ترکی ہمسائی بلائی تاکہ اس سے گپ شپ رہے۔ متعارف ہونے کے بعد وہ بار بار اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کچھ کہے، میری سمجھ میں خاک آنا تھا کہ زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم والا معاملہ تھا۔ پروین نے سمجھایا کہ کہہ رہی ہے "پاکستانیوں کی جگہ ہمارے دل میں ہے"۔ میں نے پروین سے کہا کہ اسے کہو اِدھر بھی یہی حال ہے۔ فرانس اور جرمنی دونوں ملکوں میں کافی تعداد میں ترکی آباد ہیں۔ مگر یہاں کاروبار زیادہ تر یہودیوں کے ہاتھ میں ہے۔ کل سیر کرتے ہوئے بھائی رب نواز نے TATTI نامی یہودی کی کافی دکانیں دکھائی تھیں۔ ترکی ہمسائی اب بچوں کا حال پوچھ رہی

Marfat.com

نفی ہیں نے تبایا کہ صبح ہی بات ہوتی ہے۔ سبھی ٹھیک ہیں۔ نام پوچھے۔
جب ہیں نے محمد علی کا نام لیا تو بڑی خوش ہوتی کہ میرے بیٹے کا بھی یہی نام
ہے کہنے لگی کہ میرا محمد علی بڑا شرارتی ہے۔ آپ کا کیسا ہے؟ میں نے کہا کہ
میرا بڑا سنجیدہ ہے آخر اس ترجمہ شدہ گفتگو سے ہم دونوں تنگ آگئے میں
نے رسالہ کی اوٹ میں پناہ لی اور پروین اور وہ تیز تیز گفتگو کرنے لگیں۔
دوپہر کو سلیم سعادت اور بھائی رب نواز واپس آئے تو پتہ چلا کہ ڈاکٹر نے
کہا ہے کہ آپریشن کی فی الحال ضرورت نہیں۔ آپریشن کے بعد ان کی زندگی
سات آٹھ سال ہوگی۔ اس لئے جب تک دل چلتا ہے چلنے دیں۔ جونہی خرابی
ہوگی فوراً آپریشن کر دیا جائے گا۔ پھر دل آئندہ سات آٹھ سال کے لئے
کار آمد ہو جائے گا۔ ڈاکٹروں کی باتیں ڈاکٹر ہی جانیں۔ سعادت بے حد خوش
ہے جب سے اس نے ہمیں دیکھا تھا، گھبرا رہا تھا۔ اب جو سنا ہے کہ دل نے
حالات سے ADJUST کر لیا ہے اور گولیاں کیپسول کھانے سے ہی ٹھیک
رہے گا تو خوب چہچہا رہا ہے۔ اس کی طبیعت خوش دیکھی تو ہم سب بھی
بے حد خوش ہوئے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد نپولین کی یادگار محراب
فتح ARCH OF TRIUMPH دیکھنے نکلے جہاں سے بارہ سڑکیں مختلف
سمتوں کو نکلتی ہیں۔ محرابِ فتح کے ایک طرف کار پارک کی اور پیدل گھومنے
نکلے۔ کیا بڑا چوک ہے جس کے بیچوں بیچ محراب فتح بنائی گئی ہے سڑکوں
پر ان کے نام درج ہیں۔ نقشے آویزاں ہیں۔ راستہ بھولنے کا تو سوال ہی
پیدا نہیں ہوتا۔ جان بوجھ کر بھولو تو الگ بات ہے۔ سڑک کے کنارے
کاریں پارک تھیں جو زیادہ تر فرانس کی بنی ہوتی تھیں یعنی رینالٹ،

Marfat.com

CITRERINA وغیرہ۔ جا بجا باغات، ان میں نصب فوارے، فواروں کے اندر مختلف قسم کے بت اور مچھلیاں جو پانی کی پھوار میں ہر وقت نہاتی رہتی ہیں۔ افریقہ کے حبشی دیکھے جو مصنوعی کبوتر اڑا رہے تھے اور ہر سیاح سے خریدنے کو کہہ رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر ستون نصب ہیں جن پر ننگے انسانی مجسمے نصب تھے۔ فرانس میں اکثر عمارتوں پر انسانی مجسمے بنے ہوتے تھے۔ اسٹیشن پر کئی پرانی عمارتوں پر فٹ فٹ کے فاصلے پر ایک مجسمہ ہوگا۔ پرانے لوگ کیسے کاریگر تھے کہ ہر جگہ اپنی صناعی دکھاتی ہے۔

شانزے لیزے کے آس پاس

وہاں سے آگے بڑھے اور شانزے لیزے میں چل نکلے۔ اس کے کیا کیا نہ چرچے سنے تھے۔ اگرچہ یہ پیرس کی دوسری سڑکوں سے کچھ خاص مختلف نہ تھی مگر شاید اپنے کیفوں اسٹورز کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہاں قریب ہی CONCORD SQUARE تھا۔ یہ چوک بھی اپنی مثال آپ تھا۔ پھولوں سے سجے پارک میں بیٹھنے کے لئے سکون بخش نشستیں، خوبصورت روشیں، سبزہ ہی سبزہ، ہر پارک میں جھلملاتا فوارہ، غرضیکہ فرانسیسیوں نے سیاحوں کو لبھانے کے لئے سارے گر، سارے داؤ آزماتے ہیں اور خوب آزماتے ہیں۔ کنکارڈ سکواتر کے نزدیک جو فوارا تھا اس میں انسانی مجسموں نے بڑی بڑی مچھلیاں پکڑی ہوئی تھیں جن کے منہ سے پانی اچھل کر فوارے کے اندرونی سائیڈ پر گرتا تھا جہاں ایک بڑا سا منقش تھال تھا جسے خوبصورت عورتوں نے اپنے سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ تھال کے اوپر بچوں کے مجسمے تھے جنہوں نے ایک اور چھوٹا تھال

Marfat.com

سر پر اٹھایا تھا۔ رات کے وقت جب پانی کے فوارے روشنی کی قوس قزح میں اٹھتے تھے تو ایک دلفریب منظر نظر آتا تھا۔ گھنٹوں بیٹھ کر دیکھتے رہیئے۔ آنکھیں تھکتی نہیں۔ لگتا تھا اوپر نیچے پگھلے ہوئے سونے کی بارش ہو رہی ہے۔

جرمن بھی پانی پیتے ہیں۔

کنکارڈ اسکوئر سے نکل کر شانزے لیزے کا ایک چکر اور لگایا۔ دل چاہتا تھا کہ پیرس کو خوب کھنگال ڈالیں جیسے جنگوں کے زمانے میں ایسے سنبھال کر رکھا گیا تھا جیسے کانچ کا ٹکڑا ہو۔ ٹھیس لگی تو ٹوٹ جائے گا۔ کہتے ہیں جنگِ عظیم دوئم میں متحدہ افواج کے کمانڈر نے پیرس اور اس کی یادگاروں کو بچانے کے لئے براہ راست پیرس کے اندر یا نزدیک جنگی کارروائی سے گریز کیا تھا۔ ورنہ آج یہ یادگارِ زمانہ عمارتیں نہ ہوتیں۔ حالانکہ ہٹلر کے واضح احکامات تھے کہ شہر واپس کرنے سے پہلے اسے آگ لگا دی جائے۔

چارلس ڈیگال اور جنرل آئیزن ہاور بھی خوب جانتے تھے کہ اگر جرمنوں سے پیرس چھڑوا لیا گیا تو ساری فوج پر اس کا بہترین اثر پڑے گا۔ لیکن وہ اسے روس کا لینن گراڈ نہیں بنانا چاہتے تھے۔ اس وقت اگر پیرس کو چھڑانے کے لئے جنگ کی جاتی تو آج اس کا سارا حسن تباہ ہو گیا ہوتا۔ ہٹلر کو بھی یقین تھا کہ پیرس کا ہاتھ سے نکلنا جرمن افواج کے لئے ایک تازیانہ سے کم نہ ہوگا۔ چنانچہ اس نے اپنے قابلِ اعتماد جرمن جنرل شالٹز CHOLTITZ کو پیرس کا کمانڈر بنا کر بھیجا اور کہا کہ پیرس کو محاذِ جنگ میں تبدیل کر دو اور کوئی خیال کئے بغیر اسے تباہ کر دو۔ جنرل شالٹز نے پہلے شہر کی ۲۰ ہزار پولیس کو ہتھیار ڈال

سے خالی کیا۔ پھر اسے ۲۴ اگست (کہاہے ناکہ ہمیشہ سے اہم تاریخ رہی ہے)، کو ہٹلر کا ڈائریکٹ حکم ملا کہ TOTAL DESTRUCTION کر دی جائے۔ مگر مکمل تباہی میں تمام سہولتیں بھی، جن میں بجلی پانی گیس وغیرہ شامل ہیں، تباہ ہو جاتی تھیں جب کہ جنرل شالٹز جانتا تھا کہ جرمن بھی پانی پیتے ہیں، گیس بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے ان چیزوں کی تباہی ناممکن تھی۔ پھر سپریم کمان سے یہ حکم آیا کہ دریائے سین کے ۴۵ پلوں کو گرا دیا جائے۔ لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ ہٹلر کی جہاں اور بہت سی خواہش پوری نہ ہوئیں اُن میں ایک یہ بھی تھی کہ پیرس تباہ و برباد متحدہ افواج کو ملے — جو ایسا نہ ہو سکا۔

SACRE-COEUR کا گرجا

شانزے لیزے سے نکلے تو SACRE-COEUR کا گرجا گھر دیکھنے چلے۔ پیرس کی ویو کارڈز میں عام طور پر تین تصویریں ضرور ہوتی ہیں۔ ایفل ٹاور، گرجا گھر، محرابِ فتح۔ یہ گرجا گھر بہت اونچی جگہ پر واقع ہے۔ آس پاس کا علاقہ پی گال کا بدنام علاقہ ہے۔ میزبان تو گرجا گھر کو بھی پی گال کا گرجا گھر کہہ رہے تھے۔ میرا تو پتھر کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے سانس پھول گیا۔ درمیان میں ایک چھوٹا سا میدان آیا جس میں پتھر کی بنچیں بنی ہوتی تھیں۔ گھاس پر لوگ بیٹھے شراب پی رہے تھے اور اس شعر کی مکمل تفسیر بنے ہوئے تھے ؎

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بتا دے جہاں پر خدا نہ ہو

Marfat.com

کچھ لوگ ستار بجا رہے تھے۔ ہاؤ ہو اور ناؤ نوش کا سلسلہ جاری تھا۔ لگتا ہی نہ تھا کہ خانۂ خدا میں جا رہے ہیں یا کسی شراب خانے میں۔ اصل میں شدتِ غم میں دو نام ہی سہارا دیتے ہیں، ایک ساقی کا ایک یزداں کا۔ اس لئے اس گھر میں دونوں نزدیک نزدیک تھے۔ عبادت گزار لوگ اوپر گرجا گھر میں جاکر سکون و طمانیت طلب کر رہے تھے۔ باہر شراب خانہ خراب انسانوں کو مست اور عقل سے بیگانہ کر رہی تھی۔ اگرچہ خانۂ خدا کے سامنے یہ بدتمیزی اور بے حیائی دل کو بے حد گراں گزر رہی مگر اللہ کی اللہ ہی جانے۔ کون جانتا ہے کہ یہ لوگ اسے کتنے عزیز ہوں گے کہ ان کی یہ حرکتیں بھی اس کے جلال کو آواز نہ دے رہی تھیں۔ بہرحال ہم لوگ گرجا گھر میں داخل ہوتے تو اندر کی فضا باہر سے بالکل الگ، پرسکون مقدس خاموشی سے پُرنور نظر آتی۔ کم کم روشنی تھی، موم بتیاں جل رہی تھیں میں نے بھی ایک موم بتی اٹھا کر جلائی کہ خانۂ خدا میں روشنی کرنا اپنا پرانا عقیدہ ہے۔ پچھلے دنوں اسد علی کی آنکھ پر کسی لڑکے نے شرارت سے ربڑ کھینچ کر مارا۔ آنکھ زخمی ہوگئی۔ خون بہنے لگا۔ میں سخت پریشان تھی۔ اسدؔ کو اس آنکھ سے دو دن بالکل کچھ نظر نہیں آیا۔ دو تین آئی اسپیشلسٹ کو دکھایا۔ سبھی نے یہی کہا کہ..... SEVERE EYE HAMARAGE ہوگیا ہے۔ آپا نے سنا تو جہلم سے فون پر کہا کہ منت مانو، اللہ پاک اپنے رسول پاکؐ کے صدقے بچے کی بینائی لوٹا دے تو تم اللہ اور اس کے رسولؐ کے گھر روشنی کرو گی۔ اب بھلا اللہ کو ہم غریبوں کی روشنی کرنے یا نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اللہ کا گھر رات کو بھی اتنا روشن ہوتا ہے کہ سوئی گرے تو نظر آجاتے، مگر میں نے

Marfat.com

صدقِ دل سے دعا کی اور منت مانی۔ اسی رات امی مرحومہ خواب میں آئیں۔ پھلوں سے بھری ٹوکری اٹھائے ہوتے تھیں۔ دو امرود دے کر بولیں۔ "مسرت اپنے گھر میں لگالو، لگ جائیں گے"۔ صبح اٹھی تو اسد کی بینائی لوٹ آئی تھی۔ اللہ کا کرم بے بہا اور رسولِ اکرمؐ کی سخاوت بے انتہا کہ اِن دو وسیلوں سے ہی مسلمانوں کی آبرو ہے، ورنہ جو کام ہمارے ہیں اُن کا صِلہ تو یہی ہے کہ زندہ درگور کر دیئے جائیں۔ چنانچہ پی گال کے گرجا گھر میں موم بتی جلاتے وقت دل میں اتنا گداز تھا کہ آنکھیں شدتِ عقیدت سے نم نم ہوگئیں۔ سلیم صاحب نے بھی ایک موم بتی روشن کی اور ہم کچھ دیر کے لئے نشستوں کی اگلی لائن میں بیٹھ گئے۔ سامنے حضرت عیسٰی علیہ السلام اور حضرت مریمؑ کے مجسمے تھے۔ گرجا گھر کی ساری چھت، دیواریں، کھڑکیاں، نقش و نگار، پُرکاری اور رنگوں کی سحر کاری سے مزیّن تھیں۔ ہمارا دھیان تو بس اس عظیم ذاتِ پُرجلال کی طرف تھا۔ ایک عجیب قسم کا سکون تھا کہ روح میں اترتا محسوس ہو رہا تھا۔ شاید یہ باہر کی واہیات فضا اور اندر کے پاکیزہ ماحول کے تضاد کا نتیجہ تھا۔ کافی دیر تک خاموش و ساکن بیٹھے رہے۔ کچھ سیڑھیاں چڑھ چڑھ کر تھکے ہوتے بھی تھے۔ پھر واپسی کے سفر کیلئے اُٹھے، باہر نکلے تو وہی بدمست قہقہے، بوتلیں شراب، گانا بجانا! ان کو نظر انداز کرتے ہوتے آگے بڑھے۔ واپسی کا سفر آسان تھا۔ ایک انگریزی ضرب المثل ہے:

IT IS EASY TO GO DOWN THAN UP,
BUT THE VIEW IS FROM THE TOP

تو واقعی جس نے اوپر چڑھنے کی کوشش نہیں کی اس نے زندگی کا صحیح

Marfat.com

لطف نہیں اٹھایا۔

خانہ بدوش سیاح

گر جب گھر سے جلدی جلدی نیچے اترے اور گاڑی میں جا کر ڈھیر ہو گئے۔ پھر گاڑی میں ہی بیٹھے بیٹھے پیرس کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے رہے۔ بھائی رب نواز نے ہمارے لئے فیکٹری سے چھٹی کر لی تھی، اس لئے وہی گائیڈ کا کام انجام دے رہے تھے۔ سڑکوں پر دو تین جگہ خانہ بدوش سیاحوں کو دیکھا کہ سارا سامان کندھوں پر لادے انگوٹھے سے اپنے سفر کی سمت اشارہ کر رہے تھے۔ حالت اُن کی اس قدر قابلِ رحم تھی کہ خدا کا لاکھ لاکھ بار شکر ادا کیا کہ ہم اللہ کی دنیا بھی دیکھ رہے ہیں مگر کس قدر آرام و اطمینان اور عزت کے ساتھ۔ اِن ٹورسٹ کے کپڑے بدبودار، جوتے پھٹے ہوتے اور حالت بوسیدہ جو اس بات کی غماز تھی کہ کھڑے کھڑے ان کی ٹانگیں شل ہو چکی ہیں۔ کچھ سامان پر بیٹھے بیٹھے ہی انگوٹھے سے اشارہ کر رہے تھے۔ میں نے کوئی گاڑی ان کے پاس رکتے نہ دیکھی۔ دوبارہ اسی سڑک سے دو تین گھنٹے کے بعد گزرنے کا اتفاق ہوا تو پہلے سے زیادہ جوڑے نظر آئے۔ لفٹ تو ان سب کو ضرور مل گئی ہوگی، مگر کتنی خواری کے بعد ـــ یہ تو وہی لوگ جانتے ہیں جو اِن حالات سے گزرتے ہیں۔ کتابوں میں ایسے لوگوں کا حال پڑھ کر بہت ADVENTUROUS سا محسوس کرتی تھی۔ مگر عملی طور پر ان کی حالت دیکھی تو توبہ کی۔ خدا زندگی بھر ایسا سفر نہ کرائے۔ آمین!

Marfat.com

فرانسیسی ریسٹورنٹ

اب بھائی رب نواز ایک اپنی مدد آپ قسم کے ریسٹورنٹ میں لے گئے۔ سلیم اُن کی ڈشسز کو دیکھیں اور ناک سکوڑیں۔ آخر ایک کیک پیس اور کوکا کولا کی بوتل لے کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ میں نے مچھلی لی، مگر وہ ایسی پکی ہوتی تھی کہ بدمزہ لگی۔ سعادت نے روسٹ مرغ لیا، مگر وہ بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوا تھا اور کھا نہیں رہا تھا۔ سلیم صاحب ہماری پلیٹوں کی طرف دیکھیں اور مسکرائیں۔ میں نے سعادت سے پوچھا کہ کھاتے کیوں نہیں؟ کہنے لگا کچا ہے۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ آپ کیوں نہیں کھا رہی ہیں۔ میں نے کہا کہ گھی میں زیادہ تل دیا گیا ہے۔ یہ ریسٹورنٹ پیرس کے ایک بارونق چوک میں تھا۔ نام میں نے نہیں پوچھا نہ ہی کوئی ایسی قابلِ ذکر چیز تھی کہ یاد رکھتے۔ البتہ بدمزہ ہو کر باہر نکلے، پھرتے پھراتے گھر پہنچے جہاں پروین نے دنیا جہاں کی نعمتیں دیسی کھانوں کی صورت میں ہمارے لئے بنا کر رکھی تھیں۔ کھائیں اور خدا کا شکر بجا لائیں۔ ہمیں صبح کے ناشتے پر بھابھی پروین پراٹھے بنا کر دیتی تھیں، مگر جو فرانسیسی ڈبل روٹی ساتھ رکھتی تھیں وہ عجوبۂ روزگار تھی۔ لمبی ڈنڈا نما سخت قسم کی چیز تھی۔ انگلینڈ میں ایسی نرم، لذیذ، ملائم ڈبل روٹی کھاتی تھی کہ اس کا مزا مدتوں یاد رہے گا۔ مگر یہاں کی ڈیڑھ دو فٹ کی سخت ڈبل روٹی حیران کر دیتی تھی۔ نہ انگلینڈ والوں نے فرانس کی ڈبل روٹی استعمال کی نہ فرانس نے انگلینڈ والوں کی۔ روٹی کے معاملے میں دونوں نے اپنا تشخص برقرار رکھا ہے۔

کھانا کھانے کے بعد سلیم نے اعلان کیا کہ صبح ہم لوگ انگلینڈ واپس

Marfat.com

جائیں گے۔ میزبان بوکھلا گئے کہ ابھی تو پیرس میں بے انتہا یادگاریں ہیں، محل ہیں۔ ابھی سے روانگی کیوں ہے؟ فرانس کون سا بار بار آنا ہے۔ اپنا گھر ہے، دیکھئے۔ مگر سلیم کی ایک ہی رٹ "میں نے مانوں"!

میٹرو

چنانچہ انہوں نے ہمیں آرام کرنے نہ دیا کہ اگر جانا ہے تو چلیں، فرانس کی میٹرو دیکھیں۔ یہ زمین دوز گاڑیاں ہیں۔ وہ ہمیں اسٹیشن لے گئے۔ خود کار سیڑھیاں چل رہی تھیں۔ نیچے ہی نیچے زمین کے پیٹ میں اترتے چلے جاتے۔ نہ حبس کا شائبہ نہ دم گھٹنے کی شکایت۔ ہر اسٹیشن پر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی COVERED MARKET ہو۔ زیرِ زمین چوتھی پانچویں چھٹی منزل تھی مگر ہوا دار، صاف شفاف، روشن اور نکھری ہوئی۔ پیرس میں میٹرو کے اسٹیشن سات منزل تک ہیں مگر کہیں بھی آکسیجن کی کمی کی شکایت محسوس نہیں ہوتی۔ ہر اسٹیشن پر لوگوں کا اژدھام تھا، دوکانیں تھیں، سوئیٹزر بک رہے تھے لوگ آجا رہے تھے۔ ذہن انسانی کی یہ عجیب و غریب اختراع سوچیں تو انسان ششدر رہ جاتا ہے۔ اتنی بھاری بھاری گاڑیاں چل رہی ہیں۔ اندر سے زمین کھوکھلی، سارا پیرس کھوکھلے ڈھانچے پر کھڑا ہے اگر جنگِ عظیم میں ایک بم بھی گرتا تو وہ تباہی ہوتی کہ الامان والحفیظ! جانے ہم لوگ ان کے طریقوں کو کیوں نہیں اپناتے۔ وہاں سے واپس آنے پر پاکستان میں بھی میرا دل چاہتا ہے کہ وہی سہولتیں ہوں کم از کم راولپنڈی میں فیض آباد سے صدر تک ہی زمین دوز راستہ بن جائے۔ بعد میں گورنمنٹ ٹیکس لگا کر خرچ نکال سکتی ہے کسی پرائیویٹ

Marfat.com

فرم کو یہ کام سپرد کردے سو وہ اپنا منافع کمانے کے بعد یہ زمین دوز شاہراہ گورنمنٹ کے سپرد کردے۔ کچھ تو کیا جاتے کہ تین چار سال بعد یہ ٹریفک مری روڈ کی استطاعت سے باہر ہوگی۔ میٹرو اسٹیشن سے گھوم پھر کر نکلے تو رات کافی بھیگ چکی تھی۔ واپسی پر سٹرک پر پہلے جیسی رونق نہ تھی۔ گھر پہنچے تو اتنے تھک چکے تھے کہ بستر پر لیٹتے ہی نیند نے آن دبوچا۔ ہمارا حال تو یہ ہے ؎

نیند آتی نہیں پھولوں پہ خردمندوں کو
ہم تو دیوانے ہیں کانٹوں پہ بھی سو سکتے ہیں!

یہ تو سلیم صاحب ہی ہیں کہ فرانس، انگلینڈ، جرمنی کے نرم اسپرنگ دار فوم والے بستروں پر بھی راتیں جاگ کر گزارتے تھے۔ ہمارا سولی پر چڑھ کر سونے کا تجربہ نہیں، مگر اندازہ ہے کہ نیند وہاں بھی آسکتی ہے۔

فرانسیسی سٹور

۹ راگست ۱۹۸۳ء

آج فرانس سے مراجعت تھی، اس لئے جلدی جلدی سامان باندھا۔ سلیم تو دوستوں سے گپ شپ میں مصروف تھے۔ میں نے چپکے سے سعادت سے کہا کہ چلو کسی سٹور میں لے چلو کچھ شاپنگ تو کروں۔ شانزے لیزے اسٹور اور اس کے آس پاس اسٹورز میں تو دو ہزار ڈیڑھ ہزار کی سوتی قیمضیں دیکھی تھیں۔ وہاں تو خریدنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اب سعادت کے ہمراہ چلے۔ وہ اب فرانسیسی زبان بخوبی جانتا ہے وہ مجھے بسوں میں چڑھاتا،

Marfat.com

اتار رتا LA ESPRANCE نامی خوبصورت اسٹور میں لے گیا۔ دکان کی وسعت، سامان کی فراوانی اور اپنی تنگ دامانی کا کیا حال بیان کروں کہ یہ چیز تو ہر جگہ محسوس ہوتی ہے۔ جہاں جہاں بھی گئے، ہر جگہ کے اسٹورز ایک جیسی فضائیں لئے ہوتے تھے۔ خرید و فروخت کے مرکز میں رقمیں لوگوں کی جیب سے ابل ابل کر نکل رہی تھیں۔ شاپنگ بیگ بھرتے جا رہے تھے۔ کاؤنٹر پر بیٹھنے والی لڑکیاں ہزاروں کا مال لینے والوں کے لئے بھی روٹین میں ایک ننھا سا "THANKS" کہہ رہی تھیں۔ خریدنے والوں کو احساسِ زیاں نہ تھا بلکہ ایک قسم کا اطمینان و سرخروئی تھی اور بیچنے والوں کو خوشی و مسرت نہ تھی، فرض کی ادائیگی تھی۔ وہاں اپنے ملک کے بالکل برعکس حالات تھے۔ کہاں اپنا پاکستان کہ ہزار کہاں، اگر سینکڑوں میں بھی مال لیں تو دکاندار اتنی جی حضوری کرے گا جیسے مال خرید کر اسے خرید لیا ہے۔ رقم دیتے وقت ہماری گردن احساس تفاخر سے زرافہ کی گردن بن جاتی ہے۔ جناب اپنے ملک کی کیا بات ہے۔ ہمارے ایک ملنے والے امریکہ سے اچھی بھلی ڈالروں والی نوکری چھوڑ کر آئے تو ہم تعزیت کے لئے گئے کہ کہیں تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ لوگ تو وہاں جانے کیلئے ترستے ہیں اور تم سارے عیش آرام بمعہ گرین کارڈ اور ڈالروں کو چھوڑ کر یہاں آن بسے ہو۔ کیا وہاں کچھ کمی تھی جو یہ احمقانہ حرکت کی۔ انہوں نے کہا کہ "سبھی کچھ تھا۔ خوبصورت گھر، بڑی گاڑی، لمبی تنخواہ، اتنی کہ یہاں سارا سال گدھے کی طرح کام کروں تو بھی نہ کما سکوں۔ مگر میری "شناخت" نہ تھی۔ کوئی مجھے جانتا نہ تھا۔ یہاں گھر سے نکلتا ہوں تو "سلام صاب جی" کی آوازیں آتی ہیں۔ دفتر جاتا ہوں تو چپڑاسی سے لے کر سیکرٹری تک سبھی میرے حالات

Marfat.com

سے واقف ہیں اور میرے خاندان کو جانتے ہیں۔ بازار جاتا ہوں تو دکاندار عزت و احترام سے بات کرتا ہے۔ حال احوال پوچھتا ہے۔ یہاں لوگ مجھے جانتے ہیں۔ یہی میرا مقام ہے، یہی میری زمین ہے۔ یہاں کی فضا میں محبت اور خلوص کی حدت ہے۔ وہاں کی فضا بے مروت ہے۔ ہمسائے کو ہمسائے کا پتہ نہیں۔ وہ دنیا زندوں کی دنیا ہے اور یہ دنیا بوڑھوں، بچوں، معذوروں سبھی کی ہے بھلا ان ملکوں میں کیا رہنا۔ یہاں ہم سب ایک بندھن میں پیوستہ ہیں اور وہ ہے ہمدردی اور بھائی چارے کا بندھن، دوستی و شناسائی کا ناطہ مگر وہاں بے اعتنائی، اجنبیت، بے چارگی اپنا مقدر ہیں۔ اب بتاؤ کہ ہم نے یہاں آنے میں بیوقوفی کی یا عقلمندی؟" ہم بھلا کیا جواب دیتے۔ تعزیت کے لئے گئے تھے، تہنیت و مبارک دے کر لوٹے۔

بات شاپنگ کی ہو رہی تھی، خیالات بھٹک کر کہاں جا نکلے۔ اسٹور سے ایک دو کلون لئے، ایک دو سوئیٹر لئے اور واپسی کے لئے مڑے۔ سلیم صاحب ابھی تک گپ شپ میں مصروف تھے۔ پہلے یہ فیصلہ ہوا کہ ہوائی جہاز سے انگلینڈ جایا جائے۔ چنانچہ بھائی رب نواز ہمیں لے کر چارلس ڈی گال ایئرپورٹ چلے۔ راستے میں ایک فرانسیسی ٹریفک کے سپاہی نے کاغذات کی جانچ پڑتال کے لئے روک لیا۔ پہلے سیلوٹ مارا، پھر SIR کہہ کر کاغذات طلب کئے۔ بڑی حیرانی ہوئی۔ ایئرپورٹ پہنچے، گول سی عمارت ہے اوپر پارکنگ اور دفاتر ہیں، نیچے ایئرپورٹ ہے۔ اتنی رونق نہ تھی جتنی فرینکفرٹ یا لندن میں دیکھی تھی۔ کرایہ پتہ کیا تو ۹۰۰ (۲۵۰۰ روپے) فرانک فی آدمی تھا جب کہ ہم دونوں کل چھتیس پونڈ (۷۲۰ روپے) میں کوچ کے ذریعے پہنچے تھے اور سفر بھی خوشگوار

Marfat.com

تھا۔ وہاں سے نکلے کہ ٹرین کے ذریعے واپس جاتے ہیں۔ آخر اپنا جیب خرچ بھی تو ملحوظِ خاطر تھا۔ واپسی سفر میں CITREON فیکٹری بھی نظر آئی۔ سینکڑوں رنگ برنگی کاریں کھڑی تھیں۔ ایئرپورٹ سے GARE-DE PARIS NORD پہنچے، ہم دونوں کا ٹکٹ ۶۰۰ فرانک (تقریباً ۱۶۰۰ روپے) کا ملا، یعنی بیٹھے بٹھائے ۱۲۰۰ فرانک کی بچت ہوگئی۔

اسٹیشن پر ہمارے اسٹیشنوں والا شوروغل بپا تھا۔ دوکانیں تھیں، رسالوں، کتابوں اور سووینیئر سے بھری ہوئی۔ جابجا گھڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہاں بھی ایئرپورٹ کی مانند ننھے منے بورڈز آویزاں تھے جن پر پلیٹ فارم نمبر، گاڑی کی منزل اور آمدورفت کا وقت درج تھا۔ یہاں سے گاڑیاں فرینکفرٹ، کوپن ہیگن اور روم کے لئے جا رہی تھیں۔ وقت ہوتا تو روم والی گاڑی پکڑ لیتے کہ ویزا بھی لگوایا تھا، مگر سعادت اور بھائی رب نواز کو خدا حافظ کہا اور پیرس کو الوداع کہتے ہوئے واپس لندن چل پڑے ؎

سیر کی خوب پھرے پھول چنے شاد رہے
باغباں جاتے ہیں گلشن ترا آباد رہے

سفرِ مراجعت

پیرس سے نکلے تو پھر AMIENS کا اسٹیشن آیا۔ یہ شہر اردگرد کے زرخیز علاقے کی مشہور منڈی ہے۔ یہیں دریائے سوم مختلف شاخوں میں بٹ جاتا ہے اور علاقے کی زرخیزی میں نمایاں کردار ادا کرتے ہوئے سمندر میں گر جاتا ہے۔ پھر ABBEVILLE آیا۔ خوبصورت گھر، پھولوں سے لدے باغیچے،

Marfat.com

سرخ چھتوں کے کھپریل والے بنگلے بتا رہے تھے کہ یہ خوبصورت جگہ ہے۔ بعض گھروں کے باہر TRAILORS والی تفریحی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اُن دنوں تفریحی موسم تھا۔ اجنبی پیرس کی سڑکوں اور گلیوں میں پھر رہے تھے اور فرانسیسی باہر کے ملکوں کی سیر کو نکلے تھے۔ بھائی رب نواز کے دو بچے بھی وکانس پر گئے ہوئے تھے۔ میں یہی سمجھتی رہی کہ وکانس فرانس کی کوئی جگہ یا شہر ہوگا مگر کافی دیر کے بعد پتہ چلا کہ وکانس کا مطلب چھٹیاں ہیں، اور چھٹیوں میں استاد بچوں کو لے کر تفریح کے لئے چل نکلتے ہیں۔ راستے میں سرو وسفیدے کے بے شمار درخت نظر آتے؛ حتیٰ کہ کھیتوں کی باڑ کے طور پر بھی سرو نگہبانی کر رہے تھے۔ ٹرین بعض اوقات سڑک کے ساتھ ساتھ گزرتی تو بے شمار گاڑیاں رواں دواں نظر آتیں، مگر ایسا اتفاق کم ہی ہوتا۔ زیادہ تر سفر کھیتوں کے درمیان ہوتا رہا۔

ہماری گاڑی پیرس سے پانچ بجے چلی۔ ۷ بجے سلیم صاحب پانی کے لئے تڑپنے لگے۔ مجھے یہی ڈر کہ کہیں کسی اسٹیشن پر ڈرنک لینے نہ اتر جائیں۔ یورپ میں پانی ملنا ناممکنات میں سے ہے، یوں سمجھ لیجئے کہ یورپ بھی کربلا کا ایک وسیع میدان ہے جہاں پانی نہیں ملتا۔ بس آدمی ڈرنکس پر زندہ ہے۔

ہماری گاڑی پیرس سے پانچ بجے چلی؛ کھانے پر، ناشتہ پر اورنج جوس، کوکاکولا، سیون اپ اور سپرائٹ پی جا رہی ہیں۔ روٹی سالن کے ساتھ ڈرنکس تو مجھے اچھی نہ لگتی تھی، مگر سبھی پیتے تھے۔ پیرس سے چلتے وقت سعادت نے کہا کہ ٹرین میں ڈائننگ کار ہوگی۔ کوچ اور ٹرین دونوں کے سفر میں لوگ ڈرنکس اور برگر وغیرہ اپنے ہمراہ لاتے تھے، مگر ہم دونوں طرف سے بھوک و پیاس سے مارے گئے۔ بہر حال یہ یقین تھا کہ فیری میں سبھی کچھ ملے گا تب کے لئے برداشت بہترین نسخہ ہے۔ BOULOGN آیا تو دل کو ڈھارس بندھی کہ اب CALAIS نزدیک ہے

ہے۔ کالی کالی چمنیاں نظر آئیں تو پتہ چلا کہ کیلے پہنچ گئے۔ جیسے ہی ہماری ٹرین رکی ایک اور ٹرین واپس پیرس کے لئے روانہ ہوگئی۔ وہاں سے ہم لوگوں کو SEALINK نامی فیری میں سوار کرایا گیا۔ سلیم صاحب نے کچھ کھایا پیا اور میرے لئے بھی لے آئے۔ میں نے سمندر کے شوق میں شیشے والی کھڑکی سے پیوستہ نشست لے لی۔ حدِ نگاہ تک سمندر، دھواں دھواں سا افق اور فیری کی لہروں سے ٹکرانے کی آواز، پھر باہر سیاہ اندھیرا چھا گیا۔ اب تو شیشے سے اپنی شکل ہی گھورتی دکھائی دینے لگی۔ ایک دو بار کسی فیری کی بتیاں نظر آئیں تو اکتا کر میں بھی اندر کے پُر رونق ماحول کی طرف متوجہ ہوئی۔ دس بجے ڈور "سوڈدر" (DOVER) کی بتیاں نظر آئیں۔ اب تبوں سے روشن ایک جہاز بھی گزرا جو مخالف سمت جا رہا تھا۔ ڈوور اترے تو ایک بس میں بٹھا کر ڈوور اسٹیشن لے جایا گیا۔ کتنی ہی جوان لڑکیاں اور لڑکے ہم سفر تھے۔ بیگ پشت پر لٹکائے گیس لگانے ایک دھن میں محو تھے کہ سفر در سفر چلتے رہو۔ چلنا مدام چلنا ہی زندگی ہے۔ اب لندن کا وقت ساڑھے گیارہ بجے رات تھا۔ سب سے پہلے GILLINGHAM آیا۔ پھر CANTERBERRY آیا۔ یہاں میری ماموں زاد بہن رہتی ہے مگر اسے کیا علم کہ ہم گزرے جا رہے ہیں۔ رکنا چاہتے بھی تو رک نہیں سکتے تھے۔ اسٹیشن کے نام کا اعلان ہوتا مسافر سامان سنبھالتے اور اترتے جاتے۔ گاڑی گھپ اندھیرے میں سفر کر رہی تھی۔ اسٹیشن آتا تو روشنیوں سے منور جگہ دیکھتے، ورنہ دور دور ٹمٹماتی روشنیاں پلکیں جھپکتی دکھائی دیتیں۔ خدا خدا کر کے لندن آیا۔ رات کے ۲/۱-۱۲ بج چکے تھے۔ سعادت نے انجم کو اطلاع کر دی تھی۔ وہ آن پہنچا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک گونہ اطمینان ہوا۔ سوتے جاگتے گھر پہنچے اور بستر پر لیٹتے ہی بے سدھ پڑ گئے۔

Marfat.com

وقفہ بہت ضروری ہے

۱۰ راگست ۱۹۸۳ء

آج سخت تھکاوٹ تھی، اس لئے دن چڑھے تک سوتے رہے کشور نے ملنے ملانے والوں کو ہماری واپسی کی اطلاع کردی تھی اور یہ بھی بتادیا تھا کہ ان بھگوڑوں کا کچھ پتہ نہیں. کب چل نکلیں. جسے ملنا ہو کل آجاؤ. پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی. چنانچہ جب اٹھے تو عزیزوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا یعنی آج سیر و سیاحت کا وقفہ تھا. دوپہر کا کھانا اکٹھے کھایا. شام کو ایک ایک کرکے سب چلے گئے. بقایا وقت بھی بڑے آرام سے گزرا. رات آئی تو طبیعت تر و تازہ تھی. پاکستان بچوں سے گفتگو ہو چکی تھی. اس لئے دل کو اطمینان حاصل تھا کشور کا گھر خاصی اونچی جگہ واقع ہے، اس لئے رات کو دُور دُور تک پھیلی بتیاں دن کو چھوٹے چھوٹے مکانوں کا روپ دھار لیتی ہیں. یہاں سیر کرنے کا بھی بڑا مزا آتا تھا. صبح نکلو یا رات کو. دل کو خوشی، ذہن کو طراوت، نظر کو تازگی ملتی تھی. رات کا کھانا کھا کر آج کشور سے باتیں کرتے رہے. اس گھر میں صرف کشور بولتی ہے. باقی چار افراد سمجھئے گونگے ہیں. ان کی آوازیں آپ بہت کم سنیں گے. بولنے کا ڈیپارٹمنٹ کشور کے حوالے ہے. وہ ہم سے بھی بڑا زچ ہوتی تھی کہ ہم لوگ سکون سے بیٹھ کر باتیں کیوں نہیں کرتے. مگر ہم کو معلوم تھا اب کے جو فرصت ملی ہے شاید آئندہ ملے یا نہ ملے. ان فرصت کے دنوں سے جتنا فائدہ اٹھالیں

Marfat.com

کم ہے۔ اب فیض صاحب کی طرح یہ کہنے سے تو رہے ؎

اِک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

اللہ میاں اگر یہ اپنی نوازش نہ کرتا تو ہمیں کیا کر لینا تھا۔ اور اب یہ موقع دیا ہے تو رُواں رُواں شکر گزار ہے۔ اس کی دنیا کو دیکھتے پھرتے ہیں۔ خوش نصیب ہیں ہم لوگ! ہمارا تو پردیس میں بس یہی کام ہے ؎

ٹک دیکھ لیا دل شاد کیا خوش وقت ہوئے اور چل نکلے

(میٹر)

شکر ہے باری تعالیٰ کا کہ سارے سفر میں ہم دونوں میں سے کوئی بھی بیمار نہ ہوا۔ مجھے اپنا ہی خطرہ تھا۔ میرا زکام مینڈکی والا ہوتا ہے۔ سارا سال چلتا ہے۔ مگر سفر کے ان دنوں میں اللہ کا فضل و کرم رہا کہ زکام بھی جان چھوڑ گیا۔ پھر بلڈ پریشر کی شکایت ہے۔ اس کی بھی تکلیف نہ ہوتی ورنہ یہ حال ہوتا کہ ؎

خود لنگوں سا رہم سفر بیزار
اک ستم ہے شکستہ پا ہونا !

Marfat.com

لندن کی پاپیادہ سیاحت

۱۱ اگست ۱۹۸۲ء

دنیا میں جس شہر بے مثال کا سب سے زیادہ چرچا ہے اور جس کا نام ہوش سنبھالتے ہی میں نے سنا، وہ لندن ہے۔ دریائے ٹیمز کے کنارے واقع یہ شہر دنیا کے دلکش ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ وہی ٹیمز جس پر واقع پل کے ٹوٹنے کا ذکر نرسری رائیمز میں پڑھا تھا:

LONDON BRIDGE IS BROKEN DOWN

DANCE OVER MY LADY LEE.

لندن میں نئی اور پرانی روایات ہاتھ میں ہاتھ دیئے چلتی ہیں۔ یہ جدید وقدیم کا سنگم ہے مختلف تہذیبوں کا گہوارہ ہے۔ تضادات کا مجموعہ ہے۔ یہاں جمہوری اداروں کا احترام بھی ہے، بادشاہت سے محبت بھی! بچپن میں ایک قول پڑھا تھا کہ آئندہ دنیا میں صرف پانچ بادشاہ ہوں گے۔ چار تاش کے، پانچواں برطانیہ کا۔ کہیں جدید عمارتیں ہیں تو کہیں مضبوط پتھر سے بنی نقش ونگار سے مزین، بتوں سے آراستہ پرانی بلڈنگز ہیں۔ یہاں دنیا بھر کے دھتکارے ہوئے لوگوں کو پناہ ملتی ہے اور کبھی اپنوں

Marfat.com

کے لئے روزگار نہیں ہوتا۔ لندن کی اسیّ لاکھ کی آبادی میں زیادہ تر بے روزگار ہیں جس سے جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے، برائیاں جڑ پکڑ رہی ہیں لیکن پھر بھی لندن نیویارک کے مقابلے میں "مرد شریف" کہلانے کا مستحق ہے۔ لندن دنیا کے تین بڑے شہروں میں سے ایک ہے۔ صرف ٹوکیو اس سے زیادہ آبادی کا حامل ہے۔

لندن نہ صرف دنیا کا بڑا شہر ہے بلکہ قدیم ترین بھی ہے ۔اس کی کہانی دو ہزار سال پرانی ہے۔ جب یہ رومن سلطنت کا ایک حصہ ہوا کرتا تھا اور دریائے ٹیمز کے کنارے واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس وقت دریا اتنا کم گہرا اور اتنا کم چوڑا ہوا کرتا تھا کہ لوگ چل کر پار کر لیا کرتے تھے۔ جب رومن چلے گئے اور انگلینڈ کی اپنی سلطنت بنی تو لندن دارالخلافہ بن گیا۔ مدوجزر، اسٹیمرز اور جہازوں کو سمندر سے ۶۰ میل کے فاصلے پر لندن کے نزدیک لے آتے۔ یوں اس کی اہمیت بڑھ گئی اور یہ شہر پھیلتا چلا گیا۔ آجکل یہاں دنیا کے بڑے بڑے بینک، تجارتی ادارے، فیکٹریاں اور کارخانے ہیں۔ لیکن یہ نیویارک سے آج بھی مختلف ہے۔ یہاں چھوٹی چھوٹی گلیاں بھی ہیں اور نیویارک کی طرح سکائی سکریپرز بھی موجود نہیں کیونکہ لندن کی زمین اسکائی سکریپرز کیلئے GOOD FOOTING مہیا نہیں کرتی۔ اس لئے شہر کو پھیلنا ہے، اوپر نہیں بڑھنا، پرانے زمانے میں برٹش ایمپائر بھی پھیلتی چلی گئی۔ ایلزبتھ اول کے زمانے میں بے شمار برطانوی نئی نئی زمین حاصل کرنے ملک سے چل نکلے۔ کچھ ملکوں کو دریافت کیا، کچھ کو مقامی لوگوں سے بزور بازو چھینا، کہیں بغاوتیں کروائیں، کہیں سازشیں کیں۔ نتیجہ" دنیا کی

Marfat.com

وہ عظیم ترین سلطنت وجود میں آئی جہاں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا۔ اصل برطانیہ ۵۵۰۰ چھوٹے چھوٹے جزیروں پر مشتمل ہے جس میں بس دو بڑے جزیرے ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ سلطنت سمٹ سمٹا کر ان جزیروں میں منہ چھپا رہی ہے پھر بھی حکومت نے اس دیس کے باسیوں کے لئے بلا امتیاز ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ بے روزگاروں کے بھی پنشن ہیں۔ کام کرنے والوں کو بھی سہولتیں ہیں۔ اِن کا سوشل سسٹم ایسا ہے کہ حکومت ہر فرد کی پنگھوڑے سے لے کر قبر تک FROM THE CRADLE TO THE GRAVE) خبر گیری کرتی ہے۔ اور اس میں کسی قسم کا شبہ نہیں کہ پہلے نکھٹو اور نکھٹو سونے کی چڑیا ہندوستان میں آکر ٹھیک ہو جاتے تھے۔ آج کل ہماری ایسی ہی پود کے لئے برطانیہ پناہ گاہ ہے۔

بچپن میں جب میں آٹھ سال کی تھی تو بھائی اختر پاکستان سے لندن کے لئے روانہ ہوتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کتنی تصویریں ٹرافالگر اسکوائر، گرین وچ ویج، ہائیڈ پارک، ونڈسر کاسل، بکھنگم پیلس اور کیو گارڈن وغیرہ میں کھنچوا کر بھیجی تھیں۔ اِن جگہوں سے پرانی آشنائی تھی، اب حقیقت میں دیکھنے کا وقت آیا تھا۔ برطانیہ کے سفر میں، میں اُن جگہوں پر جانا چاہتی تھی جہاں جہاں انہوں نے قدم رکھے تھے جانے کتنے لوگ ان جگہوں پر آتے، مگر ان کروڑوں لوگوں میں ایک وہ بھی تھے جو عزیز از جان تھے۔ انسان دنیا سے چلا جاتا ہے مگر اس کی یاد دل میں کانٹے کی طرح چبھتی رہتی ہے۔ اس خیال سے کہ جانے پھر موقع ملے نہ ملے، گاڑی کا بھی انتظام نہ کیا۔ کشور کے لڑکے خاور کو ہمراہ لیا اور بسوں کے ذریعے سفر کرتے ٹرافالگر

Marfat.com

اسکوائر آپہنچے۔ یہ مشہور زمانہ اسکوائر لارڈ نیلسن کی یاد میں بنایا گیا تھا جو فل یونیفارم میں ۱۷۰ فٹ لمبے کالم پر سترہ فٹ لمبے مجسمے کی صورت میں پتھر بنا کھڑا ہے۔ کہتے ہیں اس کے مجسمے کو اتنا اونچا اس لئے بنایا گیا ہے تاکہ اس کی نگاہ سمندر پر پڑ سکے نیلسن سمندری فتوحات کا بادشاہ تھا اور سمندروں کے باسی کو سمندر کے نظارے سے محروم کرنا کور ذوقی تھا چنانچہ دنیا بھر کے سیاح یہاں آتے ہیں اور اسے دیکھتے ہیں۔

پیرس کے کنکارڈ اسکوائر کی طرح یہاں ہر وقت لوگوں کا ایک اژدہام ہوتا ہے۔ فواروں کے گرد بے شمار کبوتر سیاحوں کے ہاتھوں سے دانہ کھاتے اڑتے پھر رہے تھے۔ بھائی اختر نے کبوتروں کے ساتھ، نیلسن کے مجسمے کے نیچے بنے ہوئے شیروں کے بت کے ساتھ، فوارے کے نزدیک کتنی تصویریں کھنچوا کر بھیجی تھیں۔ آج میں پرنم آنکھیں لئے تصور میں اُن کو یہاں کھڑے دیکھ رہی تھی۔ اُن کی وفات بھی لندن میں ہوتی تھی۔ اور ہمارے

؎ باغ سنسان ہو گیا ناقر — آج وہ گل خزاں نے چھین لیا

موت کی اطلاع کے چار دن بعد ان کی میت پاکستان پہنچی۔ میں ان چار دنوں میں یہی سوچتی تھی کہ جب بھائی اختر کو لاش کی شکل میں دیکھوں گی تو میرا کلیجہ غم سے پھٹ جائے گا کن آنکھوں سے بھائی کا زندگی سے محروم جسم دیکھ پاؤں گی۔ مگر خدا جو کچھ دکھاتے انسان ناچار دیکھتا ہے۔ امی کی دلدوز چیخیں، غم بھری صدائیں، بہنوں کی آہ وزاریاں، لوگوں کی جوان موت پر پرنم آنکھیں آج بھی یاد آتی ہیں۔ تو دل دہل جاتا ہے ؎

پھر نہ آتے جو ہوتے خاک میں آسودہ
غالباً زیر زمیں میرؔ ہے آرام بہت

Marfat.com

ٹراف لگر اسکوائر سے آگے بڑھے تو
۱۰ ڈوننگ اسٹریٹ دیکھی، عام سی اسٹریٹ تھی۔ اس میں ایک مکان کے گیٹ پر دو سپاہی کھڑے تھے۔ بس یہی بات اسے دیگر مکانوں سے ممیّز کرتی تھی۔ مسز تھیچر اُسی دن آنکھ کے آپریشن سے واپس آئی تھیں۔ سوچا تو تھا کہ بیمار پرسی کریں، مگر وقت کی کمی تھی۔ پھر دل کو سمجھایا کہ ایسی فضول خواہش نہ کیا کر کہ ہر خواہش پر دم نکلے، ورنہ بے دم ہو جاؤ گے۔ گھومتے پھرتے بکھنگم پیلیس آن پہنچے۔ دیکھا شاہی جھنڈا لہرا رہا ہے، یعنی ملکہ عالیہ بھی محل میں تشریف فرما ہیں۔ دل تو چاہتا تھا کہ انہیں بھی شرفِ ملاقات بخشیں مگر بھلا ہو عقل کا۔ اس نے اس دن دل کا ساتھ نہ چھوڑا اور پاسبانی کے فرائض انجام دیتی رہی۔

بکھنگم پیلیس جو باوجودیکہ ۱۷۶۱ء سے رائیل فیملی کے قبضے میں ہے اپنے بانی کے نام سے مشہور ہے۔ ڈیوک آف بکھنگم نے یہ محل اپنے لئے ۱۷۰۲ء میں بنوایا تھا جسے جارج تھرڈ نے شاہی خاندان کے تصرف کے لئے خرید لیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک جتنے بھی بادشاہ آتے، سبھی نے اپنے ٹیسٹ اور خواہش کے مطابق اس میں تبدیلیاں کیں۔ کسی نے تزئین و آرائش پر توجہ دی تو کسی نے عمارت کو وسیع کیا۔ کسی نے پھلواری کو سنوارا۔ یہ محل تقریباً ۴۰ ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ ہم نے صرف سامنے کی جھلک دیکھی اور سمجھا کہ سبھی کچھ دیکھ لیا۔ اس کے دائیں طرف سنٹ جیمز پارک ہے جو ۹۳ ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ایک خوبصورت جھیل، قدیم سایہ دار درخت، متعدد خوبصورت کیاریاں، ہزاروں پھلواریاں، رنگین جھاڑیاں اور جھنڈوں

Marfat.com

کی صورت میں موجود ہیں۔

مال سے ہوتے ہوتے ہم ADMIRALTY ARCH پہنچے جو ۱۹۱۰ء میں ملکہ وکٹوریا کی یاد میں تعمیر کی گئی تھی۔ پھر ڈیوک آف یارک کا مجسمہ دیکھا، اور وہاں بطور یادگار تصویریں اتروائیں۔ اس کے بعد GREEN PARK سے گزرے جو سرسبز گھاس کا وسیع قطعہ ہے۔ وہیں ڈیوک آف ونلگٹن کے مجسمے کے پاس تصویریں لیں۔ اب ٹانگیں سخت درد کر رہی تھیں۔ ایک بینچ پر بیٹھ کر آرام کیا، ڈرنکس لیں اور پھر چل نکلے۔ اب ہائیڈ پارک میں داخل ہوئے۔ یہاں گرین پارک کی نسبت بے حد زیادہ رونق تھی۔ جگہ جگہ سنگی بینچ اور آرام دہ کرسیاں پڑی ہوتی تھیں۔ وہاں سرپنٹائن جھیل کے کنارے واقع ریسٹورنٹ سے کچھ کھایا پیا کہ اب بھوکے ہو گئے تھے اور آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ میں نے سوچا پھر فرصت ملے نہ ملے، سلیم اور خاور بیٹھے ہیں، میں باتھ روم ہو کر آتی ہوں۔ واپس آئی تو خاور بیچارے کو پریشان کھڑا دیکھا، پوچھا کہ سلیم کہاں ہیں تو وہ خود حیران کہ ابھی یہاں تھے۔ اب ہم دونوں ہائیڈ پارک کی سڑکوں پر ان کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ وہ ہیں کہ کہیں نظر ہی نہیں آرہے۔ کافی پریشانی کے بعد میں اور خاور واپس ریسٹورنٹ آ کر کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں جناب خراماں خراماں چلے آرہے ہیں آتے ہی ہم دونوں پر برسنے لگے کہ تم لوگ کہاں چلے گئے تھے، میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں ۔۔ قہر درویش بر جانِ درویش، خاموشی سے ڈانٹ سنی، قصور کا اعتراف کیا تاکہ بقایا دن اچھا گزرے۔

Marfat.com

اب خاور سے کہا کہ پکاڈلی سرکس لے چلو۔ سنا ہے وہاں بس والے ROUND THE LONDON ٹور دیتے ہیں۔ وہ لے لیں گے، کیونکہ اب تو ٹانگیں لکڑیاں بن گئی ہیں۔ چلنا دشوار ہو رہا ہے۔ کیوں نہ بس میں بیٹھا جائے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس دن ہم کتنے چلے۔ پکاڈلی سرکس میں پہنچے تو رونق ہی رونق تھی، رونق تو خیر لندن میں کسی طرف بھی نکل جاؤ ملے گی لیکن یہاں تو میلہ لگا تھا اس چوک کے متعلق سنا تھا کہ "اگر آپ پکاڈلی سرکس میں کچھ دیر کھڑے رہیں تو پوری دنیا کے لوگوں کو سامنے سے گزرتے دیکھ لیں گے، اگر دس منٹ ٹھہر گئے تو پتہ چل جائے گا کہ لندن کیوں ساری دنیا میں مشہور ہے"۔ اس مقولے کی سچائی پرکھنے کے لئے ہم دس منٹ چھوڑ سرکس میں واقع ایک ریسٹورنٹ میں گھنٹہ بیٹھے رہے، کھا پی کر باہر نکلے تو ابھی تک وہی لوگ کیوپڈ کے مجسمے کے گرد بیٹھے تھے جو گھنٹہ بھر پہلے تھے۔ لگتا تھا سبھی اپنی کشتیاں جلا کر یہاں آئے ہیں اور آئندہ بھی یہی کام کرنے کا ارادہ ہے۔ رنگ رنگ کی نسل کے لوگوں کا اجتماع تھا جن میں ROUND HEAD بھی تھے اور پنکھ ہیڈ بھی۔ انہوں نے بال اس ڈھنگ سے بنا رکھے تھے کہ چاروں طرف سے سر منڈوایا ہوا تھا اور درمیان میں بال ایک لائن میں کھڑے تھے، جیسے مرغ زریں کا پنکھ ہو۔ اس پنکھ کو انہوں نے مختلف رنگوں سے رنگوایا ہوا تھا عجیب حلیہ تھا۔ ان لوگوں کو وہاں پنکھ ہیڈ کہتے ہیں۔ ایسے لوگ جرمنی میں بھی نظر آئے۔ ان ملکوں میں لوگ ایسا تماشہ کر سکتے ہیں کیونکہ اگرچہ بے روزگاری ہے (برطانیہ میں اس حد تک ہے کہ ہر اکیسواں شخص بے روزگار ہے) مگر بے فکری بھی ہے کیونکہ

Marfat.com

نان جویں پہنچانا بہرحال حکومت کا فرض ہے۔ ہمارے ملنے جلنے والے بھی اگرچہ بے روزگاری کی اس لعنت سے تنگ آئے ہوتے تھے، مگر واپسی کا کوئی ارادہ نہ رکھتے تھے۔ آخر وہاں روٹی تو میسر تھی۔ یہاں تو بھوکوں مرنا ہوتا ہے۔

ریسٹورنٹ سے باہر نکل کر اسی چوک سے تفریحی بس لی جو کم وقت اور کم خرچ میں لندن کے اہم مقامات کی سیر کروا رہی تھی۔ اس بس میں مختلف ممالک کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ گائیڈ زبانی رواں تبصرہ کر رہی تھی۔ اہم مقامات کی اہمیت واضح کرنے کے لئے رطب اللسانی تو تھی مگر لوگ کم ہی اس کی علمیت سے استفادہ حاصل کر رہے تھے۔ بے نیازی سے باہر نظریں ادھر ادھر گھما رہے تھے۔ تبصرہ سننے کے لئے کان پر ائیر فون لگانا پڑتا تھا جو سلیم کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لئے ائیر فون میں نے اپنے کان پر فٹ کر لیا اور رواں تبصرہ سننا شروع کر دیا۔ کچھ سمجھ میں آیا کچھ نہیں۔ کچھ سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی۔ دریائے ٹیمز کو دو دفعہ پار کیا۔ ایک رسوائے زمانہ لندن برج سے ایک دفعہ ٹاور برج سے ۔۔۔ پارلیمنٹ ہاؤس کے پاس سے بھی گزرے۔ سینٹ پال کتھیڈرل دیکھا جسے شہزادہ چارلس اور لیڈی ڈائینا کی شادی کی وجہ سے خاص طور پر دیکھنا چاہتی تھی۔ مختلف جگہوں سے بس گھوم پھر کر وہیں آن رکی۔ پیچھے اب رات بھی پڑ رہی تھی۔ بتیاں روشن تھیں۔ رونق اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اب خاور سے کہا کہ وکٹوریا اسٹیشن سے چلو کہ بس پکڑیں اور گھر چلیں۔ اس بیچارے کو وکٹوریا اسٹیشن کا کیا پتہ، پوچھتے پوچھتے گرتے پڑتے وکٹوریہ اسٹیشن پہنچ ہی گئے۔ بس پکڑی اور ہائی ویکمب کی مارکیٹ آ گئے جہاں

Marfat.com

سے خاور نے اپنے ابو کو فون کیا کہ "فوراً آئیں اور گھر لے چلیں، ماموں جانی نے تو اپنا کباڑہ کر دیا ہے۔"

امجد آئے، گاڑی میں بیٹھے گھر پہنچے تو رات کے بارہ بج گئے تھے۔ تقریباً چودہ گھنٹے کا یہ ٹور جس میں ہم نے بساط بھر کوشش کی کہ لندن دیکھ لیں مگر پھر بھی تشنہ رہے، یادگار بن گیا۔ تھکاوٹ اپنے عروج پر تھی۔ جو کچھ پاپیادہ دیکھا وہ گاڑی سے نہ دیکھ سکتے تھے۔ لندن کی اصل روح دیکھی، اپنے جسم کا کمال دیکھا۔ شاید اتنا کبھی نہ چلی تھی، جتنا آج چلی بقول کسے ع

چلے تو کٹ ہی جائے گا سفر آہستہ آہستہ

بس یوں چلتے چلتے لندن کا پا پیادہ سفر کٹ ہی گیا۔

مادام تساد کا مومی گھر

۱۲ر اگست ۱۹۸۳ء

آج بھی معمول کے مطابق ہم دونوں مسافر صبح سویرے اُٹھے اور سفر در سفر کے لئے تیار ہو کر مادام تساد کا عجائب گھر دیکھنے چلے۔ مدتوں سے لوگ اسے دیکھ رہے ہیں۔ کئی پرانے مجسمے اٹھا دیئے جاتے ہیں، نئے لگا دیتے ہیں۔ اٹھائے جانے والے مجسموں میں قائداعظم کا بھی مجسمہ تھا جن کی شخصیت کے انگریز مدبر بھی مداح تھے، مگر جو انگریز کی ہی ذہنیت کا شکار ہو گیا، مسلمانوں سے انگریز ہمیشہ متعصب رہے۔ وہاں اندرا گاندھی اور گاندھی کے مجسمے موجود تھے۔ وہاں کیا، جہاں جہاں بھی ہم نے مادام تساد کے عجائب گھر کی نقل میں بنے ہوئے عجائب گھر دیکھے، سبھی جگہوں پر ان دو

Marfat.com

شخصیتوں کے مجسمے موجود تھے۔ بہر حال، یہ کوئی عظمت کا معیار نہیں کیونکہ اسی عجائب گھر میں لیڈی ہینگیسٹری جیسی عورتوں کے مجسمے بھی موجود تھے، قاتلوں کے مجسمے تھے، ظالموں کے پیکر تھے مگر جیسا کہ ڈکنز DICKENS نے کہا تھا کہ: SOMETHING MORE THAN AN EXHIBITION. IT IS AN INSTITUTION.

وہ صحیح ہے نمائش گاہ دل کھینچتی ہے۔ عجائب گھر کے باہر چھ چھ آدمیوں کی بیک وقت لائن چلتی ہے جو ٹکٹ خریدنے کے لئے گھنٹہ بھر انتظار کرتے ہیں۔ ہم لوگ بھی ایک ایسی ہی قطار میں لگ کر کھڑے ہوگئے۔ لائن چیونٹی کی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی، دائیں طرف کی لائن میں سلیم تھے، بائیں طرف امجد، اس سے آگے خاور عطیہ تھے۔ یوں ہم اکٹھے ہی آگے بڑھ رہے تھے۔ خاصا صبر آزما مرحلہ تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد دیکھا کہ سلیم ہم سے دو تین آدمی چھوڑ کر آگے کھڑے ہیں۔ سخت حیرت ہوئی کہ ان کی لائن کے آدمی شاید تیز رفتار ہیں یا شاید اس لائن کو ٹکٹ دینے والا تیز تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے وقت گزاری کر رہے تھے، اب جو دیکھا تو سلیم کافی دُور نکل گئے تھے، بلکہ ٹکٹ دینے والے کے بالکل قریب، چنانچہ یہ ہم سے کافی پہلے ٹکٹ لے کر ایک طرف ہمارے انتظار میں کھڑے ہوگئے۔ ہم پہنچے تو ہمارے ٹکٹ لے چکے تھے۔ اس لئے نمائش میں داخل ہوتے وقت پوچھا کہ یہ کیا ماجرا تھا۔ آپ اتنی جلدی کیسے پہنچ گئے۔ بس ہنس دیئے اور چپ رہے جس سے سارا ماجرا فوراً سمجھ میں آگیا۔ اندر پہنچتے ہی مومی مجسموں کی دنیا آباد دیکھی، مختلف تاریخی واقعات کو واضح کرنے کے لئے ان مجسموں کا سہارا لیا گیا ہے۔

Marfat.com

کہیں کہانیوں کے کردار اجاگر کئے گئے ہیں۔ سب سے خوبصورت مجسمہ "خوابیدہ حسن" (SLEEPING BEAUTY) کا تھا جو آہستہ آہستہ سانس بھی لے رہا تھا۔ سانس لینے کی کیفیت کو کمالِ مہارت سے دکھایا گیا تھا۔ کئی مشہور شخصیتوں نے اپنے مومی مجسموں کے لئے اپنے ذاتی استعمال کے کپڑے بھی بطور تحفہ فراہم کئے تھے۔ بعض نے اپنی جیولری بھی بھیجی تھی۔ ان لوگوں میں اگا تھا کرسٹی، لیری ہیگ مین اور الور سادات شامل تھے۔ مسز گاندھی نے اپنی ساڑھی اور رونلڈ ریگن نے اپنی ٹائی دی تھی۔ تصاویر بنانے کا عمل بھی خاصا دقیق تھا۔ جس شخصیت کا مجسمہ بنانا مقصود ہوتا ہے اس کے لباس کی وضع قطع، اٹھنے بیٹھنے کے اسٹائل، قد، جسامت حتیٰ کہ چہرے کے تاثرات کا تفصیلی معائنہ کیا جاتا ہے اور کوشش یہی کی جاتی ہے کہ مجسمہ حقیقی زندگی کے نزدیک ترین ہو۔ چرچل کی پبلک لائف چونکہ کافی عرصہ پر محیط رہی ہے، اس لئے اس کا مجسمہ بار بار بنانا پڑا، یعنی جوں جوں عمر کا اثر چہرے اور جسامت پر پڑتا رہا، توں توں مجسمہ تبدیل ہوتا رہا۔ اگر میرا مجسمہ بناتے تو بھی یہی کرنا پڑتا۔ کئی لوگ اپنا مجسمہ بنوانے کے لئے لندن آتے ہیں اور مادام تساد کے مجسمہ ساز کو اسٹوڈیو میں گھنٹوں وقت دیتے ہیں۔ بعض لوگوں کے مجسمے بنانے کے لئے ان کے ملکوں میں بھی جانا پڑتا ہے مثلاً مسز گاندھی کا مجسمہ بنانے کے لئے مجسمہ ساز دہلی گیا۔ شاہ حسین کا مجسمہ اردن میں بنا۔ ناروے کے بادشاہ نے اوسلو میں وقت دیا۔ اسپین کے شاہ جوآن کارلوس کے مجسمے کے لئے میڈرڈ جانا پڑا۔ انہی باتوں کی وجہ سے یہ نمائش گاہ مشہور ہے۔ محنت ہی ہر کام کی اصل ہے۔ عمارت میں کہیں

Marfat.com

سیڑھیاں چڑھنا پڑا، کہیں تہہ خانوں میں جانا پڑا، کسی جگہ کوئی شخص غور سے مجسمہ دیکھتا پایا تو اسے بھی مجسمہ جانا۔ میں نے اپنی پسندیدہ رائیٹر باربرا کارٹ لینڈ کے ساتھ تصویر کھنچوائی۔ اس کا اپنا دستخط شدہ خط بھی میرے نام میرے پاس موجود تھا جس میں اس نے اپنی تصویر اپنے ہاتھ سے ان الفاظ کے ساتھ بھیجی تھی:

TO MUSSARRAT SALEEM WITH LOVE.

BARBARA CARTLAND

اس لئے واپسی پر کئی لوگوں نے پوچھا کہ کیا آپ اسے ملنے گئی تھیں، کیونکہ تصویر میں ہم دونوں تصویر بنے ہوتے تھے۔ یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ مجسمہ کون ہے اور زندہ انسان کون؟ مگر صاحبِ عقل تو جان لیتے تھے کہ اصل کون سی ہے اور نقل کون سی ہے

ہم زمانے سے فقط حسن گماں رکھتے ہیں
ہم زمانے سے توقع ہی کہاں رکھتے ہیں

ہم نے بلیک پول اور بنیا گرا فال پر بھی ایسے عجائب گھر دیکھے مگر اصل اصل ہے، نقل نقل، نمائش گاہ سے نکلے تو سلیم کہنے لگے بھوک لگی ہے۔ اگرچہ نمائش گاہ میں سینڈوچ مل رہے تھے۔ ہم نے وہ لے کر کھا لئے مگر سلیم تو باہر جا کر پکے مذہبی بن گئے تھے، دھرم کی عزت و وقار کے پاسبان۔ چنانچہ امجد ہمیں لے کر گھر واپس پہنچے۔ آنے جانے کا آدھا سفر ہم نے ٹیوب ٹرین سے کیا، آدھا گاڑی سے۔ کیونکہ لندن کے وسط میں گاڑی لے کر جانا حماقت ہے، پارکنگ کے لئے جگہ ہی نہیں ملتی۔ اس لئے امجد نے

Marfat.com

ٹیوب اسٹیشن کے باہر گاڑی پارک کی اور سیڑھیاں اتر کر ٹیوب ٹرین کے انتظار میں کھڑے ہوگئے۔ یہ زیرِ زمین ریلیں شہر بھر کے نیچے ہی نیچے مسلسل رواں دواں رہتی ہیں۔ لندن شہر میں اس کے تقریباً ڈھائی سو سے زائد اسٹیشن ہیں۔ اسٹیشن سے بجلی کے زینوں کے ذریعے نیچے اتریں، ٹکٹ خریدیں، ٹرین میں بیٹھیں اور برق رفتاری سے جہاں پہنچنا ہو پہنچ جائیں۔ امجد کہنے لگے کشور ان برقی سیڑھیوں سے بے حد گھبراتی ہے۔ مگر مجھے تو یہ خودکار سیڑھیاں بڑی اچھی لگیں۔ بس سیڑھیوں کے ساتھ چلنا شروع کر دیتی، یوں چلتی زمین پر چلنا دلچسپ تجربہ ثابت ہوتا تھا۔ یہی خوف دامن گیر تھا کہ کہیں: ؎ اک پل کے رکنے سے دور ہو گئی منزل

صرف ہم نہیں چلتے راستے بھی چلتے ہیں

دوپہر کا کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کیا۔ پھر اپنے رشتہ داروں سے ملنے نیسڈن آئے۔ چونکہ اطلاع نہ تھی اس لئے وہ لوگ بھی ہماری طرح کسی سے ملنے نکلے ہوتے تھے۔ وہاں سے سلیم صاحب کے ایک دوست اور کئی دیگر رشتہ داروں سے ملنے EAST HAM پہنچے۔ کھانا بھی انہی کے ہاں کھایا اور مائیکرو ویو اوون کی کرامات دیکھیں۔ کس طرح منٹوں میں کھانا پک کر تیار ہو جاتا ہے۔ رات کے بارہ بجے واپسی ہوئی۔ اس وقت لندن کی سڑکوں پر پیلی پیلی مریضانہ قسم کی لائٹیں جل رہی تھیں جو مجھے سفید روشنی دیکھنے کے بعد کچھ عجیب سی لگیں۔ کشور سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہاں برفباری ہوتی ہے اس لئے پیلی روشنیاں استعمال ہوتی ہیں کہ یہ برف کی سفیدی میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ اب کچھ عرصے سے پنڈی

Marfat.com

کے مال روڈ پر بھی ایسی ہی روشنیاں لگا دی گئی ہیں۔ اب بھلا ان سے کون پوچھے کہ یہاں کون سی برفباری ہوتی ہے۔ سچ کہتے ہیں کہ نقل را چہ عقل۔

واپسی پر نیند نہیں آ رہی تھی۔ دن اگرچہ بے حد مصروف گذرے تھے، مگر بچوں کی یاد مسلسل کچوکے لگاتی تھی۔ ایک ہم مشرقی لوگوں کا یہ المیہ ہے کہ سیر بھی کریں گے مگر فکر بھی مسلط رکھیں گے، مسرت و شادمانی فکر و غم کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ فون کیا تو معلوم ہوا کہ بچے ناشتہ کے بعد کھیل رہے ہیں۔ ہر ایک سے بات کی تو دل کو تسلی ہوئی۔ کہا کہ بچو تم کھیلو کودو کہ تمہارا دن روشن ہے، ہماری رات ہے، ہم اب سوتے ہیں۔ اگرچہ یہ خواہش بدستور ذہن و دل کے نہاں خانوں میں ابھرتی رہتی ہے ؎

دل ہجر کے بوجھ سے بوجھل ہے اب آن ملو تو بہتر ہو
اس بات سے ہم کو کیا مطلب یہ کیسے ہو وہ کیونکر ہو!

بریڈ فورڈ — ننھا پاکستان

۱۳ اگست ۱۹۸۳ء

آج ہماری بریڈ فورڈ کو روانگی تھی۔ فی الحال لندن کو خدا حافظ! سلیم صاحب کے دوست شگری صاحب وہاں پاکستان کے وائس قونصلر ہیں۔ دونوں کا شادی سے پہلے خوب دوستانہ تھا جواب گہرا یارانہ بن گیا ہے۔ شادی کے بعد کافی عرصہ تک مسز شگری سے ملاقات نہیں ہوئی۔ مگر جب ملے تو یوں شیر و شکر ہوتے کہ اب سلیم اور شگری کم ملتے ہیں،

Marfat.com

ہم زیادہ ہماری دوستی کا پیریڈ اگرچہ مختصر ہے، مگر ان مردوں کی دوستی سے کسی طرح کم پُرخلوص نہیں۔ طبیعت ملنے کی بات ہے۔ کسی سے ساری زندگی ملو، مگر دل نہیں ملتا۔ کسی سے چند گھنٹے ملے تو یوں لگتا ہے جیسے برسوں سے ملاقات ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی انگلینڈ آئیں اور ان کے پاس نہ جائیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ان کو اپنے پہنچنے کی اطلاع کر دی۔ دوپہر کو انجم آ گیا۔ وہ ہمیں کنگ کراس اسٹیشن لے گیا۔ MONOPOLY گیم کھیلتے کئی دفعہ اس اسٹیشن سے گزرے تھے۔ اب آتے تو حقیقت معلوم ہوتی۔ وہی سٹیشن والی فضا، ٹکٹ کے لئے لائنیں لگی ہوئی، ریسٹورنٹ، گفٹ شاپ، سگریٹ کی دکانیں، سامان کی بے ترتیبی، مسافروں کی افراتفری۔ خیر ہم نے ٹکٹ حاصل کیا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ بیٹھتے ہی اعلان سنا کہ ڈنر تیار ہے، BUFFET CAR سے حاصل کریں۔

لیجئے جناب! انہوں نے سفر کے شروع میں ہی دعوتِ طعام دے ڈالی۔ بوفے کار کی وجہ سے اب یہ خدشہ تو نہ رہا کہ پیاسے یا بھوکے مریں گے۔ اب گاڑی میں موجود ہر شخص کچھ نہ کچھ لا رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ سبھی بھوکے چل نکلے تھے۔ یہاں یہ رجحان دیکھا کہ لوگ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے پیتے رہتے ہیں۔ ان کے کھانے ہماری طرح کے بھاری بھر کم نہیں ہوتے۔ سینڈوچ لیا یا برگر، ساتھ ہی کسی قسم کا ڈرنک، چلئے بیڑا پار ہے۔

لندن شہر سے نکلتے ہی چھوٹے چھوٹے گھروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بیچارے کیا کریں، جگہ کی کمی ہے اور آدمیوں کی زیادتی، گورنمنٹ خود گھر بنواتی ہے اور فروخت کرتی ہے۔ پورے کا پورا علاقہ ایک ہی جیسے

Marfat.com

ڈیزائن کے گھروں سے بھرا پڑا تھا۔ ایک گھر سے نکلو' دوسرے میں داخل ہو جاؤ۔ کوئی فرق نہیں۔ یورپ کے دیگر ملکوں میں جہاں فلیٹس کا رواج ہے، وہاں انگلینڈ میں چھوٹے چھوٹے COMPACT قسم کے گھروں کا رواج ہے۔ EASTHAM (لندن) میں مکان اتنے چھوٹے تھے کہ جن کے گھر میں ہم ملنے گئے وہ کچھ تو کمرے میں بیٹھے' کچھ دروازے میں کھڑے اور کچھ اس سے بھی آگے سیڑھیوں سے جھانک کر دیکھ رہے تھے۔ اندر والوں سے گفتگو ہو رہی تھی، دروازے والے سن رہے تھے' سیڑھیوں والے بس دیکھ رہے تھے۔ اس قسم کے مکانوں کے ساتھ کوئی گیراج نہ تھا۔ گاڑیاں سبھی کے پاس تھیں اور دو دو تھیں۔ اب حال یہ تھا کہ سبھی نے اپنی گاڑیاں سڑک پر پارک کر رکھی تھیں۔ درمیان میں صرف ایک گاڑی کے گزرنے کا راستہ تھا۔ سڑک کی مخالف سمت سے روشنی نظر آ رہی ہے تو سمجھ جائیے کہ کوئی گاڑی تشریف لا رہی ہے۔ بس اپنی گاڑی روک لیجئے۔ اسے گزر جانے دیجئے۔ دن میں یہی حال ہوتا ہوگا۔ یا دن کو اتنی پارکنگ نہ ہوتی ہوگی اور گزارا اچھا چل جاتا ہوگا۔ اسی علاقے میں سلیم صاحب کے دوست نے دو مکان لے کر درمیان سے دیوار توڑ کر گھر کو وسیع کر لیا تھا۔ انہوں نے مائیکرو ویو کوکنگ رینج لگوایا تھا۔ سارا کچن جدید یت کی نفاست لئے ہوئے تھا۔ مائیکرو ویو سے کھانا پانچ منٹ میں تیار ہو جاتا ہے۔ وہاں عام لوگوں کو اتنی جدید سہولتوں سے استفادہ حاصل کرتے دیکھ کر دل بے حد خوش ہوا۔ ہمارے ہاں تو یہ سہولتیں صرف رئیس اور امراء کے لئے وقف ہیں۔ وہاں کم از کم محنت کا صلہ تو ہے۔ میٹرک تک تعلیم مفت ہے اور لازمی

Marfat.com

بھی۔ اگر کوئی بچہ اسکول نہ آئے تو اسکول کا کارندہ گھر جاکر پتہ کرتا ہے۔
ہمارے ہاں اگرچہ تعلیم پر بڑا زور دیا جاتا ہے' مگر شرح خواندگی دن بدن گھٹ رہی ہے۔ ہمارے ہمسائے بھارت میں بھی شرح خواندگی غربت کے باوجود بڑھ رہی ہے۔ یہاں جو پڑھنا چاہتے ہیں اُن کو اسکول میسر نہیں۔ داخلے کے لئے کسی گورنر یا جنرل کی سفارش کی ضرورت ہوتی ہے۔ پرائیویٹ اسکول ماں باپ کی کھال ادھیڑ رہے ہیں۔ سُنا ہے اس دفعہ کے پنج سالہ منصوبے میں شرح خواندگی کو پچاس فی صد کرنے کے اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ اللہ کرے کہ تعلیم عام ہو اور بے دام ہو تاکہ غریب کو غربت سے نجات ملے۔ امیر کی امارت میں نہ کاوٹ پڑے۔

بات کہاں سے چلی اور کہاں تک جانکلی۔ بہرحال' وہاں اعلیٰ تعلیم صرف انہی لوگوں کو دی جاتی ہے جو علم کی لگن رکھتے ہوں یا جن کو شوق اکساتا ہو۔ ورنہ مادی دور ہے' مشینوں کی حکومت ہے۔ کسی نہ کسی فیکٹری میں تو روزی کمانے کی جگہ مل ہی جاتی ہے' بلکہ یہاں تو WHITE COLLAR کی تنخواہیں کم ہیں اور جسمانی مشقت کی زیادہ۔ جتنی زیادہ محنت کرو گے' اتنا پھل پاؤ گے یا جیسے کہ پنجابی میں کہتے ہیں کہ "کر مزدوری کھا چوری" یہی وجہ ہے کہ وہاں اکثریت میٹرک کے بعد کارخانوں میں گھس جاتی ہے بقول کسے یہ لوگ پانچ دن گدھے کی طرح کام کرتے ہیں۔ اس وقت انہیں ہوش نہیں ہوتا کہ ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ ہر شخص پوری دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ مگر بقایا دو دن ان جیسی تفریح بھی

Marfat.com

کوئی نہیں کرسکتا۔ شراب، نشہ، جنسی بے راہروی اِن کا مشغلہ ہے تنخواہ ختم ہو جاتی ہے تو پھر وہی روٹین ورک! ایشیائی ممالک کے لوگ چونکہ شراب اور کباب سے پرہیز کرتے ہیں، اس لئے وہ بچت کر لیتے ہیں۔ وہ اِن لوگوں کے مقابلے میں خوشحال ہیں اور یہ خوشحالی بھی وہاں ایک وجۂ عناد ہے۔ انگریز کہتے ہیں کہ اِن لوگوں کو واپس بھیجو۔ ہمارا حق ہمیں دو۔ یہ خوشحال اس لئے ہیں کہ ہماری روزی کھا رہے ہیں۔

گاڑی سوئے منزل رواں تھی۔ پہلا اسٹیشن ۲ ½ بجے شام آیا۔ GRANTHAM نام تھا۔ اتنی رونق بھی نہ تھی۔ اب سفر اندھیرے میں ہو رہا تھا۔ میں گاڑی کی کھڑکی سے سر نکالے گزرتے نظاروں سے محظوظ ہو رہی تھی۔ سلیم صاحب اونگھ رہے تھے پھر RETFORD کا اسٹیشن آیا۔ پھر DON CASTER۔ اِن کے اسٹیشن بھی اپنی ہی طرح کے تھے۔ ٹرین میں البتہ فرق تھا۔ سیٹیں اچھی، گاڑی صاف ستھری، سبھی اپنی اپنی سیٹوں پر براجمان۔ کسی نے بھی راستے میں بستر نہ بچھایا، سامان نہ بکھیرا۔ انگلینڈ میں اور یورپ میں بھی ٹرین کا سفر بس یا کوچ کے سفر سے مہنگا ہے۔ ممکن ہے انگلینڈ کے باسیوں کو مہنگا نہ لگتا ہو کیونکہ ہم جو رقم خرچ کرتے تھے اُسے بیس سے ضرب دے لیتے تھے اور پاکستانی روپے میں یہ رقم خاصی بھاری ہو جاتی تھی۔ انجم نے یہ ضرب تقسیم کا حال دیکھا تو کہنے لگا: "ماموں یہاں پونڈ کو ایک روپیہ سمجھیں۔ اگر یوں ضربیں دیتے رہے تو سفر دشوار ہی نہیں ناممکن ہو جائے گا۔"

سلیم کہنے لگے: "برخوردار! کیسے پونڈ کو ایک روپیہ سمجھوں میری

Marfat.com

کمائی پاکستانی روپے میں ہے۔ میں نے پونڈز میں سرمایہ وصول نہیں کیا جو پونڈز کی طرح اڑاتا پھروں۔"

گاڑی جونہی کسی شہر سے گذرتی تو نمایاں عمارت گرجا گھر ہوتی میرا خیال ہے کہ خوبصورت عمارت کا اعزاز بھی گرجا گھر کو ہی جاتا ہوگا۔ اب رات بھیگ رہی تھی سلیم سو رہے تھے۔ میرے ساتھ ہی دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ وہ شوق سے مجھ سے پاکستان کے متعلق پوچھ رہی تھیں، کہاں سے آئی ہو اور کہاں جانا ہے۔ پھر سلیم کے متعلق پوچھنے لگیں کہ یہ تمہارا بوائے فرینڈ ہے۔ میں نے کہا "ہاں! اور اسی بوائے فرینڈ سے میرے چار بچے ہیں" بڑی حیران ہوئیں۔ منہ سے تو کچھ نہ کہا مگر تاثرات یہی کہہ رہے تھے کہ اس آدمی کی کیسی ڈیٹنگ پرسینلٹی ہے اور پھر کیسا وفادار فرینڈ ہے۔ میں نے بھی خاموش زبان سے کہا کہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم بھی کسی سے کم نہیں۔ ہمارے ملک میں ابھی آپ جیسا رواج نہیں کہ مرد و عورت کا یہی وطیرہ ہو۔ ؏

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے

اور پھر بقایا زندگی دوسرے مصرعے کی عملی تفسیر بنے رہیں کہ ؏

ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

یعنی جوانی شاخ شاخ پر بسیرا کرتے گزاری اور بڑھاپے میں در بدر کی ٹھوکریں کھاتے رہے۔ ہمارے ہاں اکثر شادیاں مستقل بندھن کی صورت ہوتی ہیں۔ جسے جو ملا قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کیا۔ WAKE FIELD آیا تو دونوں اتر گئیں۔

اب سردی سی لگنے لگی تھی، باہر گزرتے مکان تقریباً ایک جیسے لگ رہے تھے۔ البتہ شہروں کے درمیانی فاصلوں میں نظر آنے والی کالی کالی

Marfat.com

لمبی چمنیاں صنعتی علاقے کی نشان دہی کر رہی تھیں۔ اب یارک شائیر کا سب سے بڑا شہر LEADS آیا۔ یہ دریائے ایرے پر واقع ہے۔ یہاں کی اونی صنعت کے علاوہ چمڑا سازی، کاغذ، تمباکو، چینی کے برتن اور کمبل بنانے کی صنعتیں بھی مشہور ہیں تبھی تو کئی چمنیوں سے دھواں کی بجائے شعلے نکلتے دکھائی دیتے۔ یہاں کا ریلوے اسٹیشن بھی خوب بڑا ہے۔ کیونکہ یہ ایک اہم جنکشن ہے۔ یہاں شمال اور جنوب سے کئی ریلوے لائنیں آکر ملتی ہیں۔ ہمیں بھی یہیں سے ٹرین بدلنی تھی۔ اب دوسری ٹرین سے مغرب کی جانب سفر شروع ہوا اور کچھ ہی دیر کے بعد بریڈ فورڈ جا پہنچے۔

اسٹیشن پر اترے تو اختر شگری صاحب اپنے دو دوستوں کے ساتھ موجود تھے۔ عزیز دوست سال کی جدائی کے بعد ملے اور خوب ملے۔ پھر میرا حال احوال پوچھا اور کہنے لگے کہ آپکی سہیلی گھر پر انتظار کر رہی ہے۔ گھر پہنچے تو تسنیم دروازے پر کھڑی ملی۔ گرمجوشی سے گلے ملے تو سارا گلہ شکوہ جاتا رہا۔ پرانی سہیلیوں کا ذکر اذکار ہوا۔ چائے کا دَور چلا۔ سبھی کی خیریت دریافت کرتے رات کا کھانا کھایا۔ شگری صاحب کا اصرار کہ ایک ہفتہ ٹھہرو۔ ہمارے پاس گنے چنے دن جن کو تبرک کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ کافی ردوکد کے بعد طے ہوا کہ بس دو دن ان کے پاس ٹھہریں گے۔ پھر دو دن کا پروگرام بنا۔ نیند سے آنکھیں بوجھل ہوئیں۔ میزبانوں کو خدا حافظ کہا اور سونے چل دیئے۔ آج دل تسنیم سے مل کر بے حد خوش تھا کیونکہ بقول شاعر ؎ اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا

بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

Marfat.com

بلیک پول یا وائٹ اینڈ برائٹ پول

۱۴ اگست ۱۹۸۳ء

آج یوم آزادی ہے اپنے ملک میں جانے کیا کیا تیاریاں ہو رہی ہوں گی۔ اختر شگری صاحب نے بھی رات کو کچھ احباب کو مدعو کر رکھا ہے۔ اخبار کھولا تو لندن شہر میں بھی ہمارے پاکستانی بھائیوں نے کچھ ہل چل کا سامان کیا ہوا ہے۔ ایک دو جلسوں کے اشتہار ہیں۔ ایک ثقافتی شو ہو رہا ہے جس میں شرکت کے لئے محمد علی شہکی، شازیہ اور روحانی بالو آئی ہوئی ہیں۔ اے نگارِ وطن تو سلامت رہے — تیری آزادی رہے ہزار دل سال، ہر سال کے ہوں دن پچاس ہزار — بس یہی دعا ہے جو یہاں پردیس میں دل کی گہرائیوں سے نکلی، وطن کی قدر تو وطن سے دوری میں آتی ہے ؎

بیزار ہیں جو جذبۂ حب الوطنی سے
وہ لوگ کسی سے بھی محبت نہیں کرتے

پچھلے دنوں ڈاکٹر ایوب مرزا کی کتاب "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" پڑھ رہی تھی۔ اس میں فیض صاحب مرحوم کے اس خیال کی حقیقت اب بیرون ملک آ کر خوب آشکارا ہوتی۔ وہ کہتے ہیں میرے لئے دنیا کی سب سے بڑی سزا وطن سے دوری میں ہے۔ واقعی سچ جانیئے اس سے بڑھ کر کوئی سزا نہیں۔

Marfat.com

کمرے سے نکل کر ناشتہ کیا اور بلیک پول کی طرف چل پڑے۔ بشگری صاحب
کے ایک دوست بھی کار لے کر آئے۔ آگے پیچھے دونوں گاڑیاں رواں دواں
ہوئیں۔ راستہ صاف ستھرا اور پُرفضا، دل خوشی سے معمور، آنکھیں قدرت
کے حسین نظاروں سے مخمور۔ راستے میں مانچسٹر سے بھی گزرے جس کے متعلق
سن رکھا تھا کہ کاٹن انڈسٹری کی روح رواں اور مرکز ہے۔ اسی لئے اپنے
فیصل آباد کو بھی پاکستان کا مانچسٹر کہتے ہیں۔

بلیک پول آئیرش سمندر کے کنارے ایک ہنستا مسکراتا ساحلی شہر ہے۔
یہاں ہر شخص اپنے میں مگن، خوشیوں کو زندگی سے کشید کرنے آتا ہے۔ ہمیں
سب سے پہلی پرابلم پارکنگ کی پیش آتی۔ جہاں بھی جاتیں، ہاؤس فل کا بورڈ
لگا ہوا ہے۔ بہرحال، ایک جگہ کام بن گیا۔ گاڑیاں کھڑی کیں، باہر نکلے
تو ایک میلہ کا سامان تھا۔ لوگ، بچے، بوڑھے جوان، دکاندار آوازیں لگا
کر بیچنے والے ریڑھی بان، خوشی و مسرت سے کھنکتی آوازیں، بے فکر چہرے،
آسودہ حال لوگ، ہنستی گنگناتی فضا، لہراتا سمندر، رنگین چھتریاں، ننگے
بدن، تفریح، بے تحاشا شور مچاتے بچے، غرضیکہ کیا کچھ بیان کیا جائے۔ زندگی اپنے آپ
پر نازاں تھی۔ دکانوں پر ایک ہجوم تھا۔ PLEASURE BEACH پر
جانے کے لئے لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ کھڑے تھے۔ گفٹ کارڈز خریدنے
اور تماشہ دیکھنے والے کا ایک اژدھام تھا۔ خوبصورت دکانیں، فش
الکوریم WAX HOUSE ہوٹل، کیفے، سٹورز آباد تھے۔

ساحل کے ساتھ ساتھ ایک بڑی پُررونق کشادہ سڑک تھی جس
کے آس پاس رونق ہی رونق تھی۔

Marfat.com

سڑک بذاتِ خود دلہن کی طرح سجائی گئی تھی۔ جانوروں کے منہ میں رنگین بلب لگے ہوئے تھے۔ کہیں چائے دانی یا تاج کی شکل میں تراشیدہ روشنیاں تھیں تو کہیں گلدان میں لگے پھولوں کی مانند! لگتا تھا رات کو دن کا سماں ہوگا بلکہ دن سے بڑھ کر روشن تر اور رنگین تر ماحول ہوگا ہم تو رات پڑنے سے پہلے لوٹ آئے، ورنہ یہ نظارہ بھی دیدنی تھا۔ ہم نے امریکہ میں ATLANTIC CITY کی رات کی رونق بھی دیکھی، مگر اس کی ساحلِ سمندر کے کنارے بنی ہوئی سڑک اتنی خوبصورت نہ تھی جتنی یہ تھی ممکن ہے کسی کو وہ جگہ خوبصورت لگے، یہ اپنی اپنی پسند کی بات ہے اور ہونا بھی یوں ہے کہ کوئی جگہ کسی کو بہت زیادہ پسند ہوتی ہے جب کہ دوسرے کو ویران نظر آتی ہے۔ اصل میں سب کچھ اندر کے موسم پر منحصر ہے۔ آپ خوش ہوں تو جہاں خوش نظر آتا ہے۔ آپ مرے جگ پرلو کے مصداق اپنے موڈ کی بات ہوتی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ بلیک پول میں نو رنجیدہ سے رنجیدہ شخص اپنا غم بھلانے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ جانے اسے بلیک پول کیوں کہتے ہیں۔ اسے تو وائٹ اور برائٹ پول کہنا چاہیئے۔

ہم سب لوگ تھوڑی دیر دکانوں میں جھانکتے، ماحول سے لطف اندوز ہوتے پھرتے رہے۔ پھر بھوک نے آن ستایا۔ مین سڑک سے ہٹ کر ایک ذیلی سڑک پر آئے۔ یہ قدرے پرسکون تھی اور لوگ بھی کم ہی آ جا رہے تھے۔ یہاں ایک چھوٹے سے کیفے میں داخل ہوئے۔ کیفے کے مالک کی رہائش اوپر تھی۔ نیچے کرسیاں لگا کر اور کیبن بنا کر کیفے بنا دیا گیا تھا۔ ہم نے فش اور چپس کا آرڈر دیا۔ مالک خود ہی بیرا، خود ہی باورچی تھا۔ اس

Marfat.com

نے کڑاہی میں گھی ڈال کر دونوں اشیاء کی تیاری کرنے لگا۔ مجھے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ پانی منگوایا۔ ننھے منے سے گلاس میں پانی لے آیا۔ میں نے اور لانے کے لئے کہا۔ وہ پیا، مگر گھونٹ دو گھونٹ سے بھلا پیاس کیسے بجھے۔ جب تیسری بار منگوایا تو حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ کہنے لگا کہ پانی پی رہے ہو یا پھینک رہے ہو۔ بعد میں ہم سے کافی بے تکلف ہو گیا۔ اپنی عمر ہم سے پوچھنے لگا۔ شگری صاحب نے کہا کہ بتیس یا پینتیس سال ہو گی۔ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ بتایا کہ "میری عمر تو پچاس سال سے زائد ہے۔ میں یہاں ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہوں۔ دن میں ایک دو بھٹکے بھولے مسافر ادھر آجاتے ہیں۔ جن سے میری دن کی آمدنی ہو جاتی ہے اور میں بخوبی گزارا کر لیتا ہوں۔ روزانہ ورزش کرتا ہوں"۔ اور ساتھ ہی اس نے ہمارے سامنے بیٹھکیں لگانی شروع کر دی۔ کبھی ٹانگیں دیوار سے لگاتے، کبھی بندر کی طرح اچھلتے کودتے۔ جسم میں بلا کی تیزی، پھرتی اور لچک۔ بہرحال جب تک آلو اور مچھلی پک کر تیار ہوتی، تب تک وہ کچن سے کیبن تک چکر لگاتا رہا اور ہمیں ہنساتا رہا۔

وہاں سے فارغ ہو کر نکلے تو بلیک پول کے مینار پر لفٹ کے ذریعے چڑھے۔ ارد گرد کا نظارہ بڑا خوبصورت تھا۔ ان لوگوں نے بھی ایفل ٹاور کی طرح لوہے کا ڈھانچہ کھڑا کر رکھا ہے۔ لیکن یہ تو ڈھائی سال کے عرصہ میں بنا اور ۱۸۹۴ء میں لوگوں کے لئے کھولا گیا، جب کہ ایفل ٹاور ۱۸۹۰ء میں مکمل ہو گیا تھا۔ اس میں ۲۴۹۳ ٹن سٹیل استعمال ہوا تھا جبکہ ایفل ٹاور میں ۷۰۰۰ ٹن وزنی ہے۔ اسی سے دونوں کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

اس میں بھی لوگ اس قدر سیر کے لئے آتے ہیں کہ سال میں لفٹ پچاس ہزار مرتبہ اوپر چڑھتی اترتی ہے۔ اِن پچاس ہزار دفعہ میں ہم نے بھی لفٹ کو اعزاز بخشا کہ ہمیں لے کر چڑھے اور اترے۔

نیچے اترے تو فش ایکوریم دیکھنے کے لئے ٹکٹ لیا کہ اس کی بڑی شہرت سنی تھی۔ اس میں خدا کی قدرت کی نیرنگی اور نرالے پن کا احساس شدت سے ہوا جس طرف بھی نظریں دوڑائیں اس قدر عجیب و غریب، خوبصورت اور خوفناک مچھلیاں دیکھیں کہ زندگی بھر نہ دیکھی تھیں۔ زیر آب اتنی بے شمار اقسام کی مخلوق ہے کہ حیرانی اور استعجاب سے انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ پڑھا تو تھا کہ پانی ۷۲ فیصد حصہ پہ ہے اور اُس جگہ آبادی بھی اسی نسبت سے زیادہ ہے، مگر یقین نہیں تھا۔ بھلا کتنی قسم کی مچھلیاں ہو سکتی ہیں جب کہ پانی کتنی جگہ۔۔۔۳۶٫۰۰۰ فٹ گہرا ہے اور مچھلیاں ۲۰٫۰۰۰ فٹ تک ملتی ہیں۔ اب دیکھا تو اس حقیقت پر یقین آ گیا کہ واقعی سمندری زندگی۔۔۔ ۲۰٫۰۰۰ قسم کی ہو سکتی ہے۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ بیس ہزار اقسام تو ہم ڈھونڈ چکے ہیں۔ ابھی جانے کتنی قسمیں ایسی ہیں جو نا معلوم ہیں۔ اِن اقسام میں چھوٹی انگلی جتنی مچھلیاں بھی ہیں اور ۱۰۰ فٹ لمبی ۸۰ ٹن وزنی مچھلیاں بھی ہیں۔ ایک دفعہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ ایک چھوٹے سے سمندر میں تقریباً دس ہزار قسم کی مچھلیاں ہوتی ہیں۔ یہاں بلیک پول کے ایکوریم میں مچھلیاں دیکھتے دیکھتے سر چکرا گیا اور ٹانگیں تھک گئیں۔ جب آنکھوں نے دیکھنے سے انکار کر دیا تو باہر نکل آئے، ورنہ یوں لگ رہا تھا کہ اس وسیع و عریض ہال میں ہم مچھلی بنے تیر رہے ہیں۔

Marfat.com

قصص الانبیاء میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا قصہ پڑھا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے حضرت سلیمانؑ کو مشرق و مغرب بلکہ سارے جہان کی سلطنت دی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ "مجھے سارے عالم کی مخلوق انسان، حیوان، چرند پرند، درندوں حتیٰ کہ کیڑے مکوڑوں کی ایک دن کی دعوت کرنے کی اجازت دی جائے۔" غیب سے ندا آئی "اے سلیمان! میری موجودات اور مخلوقات بے انتہا ہیں اور میں ہی سب کو روزی پہنچاتا ہوں۔ ان سب کو تم نہیں کھلا سکتے۔" مگر حضرت سلیمانؑ نے دوبارہ یہی استدعا کی جسے اللہ تعالیٰ نے منظور کر لیا۔

حضرت سلیمانؑ نے ایک سال آٹھ مہینے کی مدت کے بعد وہ علاقہ تیار کیا جہاں دعوت کر لی تھی۔ یہ سمندر کا کنارا تھا۔ جنوں اور انسانوں نے مل کر ۲۲ ہزار گائیں ذبح کیں اور دو ہزار سات سو دیگیں پکائیں۔ ہر دیگ ایک تالاب کی مانند تھی۔ جب کھانا تیار ہو گیا تو ایک مچھلی نے سمندر سے سر باہر نکالا اور حضرت سلیمانؑ سے عرض کی کہ میں بھوکی ہوں، مجھے پہلے کھلا دیا جائے۔ حضرت سلیمان نے کہا، اچھا۔ اب مچھلی نے ایک لقمہ لیا اور سارا کھانا کھا لیا۔ پھر اور کی خواہش کی۔ حضرت سلیمانؑ یہ ماجرا دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔ ہوش آیا تو سجدے میں سر رکھ کر توبہ کی اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر معافی مانگی کہ "اے اللہ! بے شک روزی دینے والا مجھ کو اور ساری مخلوق کو تو ہی ہے۔ میں نادان اور مسکین ہوں، تو دانا و توانا ہے۔ مجھے معاف کر دے۔" کہتے ہیں کہ اس دن تمام خلائق جو مدعو تھی، بھوکی رہی۔

Marfat.com

واقعی خداوند کریم کی مخلوق بے انتہا ہے۔ زیر آب علاقے جو بے انتہا تاریک اور یخ بستہ سردی کے حامل ہیں وہاں بھی مچھلیاں موجود ہیں اور اُن کی خوراک بھی۔ وہاں مچھلیوں کے جسم فاسفورس کی وجہ سے چمک رہے ہوتے ہیں جو غوطہ خور ان گہرائیوں میں گئے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے سمندری فرش پر حیران کن نظارہ دیکھا۔ گہرے سیاہ اندھیرے میں کئی ملین روشنیاں تیرتی پھر رہی تھیں۔ حتیٰ کہ کئی شارک مچھلیاں اپنا رستہ دیکھنے کے لئے جسم کو روشن کر لیتی تھیں۔ یہ نظارہ ان کے ہوش اڑا دینے کے لئے کافی تھا۔

فش ایکوریم سے باہر نکلے تو بلیک پول کے تین PIER میں سے ایک پر جا بیٹھے۔ ہمارے ارد گرد کافی لوگ بیٹھے سمندر کا نظارہ کر رہے تھے۔ دو تین جوڑے تو سرِ عام بوس و کنار میں مشغول تھے۔ مگر کسی نے آنکھ اٹھا کر ان کی طرف نہ دیکھا۔ بڑی حیرانی ہوئی۔ ہمارے ہاں تو لوگ ہنگامہ کر دیں۔ ساحلِ سمندر پر بھی ننگی لاشیں لیٹی ہوئی تھیں مگر ہر کوئی اپنے آپ میں مگن تھا یا اپنے ساتھی میں۔ بہر حال دوسروں سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔
بلیک پول میں ہی ہم مادام تساد کی نقل میں بنایا ہوا WAX HOUSE دیکھ رہے تھے۔ اُس میں ایک HORROR HOUSE بنایا ہوا تھا جس میں گھپ اندھیرا تھا۔ ڈراؤنی آوازیں، دہشت زدہ چیخیں اور خوفناک کراہیں سنائی جا رہی تھیں۔ ڈرنا تو ہم نے کیا تھا۔ بس بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ ابھی کوئی شخص میرا پرس چھین کر نہ بھاگ جائے یا کوئی اور فضول حرکت نہ کر بیٹھے۔ مگر سبھی لوگ خاموشی سے دیکھ رہے تھے اور چلتے جا رہے تھے۔ نہ دھکا نہ

Marfat.com

ٹھوکر۔ یہاں کے معاشرے میں بُری باتیں بھی ہیں، مگر ساتھ ساتھ اچھی باتیں بھی موجود ہیں۔ میں نے وہیں سمندر کے کنارے کئی معذور بوڑھوں کو کرسی پر بیٹھے دیکھا جن کے پوتے یا نواسے دھکیل کر لاتے تھے۔ ویسے بھی یہ معاشرہ بوڑھوں، معذوروں، بیماروں اور بے روزگاروں کی جنت ہے۔ سوشل سیکورٹی والے روزانہ باقاعدگی سے ان لوگوں کے گھروں میں جاکر حال پوچھتے اور مدد امداد کرتے ہیں جن کا کوئی نہیں۔ سگری صاحب بتا رہے تھے کہ قیدیوں کو جیل میں ٹی وی گیمز اور دل بہلانے کا سامان مہیا کیا جاتا ہے۔ قیدیوں سے جیلر باقاعدہ پوچھتے ہیں کہ اُن کو کوئی پرابلم تو نہیں۔ خود سگری صاحب نے پاکستانی قیدیوں کے لئے حلال گوشت مہیا کروایا۔ اسلامی مساوات کا جو تصور یہاں ہے وہ اسلامی ممالک میں بھی نہیں۔ یہاں نہ کوئی آقا ہے نہ غلام۔ شام کو کالج کا پروفیسر اور جمعدار ایک ہی ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ چوکیدار کو SECURITY OFFICER کہتے ہیں تاکہ اس کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔ اجتماعی طور پر دیکھیں تو یہ معاشرہ بڑا اچھا ہے۔ ہاں، انفرادی طور پر اِن میں بعض باتیں قابلِ نفرت ہیں۔ آپ کو کسی قسم کی تکلیف ہے تو ۹۹۹ پر فون کیجئے، لیکن کوئی ہمسایہ آپ کی مدد کو نہیں آئے گا چاہے آپ مرتے مر جائیں۔ یہاں ہر شخص کو نانِ جویں بلکہ آبِ زریں بھی حاصل ہے۔ اگر آپ بے روزگار ہیں تو یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ آپ کو الاؤنس بھی دے اور کام بھی مہیا کرے۔ اگر آپ کو ایک کام پسند نہیں آتا تو دوسرا کام بتایا جائے گا۔ پولیس بار بار آپ کے گھر آئے گی کہ فلاں کام پر جائیے۔ آخر انسان تنگ آکر کام شروع کر دیتا ہے۔ خیر آج کل کا حال دگرگوں تھا۔ حکومت کام تو مہیا کر نہیں سکتی تھی، الاؤنس ضرور دے رہی تھی۔

Marfat.com

صفائی ستھرائی تو اس قدر ہے کہ کیا کہنے۔ گوشت کی دکان پر جائیں تو دل چاہتا ہے کہ وہیں کھڑے رہیں۔ گوشت کی شکل اور پیکنگ اتنی عمدہ ہے کہ آپ کو اوجھڑی تک ٹکڑوں میں کٹی صاف کی ہوئی مل جائے گی۔ یہ نہیں کہ مکھیوں کی یلغار ہے اور گاہکوں کی قطار! گھنٹوں کھڑے ہونے کے بعد جو گوشت ملے گا اس میں چھیچھڑوں کی بھرمار ہوگی۔ یہاں ہر چیز کی قیمت مقرر ہے اور صحیح چیز ملتی ہے۔ ظفر نے امریکہ میں ہمارے لئے خربوزے خریدے۔ سبھی میٹھے نکلے۔ میں نے کہا "شکر ہے، پھیکا کوئی نہ نکلا"۔ ظفر کہنے لگا "باجی! یہاں تو پھیکے خربوزے کا بیج ہی ضائع کر دیا گیا ہے حکومت اور عوام خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے ہیں، اس لئے چیزوں کا معیار اعلیٰ ہوتا جاتا ہے۔"

بلیک پول کی سیر سے اب تھک گئے تھے اس لئے واپسی کا ارادہ کیا۔ PIER پر واقع کھیلوں سے بھی دل بہلایا۔ جہاں کار پارک کی تھی راہ کار استہ ہی بھول چکے تھے۔ کئی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کے بعد اپنی پارکنگ کی جگہ ملی۔ وہاں سے کار لی اور چل پڑے۔ واپسی پر کئی گاڑیاں رواں دواں نظر آئیں۔ کچھ لوگ جا رہے تھے، کچھ ہماری طرح واپسی کے سفر میں تھے۔ ایک ریسٹ ہاؤس پر رک کر چائے پی۔ وہاں ہائی وے کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پیٹرول پمپ، کیفے، لیٹرین اور پارک وغیرہ بنا دیئے جاتے ہیں تاکہ سفر کے دوران اگر لوگ رک کر آرام کرنا چاہیں تو اُن کی ضرورت کی ہر چیز مل جائے۔ حتیٰ کہ بچوں کیلئے جھولے سلائیڈز SWINGS وغیرہ بھی لگاتے ہوتے تھے۔ خدا خدا کر کے سفر ختم ہوا، ہم تو

Marfat.com

تھک کر چور ہو گئے تھے۔ بستر پر پڑے اور سو گئے۔ کیونکہ آنے والا کل بھی اپنی مصروفیت ہمراہ لے کر آ رہا تھا۔ اب تک تو ہم ننھے منے کولمبس بن چکے تھے۔ روز اک جہانِ تازہ کی سیر کرتے تھے بلکہ یہ حالت تھی کہ

راستہ جس طرف چل پڑا چل پڑے
راستہ جس طرف مڑ گیا مڑ گئے!

یارک و یارک منسٹر و یارک میوزیم

۱۵/ اگست ۱۹۸۳ء

آج ہمارے پاس چار بجے تک کا وقت تھا۔ پھر سلیم صاحب کے رشتہ داروں کو آنا تھا اور ہمیں اپنے ہاں لے جانا تھا۔ صبح ناشتہ کے بعد اختر صاحب اور تسنیم نے بیٹھ کر صلاح کی کہ اس تھوڑے سے وقت میں جو بہترین چیز یا جگہ دکھائی جا سکتی ہے دکھا دی جاتے۔ قرعۂ انتخاب YORK کے شہر پر پڑا۔ میں نے اس سے پہلے انگلینڈ یاترا سے واپس آنے والوں سے یارک کے متعلق کچھ نہ سنا تھا اس لئے حیرت ہوئی۔ ہاں یہ معلوم تھا کہ انگلینڈ کے بادشاہ کے دوسرے بیٹے کا ٹائیٹل "ڈیوک آف یارک" ہوتا ہے۔ لیکن اختر صاحب نے یہ بتایا کہ یارک انگلینڈ کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک ہے اور اس کی بنیاد رومن گورنر نے اس وقت رکھی تھی جب انگلینڈ کے اصل باشندے اجڈ، جنگلی، وحشی اور تہذیب سے بے بہرہ تھے اور رومنوں کے تہذیب و تمدن کا شہرہ چار دانگ عالم میں تھا۔ چنانچہ اِن وحشیوں کو قابو میں رکھنے کے لئے رومنوں نے مضبوط قلعے بنائے۔

Marfat.com

یارک شہر میں آج بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی CLIFFORD TOWER
کی صورت میں موجود ہے۔ یہاں سے رومن شمالی انگلستان کے باسیوں کو
کنٹرول کرتے تھے اور جنوبی انگلستان پر حکومت کرنے کیلئے بھی یہی شہر دارالخلافہ
قرار پایا تھا۔ چونکہ یہ انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کی تقریباً درمیانی سرحد
کے نزدیک ہے، اس لئے یہ دَور قدیم سے لے کر دَورِ جدید تک ہمیشہ اہمیت
کا حامل رہا۔

شگری صاحب کی باتیں سُن کر واقعی ہم دونوں قائل ہوگئے کہ
یارک شہر ضرور دیکھنا چاہیئے۔ تسنیم کہنے لگیں: "مسرّت! تمہیں تاریخ جغرافیہ سے
دلچسپی ہے نا۔ تو تمہارے لئے یہ امر بھی اہمیت کا حامل ہوگا کہ اعظم کانسٹائن
کی جس نے قسطنطنیہ کے شہر کی بنیاد رکھی تھی، اسی شہر میں تاج پوشی ہوئی
تھی۔ وہ اپنے باپ قنسیٹن کورس (CONSTANTIENS CHOLORUS)
کے ہمراہ یارک آیا ہوا تھا کہ اس کا باپ ایک مختصر علالت کے بعد یہیں وفات
پا گیا۔ چنانچہ نوجوان شہزادے کی تاج پوشی کی رسم یہیں ادا کی گئی —
کانسٹائن کے والد کے علاوہ ایک اور رومن شہنشاہ کی وفات بھی یہیں ہوئی
تھی"۔ میں نے تسنیم کے آگے ہاتھ جوڑے کہ بخشو بی۔ اب اور زیادہ رومن
شہنشاہوں کو موت کے گھاٹ نہ اتارو اور ہم واقعی کمر باندھے تیار کھڑے
ہیں، چلو سفر کی بسم اللہ کریں۔ سلیم بھی کچھ کچھ یارک شہر کے رعب میں آ
گئے تھے۔ کہنے لگے۔ واقعی شگری صاحب کا انتخاب لاجواب ہے اور ہماری
قسمت بھی کہ اتنے کم وقت میں تاریخی لحاظ سے ایسا مالا مال شہر دیکھیں گے۔
چنانچہ دو گاڑیاں آگے پیچھے بریڈ فورڈ سے روانہ ہوئیں۔ راستے میں

Marfat.com

انگلینڈ کی کنٹری سائیڈ دیکھی. کیا صاف ستھری فضا اور دلکش نظاروں کے حامل گاؤں تھے کہ دل چاہتا تھا یہیں کہیں اتر جاؤں. ان گھاٹیوں، جھاڑیوں اور پھولدار بیلوں سے بھری پہاڑیوں میں گم ہو جاؤں، مگر بقول غالب ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اس لئے چپ چاپ بیٹھی قدرت کے بے پناہ حسن کے احساس سے دم بخود، کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی. یارک شہر سے کچھ فاصلے پر دو دریاؤں کا سنگم ہے. یہ دریا اوزے (OUSE) اور دریائے فاس (FOSS) ہیں. اس شہر کے ارد گرد پرانے زمانے کی ایک دیوار ہے جسے شہر پناہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے. دیوار کے اوپر سے یارک کے سب سے بڑے گرجا گھر YORK MINISTER کا بڑا خوبصورت نظارا ہے. سب سے پہلے ہمیں یارک کا قلعہ دکھایا گیا جسے WILLIAM THE CONQUEROR نے بنوایا تھا. شروع میں تو اس قلعے کے گرد لکڑیوں کی FENCE بنا دی گئی تھی، پھر مٹی کی دیوار بنی جو بعد میں پتھر کی مضبوط دیوار میں تبدیل ہو گئی. جوں جوں شہر نے ترقی کی، اس کا ایک خاص تشخص بن گیا. یہاں پر تیرھویں صدی میں چالیس کے قریب گرجا گھر تھے جہاں مذہبی تعلیم دی جاتی تھی. دور دراز سے لوگ علم حاصل کرنے آتے تھے. حتیٰ کہ یارک کو مذہبی طور پر مقدس مقام کا درجہ مل گیا. سولھویں صدی میں جب ہنری ہشتم (جس کی چھ بیویاں تھیں) نے پوپ سے اختیارات حاصل کئے تو اس شہر کو بھی کافی نقصان پہنچا. جہاں مذہب کی اہمیت کم کی گئی وہاں گرجاؤں اور مذہبی اداروں کو

Marfat.com

بھی نقصان پہنچایا گیا۔ پھر بھی دیگر شہروں کے مقابلے میں یہ شہر منتخب روز گار ضرور رہا۔ یہاں اسکاٹ لینڈ اور انگلینڈ کے شہزادوں اور شہزادیوں کی شادیاں انجام پائیں۔ یہ انگلینڈ کا شمالی دارالخلافہ رہا۔ انگلینڈ کی سول وار جو بادشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان ہوئی، اس میں بھی یارک میں موجود یادگاروں کو تباہ کرنے کی کوشش کی گئی مگر پارلیمنٹ کی آرمی کے ایک یارکش افسر نے یارک منسٹر کو تباہی سے بچا لیا۔ جبھی ہم آج پرانی نادر اشیائ اور مقامات دیکھ سکتے ہیں۔ ورنہ اگر یہ یارکش افسر نہ ہوتا تو یارک آج اپنی اہمیت کھو چکا ہوتا۔ جہاں یارک کے لوگوں کو یارک سے محبت ہے، وہاں یارک بھی اپنے باسیوں سے پریم کرتا ہے۔

یارک کے ایک باسی GAY FAWKS نے ۵ نومبر کو ہاؤس آف پارلیمنٹ گن پوڈر سے اڑا دینے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا۔ آج کل جب کہ ۵ نومبر کو تمام انگلینڈ میں گئے فاکس کا پتلہ جلایا جاتا ہے اور پھلجڑیاں چھوڑی جاتی ہیں، مگر یارک شہر میں کوئی اس رسم میں حصہ نہیں بنتا ہے، خصوصاً سنٹ پیٹرز سکول آف یارک میں یہ کھیل نہیں ہوتا کیونکہ گئے فاکس نے وہیں تعلیم پائی تھی اور اسکول والے اپنے اولڈ اسٹوڈنٹ کو نہیں جلاتے۔ موجودہ یارک تمام زمانوں کا ملغوبہ ہے۔ یہاں ۱۹۶۳ء میں یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی اور اب یہ دوبارہ علم و ادب کا گہوارا بن چکا ہے۔ جارج ششم نے ٹھیک کہا ہے کہ یارک کی تاریخ انگلستان کی تاریخ ہے۔ یارک میں یارک منسٹر کی موجودگی تمام شہر پر حاوی ہے۔ دن میں اس کی خوبصورتی اور رات میں بے پناہ روشنی سبھی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یارک منسٹر

Marfat.com

میں داخل ہونے کے وقت سے لے کر نکلنے تک انسان حیرت و استعجاب کے احساسات سے دوچار رہتا ہے۔ اس کی دیواریں، چھتیں، کھڑکیاں، اندرونی آرائش، غرضیکہ ایک ایک چیز دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ چیپٹر ہاؤس (CHAPTER HOUSE) انسانی ہاتھ کی کاریگری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کی تکونی چھت بغیر ستونوں کے جیومیٹری کے OCTAGO - MALAR ڈیزائن پر تیار کی گئی ہے۔

یارک منسٹر (گرجا) سنٹ پیٹرز کی یاد میں بنایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی دروازے پر اس کا مجسمہ ایستادہ ہے۔ یارک منسٹر کو کئی دفعہ نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک دفعہ نارمن حملے کے دوران، ایک دفعہ ایک آدمی کی لاپرواہی سے جلتی لالٹین کی وجہ سے، حتیٰ کہ ۱۴ جولائی ۱۹۸۴ء کو "جنگ" لاہور نے ایک تصویری خبر دی کہ یارک منسٹر میں آگ لگنے سے جو نقصان ہوا ہے اسے آرک بشپ دیکھ رہے ہیں۔ اس کی مرمت اور RESTORATION پر بے انتہا خرچ آتا ہے۔

میں نے سفر کے دوران کئی گرجا گھر دیکھے، مگر یارک منسٹر اپنی خوبصورتی، دلآویزی اور نزاکت میں بے مثال ہے۔ یارک منسٹر سے باہر نکلے تو کافی تھکے ہوتے تھے۔ راستے میں ایک کیفے میں گئے اور مچھلی اور چپس کا آرڈر دیا کہ یہی انگلینڈ کے باسیوں کی خوراک ہے۔ ہم نے بھی سوچا کہ:

DO IN THE ROME AS THE ROMANS DO

مگر سلیم صاحب چونکہ ذرا انفرادیت کے قائل ہیں، اس لئے انہوں نے STEAKS کا آرڈر دیا۔ جب STEAKS آئے تو بیف کے نہیں تھے بلکہ

Marfat.com

کسی پلے پلائے چربی والے دنبے کے تھے۔ گوشت بھی سخت تھا نتیجہ یہ نکلا
کہ میری مچھلی تیرتی ہوئی ان کی پلیٹ میں اور ان کا دنبہ پھسلتا ہوا میری طرف
آ گیا۔ پھر درویش برجانِ درویش کے تحت سٹیک کو کھانے کی ناکام کوشش
کی تنگ آ کر چھوڑ دیا۔ کیفے سے بھی یارک منسٹر کی عمارت نظر آ رہی تھی سورج
کی روشنی میں سفید پتھروں پر کی گئی کاریگری اور ہنرمندی خوب نمایاں
تھی میں نے اردگرد کے لوگوں کو کھانے میں دل و جان سے مصروف دیکھا
تو سوچا کہ یہ نفسانی خواہشات کے غلام بھلا آرٹ کی قدر کیا جانیں میں
اِن سے یقیناً بلند تر ہوں کہ کیفے میں بیٹھ کر بجائے فش اینڈ چپس کے
ایک شاندار اور پُرشکوہ یادگار دیکھ رہی ہوں۔

اب بھی تازہ دم ہو چکے تھے اس لئے یارک میوزیم دیکھنے کا پروگرام
بنا جس میں مختلف ادوار کے ظروف، آرائشی اشیاء، کاشتکاری کے آلات،
لباس، حتیٰ کہ پرانے زمانے کی سوئٹس، شاپس، پوسٹ آفس، جنرل سٹورز
بنک، ڈرگ سٹور وغیرہ اسی حالت میں اسی سامان کے ساتھ سجائے گئے
تھے۔ یہ میوزیم انگلستان کے وسیع ترین عجائبات میں سے ایک ہے۔ اس میں
تاریخ کے طالب علم کی دلچسپی کا پورا سامان ہے۔ یہ تن تنہا ایک شخص کی محنت و
کاوش کا نتیجہ ہے، اور وہ شخص ہے ڈاکٹر جان کرک! ڈاکٹر جان اپنی
پریکٹس کے دوران مختلف گھرانوں میں جایا کرتے تھے جن میں امرا بھی تھے،
غریب کسان اور مزدور پیشہ لوگ بھی۔ انہوں نے لوگوں کے گھروں میں
نادر اشیاء دیکھیں تو سوچا کہ کیوں نہ اِن چیزوں کو جمع کیا جائے۔
کبھی تو وہ اپنی فیس کے بدلے کوئی پرانی گھڑی لے لیتے، کبھی مہنگے

Marfat.com

داموں پرانے برتن خریدتے۔ کبھی کوئی تحفتاً قدیم اشیاء اِن کے حوالے کر دیتا۔ لوگوں کو ڈاکٹر جان کے شوق کا علم ہوا تو پرانے تالے، چابیاں، انگیٹھیاں، سائیکلیں، ڈبے، صندوق غرضیکہ جو کچھ جسے ملا ان کے حوالے کر دیا۔ ڈاکٹر جان کا گھر، گیراج، کمرے اِن چیزوں سے بھر گئے حتیٰ کہ خود گھر والوں کے رہنے کی جگہ بھی نہ بچی۔ آخر کار انہوں نے تمام اشیاء کی نمائش کے لئے ۱۷۰۸ء کا بنا ہوا زنانہ جیل حکومت سے حاصل کیا اور اپنے ذوق کے مطابق تمام اشیاء کو ترتیب دیا جب لوگ نمائش گاہ میں داخل ہوتے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بجائے چیزوں کو میزوں اور الماریوں میں ٹھونسنے کے ڈاکٹر صاحب نے باقاعدہ پرانے زمانے کی گلیاں اور بازار بنا کر ان میں اس دور کی چیزیں رکھی ہیں۔ مختلف عہد کے کمرے بنائے ہیں۔ کوئی وکٹورینا کوئی جارجین حتیٰ کہ دَور جدید کا بھی کمرہ تھا جہاں ٹی وی سیٹ رکھا تھا۔ ہر کمرے میں اس عہد کے طرز آرائش کے مطابق سامان رکھا گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے مکین ابھی ابھی اٹھ کر گئے ہیں۔ کئی کمروں میں مکین بھی اسی دَور کا لباس پہنے موجود تھے۔ عام عجائب گھروں سے ہٹ کر مختلف طریقے پر سجائے جانے کی وجہ سے یہ برطانیہ کا بہترین "لوک ورثہ" کا عجائب گھر بن گیا ہے اس سے ذہن پر بے حد خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ دلچسپی بھی آخر دم تک برقرار رہتی ہے، نہ تھکاوٹ نہ بوریت، دیکھنے والا ایک جادو اور سحر کے تحت دیکھتا چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں تقریباً ہر سال ۷ لاکھ آدمی آتے ہیں اور اپنے ذوق کی تسکین پاتے ہیں۔

ڈاکٹر کرک نے ۱۹۳۵ء میں اِن اشیاء اور نوادرات کو نمائش کے لئے پیش کیا اور ۱۹۳۸ء میں اس دارا لفنا سے کوچ کر گیا۔ مگر آج

Marfat.com

بھی اس کا نام زندہ ہے۔ میوزیم میں بھی ایک اسٹریٹ اس کے نام سے منسوب ہے۔ اب میوزیم میں لگتا ہے بہت تبدیلیاں کی جاتی ہیں اور دن بدن اس کی ترقی اور تزئین میں اضافہ ہو رہا ہے۔ وہاں پھرتے پھراتے اور زمانے کے گزرنے کے ساتھ آتی ہوئی مختلف النوع تبدیلیوں کو دیکھتے ہوئے بے حد مزا آیا۔ کاش ہمارے لوک ورثہ والے بھی ایسے ہی عجائبات کا انتظام کریں۔

شگری صاحب کو ابھی کچھ اور بھی دکھانا مقصود تھا۔ یارک شہر دیکھا، یارک میوزیم دیکھا، یارک منسٹر دیکھا۔ اب وہ یارک کے اردگرد واقع دریاؤں کی سیر کروانا چاہتے تھے چنانچہ دریائے اوز کے کنارے لے گئے۔ دونوں کناروں پر واقع مکانوں کے مکین کناروں پر کھڑے ہو کر بہ آسانی بات چیت کر سکتے تھے۔ اس سے آپ اندازہ لگالیں کہ کتنا لمبا چوڑا دریا ہو گا۔ مگر ہم جیسے سیاحوں کو پر چانے کے لئے وہاں بھی کشتیوں کا انتظام تھا۔ بس تو باہر ہر ننھی منی چیز دیکھ کر EXCITED ہو جاتی تھی، فارن پھر فارن ہے۔ مگر سلیم صاحب نیاگرا فال دیکھ کر بھی متاثر نہ ہوئے تو دریائے اوز تو اس کے سامنے ایک چھوٹا سا نالہ تھا۔ انہوں نے شور مچایا کہ گھر واپس چلیں۔ شگری صاحب کو غصہ کہ اتنا کم وقت کیوں لے کر آتے ہیں۔ واپسی پر وہ بات نہ کریں۔ تسنیم کہنے لگیں کہ آج کونسیٹ میں مقامی پاکستانیوں کا اجتماع ہے۔ پاکستان کے موضوع پر مقالے اور تقاریر ہوں گی۔ یہ فنکشن تو دیکھ لو۔ مگر ہمیں سخت مجبوری، وقت کم سفر زیادہ۔ بھاگم بھاگ گھر پہنچے تو ہمارے رشتہ دار دو گاڑیاں لئے ہمیں لینے آن پہنچے۔ شاید ان کا خیال ہو گا کہ ایک گاڑی ان دونوں کے لئے کم نہ پڑ جائے۔ مگر ایسی تو کوئی بات نہ تھی۔ تسنیم

Marfat.com

نے جلدی سے چائے بنائی، پکوڑے تلے، اکٹھے بیٹھ کر الوداعی باتیں کیں۔ تسنیم اور اختر صاحب کے ساتھ بڑا اچھا وقت گزرا تھا۔ باچشم نم رخصت چاہی۔ اچھی اچھی پیاری پیاری یادوں کا سرمایہ لئے ہوئے BATLAY کے لئے روانہ ہوئے۔ جہاں سلیم صاحب کی تایا زاد بہن رہتی تھیں۔ راستے میں ایک اور رشتہ دار سے بھی ملاقات کی۔ باتیں کرتے کرتے معمول کے مطابق رات کے بارہ بج گئے۔ نیند نے مجھے جھٹکے دینے شروع کر دیئے۔ دیر سے سوئے اور دیر سے اٹھے۔ ناشتہ کیا اور پھر اُن سے بھی رخصت چاہی جو کافی ناراضگی کے بعد ملی۔ مگر آج میں نے اپنے بھائی جاوید کے پاس پہنچنا تھا۔ دل میں خوشی اور مسرت رقصاں تھی۔ سلیم صاحب کے دوست اور رشتہ دار حاجی لطیف صاحب ہمیں لئے DUKINFIELD کی طرف رواں دواں ہوئے۔

۱۶ر اگست ۱۹۸۳ء

آج کا سارا دن بھائی جاوید کا میرے لئے اور میرا اُن کے لئے تھا۔ بہن بھائی خوش باش، بازاروں کے چکر لگا رہے تھے، شاپنگ کر رہے تھے۔ سلیم صاحب اپنے دوست حاجی لطیف صاحب کے ہمراہ گلاسگو کے لئے روانہ ہو گئے۔ جاوید بھائی نے کہا کہ وہ مجھے کل گلاسگو پہنچا دیں گے۔ سفر میں صرف یہ واحد موقع تھا کہ میں اور سلیم علیحدہ ہوئے۔ جاوید کی بیوی انگریز ہے۔ ان کو لندن پہنچتے ہی فون کیا تھا کہ میں انگلینڈ پہنچ چکی ہوں اور جلد آپ کے پاس آؤں گی۔ وہ یہ سن کر بے حد حیران ہوئیں۔ پہلے تو انہیں یقین ہی نہ آیا کہ میں واقعی لندن سے بول رہی ہوں۔ جب یقین آ گیا تو دعوت کا

Marfat.com

سلسلہ چل نکلا کہ کہیں نہ جاؤ، ہمارے پاس آؤ، یہاں آن کر رہو، ساری سیر کروا دیں گے مگر ہم تو سلیم صاحب کے پابندِ سلاسل تھے بہرحال، آج آزادی ملی تھی۔ بھابھی بچے دیکھ کر بے انتہا خوش ہوتے۔ جاوید بھی لئے لئے پھرے کہ کچھ شاپنگ کر لو۔ اپنے دوستوں کے گھر لے گئے۔ اُن کی بیویاں بھی بڑی خوش ہوتیں۔ رات کا کھانا بھی ایک دوست کے گھر تھا۔ کھانا کھا کر واپس لوٹے۔ تو دونوں بہن بھائی نے بیٹھ کر فلم دیکھی۔ آج نیند نے یلغار نہ کی، اگرچہ رات دیر تک بیٹھے رہے۔ امی ابا کی باتیں ہوتی رہیں۔ سونے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا مگر جاوید نے کہا کہ صبح تمہیں لیک ڈسٹرکٹ بھی دکھاؤں گا۔ پھر وعدے کے مطابق گلاسگو بھی لے جانا ہے۔ اس لئے سو جاؤ۔ چنانچہ بادلِ نخواستہ سونے چلی گئی مگر ؂

بیتے دنوں کے زخم کریدے ہیں رات بھر
آتی نہ جن کو نیند وہ کیا خواب دیکھتے

Marfat.com

گراس میئر جھیل

دل آویزی و رعنائی کا شاہکار

۱۷/اگست ۱۹۸۴ء

آج صبح نیند کھلی تو جاوید بھائی نیچے کچن میں چائے تیار کر چکے تھے۔ ساتھ ہی مختلف قسم کے بسکٹ، پیٹیز وغیرہ رکھے تھے کہ یہی ناشتہ ہے آکر کر لو۔ جلدی جلدی تیار ہوئے اور ناشتہ کیا۔ پھر لیک ڈسٹرکٹ دیکھنے کے لئے چل نکلے۔ ویسے جانا تو گلاسگو تھا مگر راستے میں گراس میئر جھیل بھی دیکھنے کا پروگرام بنا ڈالا، کیونکہ اس کی بے پناہ تعریف سنی تھی۔ پھر قدرتی مناظر کے رسیا اور بانی شاعر ورڈز ورتھ نے بھی یہیں زندگی گزاری اور دفن بھی یہیں ہوا تھا۔ صبح ۱/۲ ۱۰ بجے ہمارا سفر شروع ہوا۔ جب CARLASTE کے نزدیک پہنچے تو جاوید بھائی نے بتایا کہ یہ جگہ اصل میں اسکاٹ لینڈ اور انگلینڈ کے درمیان واقع ہے۔ یہیں نزدیک ہی بارڈر لائن ہے۔ شروع میں جب میں یہاں سے گزرتا تھا تو یہاں کے ایک بورڈ پر لکھا ہوتا تھا:

HASTEN YE BACK TO SCOTLAND

یعنی انگلینڈ جانے والوں کو کہا جاتا ہے کہ جلدی جلدی اسکاٹ لینڈ واپس آنا۔ اسکاٹ لینڈ اپنی خوبصورت جھیلوں، ناہموار سطحِ زمین، سرسبز میدانوں،

Marfat.com

جھرنوں، چھوٹی چھوٹی آبشاروں، پرانے زمانے کے محلات اور قلعوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ سفر شروع ہوا تو ہلکی ہلکی بارش نے بھی ساتھ دیا۔ گاڑی کی تیز رفتاری کے باعث خوبصورت نظارے ایک جھلک دکھاتیں اور گزر جاتیں۔ جا بجا پھلواریاں تھیں، کہیں سرسبز کھیتوں میں گائیں چرتی نظر آتیں۔ بارش بند ہوتی تو ہر چیز نہائی نہائی ہوئی لگنے لگی۔ صاف شفاف آسمان، چمکتے ہوئے بادل اور ہموار موٹر وے جس پر گاڑی تیزی چلی جا رہی تھی۔ میں نے جاوید بھائی سے کہا کہ اگر ہمارے ملک میں بھی ایسے ہی موٹر وے یا ہائی وے تیار ہو جائیں تو سفر کتنا آسان اور مزیدار بن جائے۔ جاوید بھائی کا مطالعہ وسیع اور معلومات بے شمار ہیں۔ کہنے لگے کہ جنگِ عظیم کے بعد سب سے پہلے جرمنی نے موٹر وے شروع کیے تھے، برمنگھم سے لندن تک پہلا موٹر وے ہے جو برطانیہ میں بنا، اس کا نام ۱۔M رکھا گیا۔ یہ تقریباً ۱۹۶۱ء یا ۱۹۶۲ء میں مکمل ہوا۔ اس کی لمبائی ۹۰ میل ہے۔ لوگوں کو اس پر تیز رفتار گاڑیاں چلانے کا اتنا شوق تھا کہ شروع شروع میں خوب ایکسڈنٹ ہوتے، مگر بعد میں رفتار کی حد مقرر ہو گئی۔ اب تو گلاسگو سے الیکٹرک ٹرین چلتی ہے جو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ۴½ گھنٹے میں لندن پہنچا دیتی ہے۔ زمانہ انتہا کی تیز رفتاری سے آگے ہی آگے بڑھ رہا ہے۔ ہمارا سفر بھی کافی تیز تھا۔ موسم بے انتہا خوشگوار۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جسم سے ٹکراتی تو سکون بخش احساس جاگ اٹھتا۔ آسمان پر تیرتے بادل اور ان کی اوٹ میں جھانکتا نیلا آسمان، نیچے مخمل جیسی ریشمی گھاس کے سرسبز میدان، میدانوں سے پرے مختلف لائنوں میں بٹے ہوئے کھیت اور ان میں چرتی ہوئی گائیں، پل پل بدلتے مناظر، ایک

Marfat.com

سے ایک دلفریب و دلکش، یوں لگتا تھا جیسے کوئی باتصویر کیلنڈر مسلسل دیکھے جا رہے ہیں اور ورق پلٹتے جا رہے ہیں۔ سامنے ایک سے ایک خوشنما منظر آ رہا ہے۔ خوب سے خوب تر۔ اب اس علاقے میں بارش تیز ہو گئی۔ کچھ چڑھائی کا علاقہ بھی شروع ہو گیا۔ آس پاس کی پہاڑیاں بادلوں کی گہری کالی چادر اوڑھے بڑے دلکش اور باوقار انداز میں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ گاڑی کے آگے پیچھے وائپر مسلسل چل رہے تھے۔ دامانِ نگاہ تنگ و گلِ حسن بسیار والا معاملہ تھا۔ ایسا سرسبز و شاداب علاقہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ممکن ہے میرا وہی حال ہو جو سودا کا ہوا تھا ؎

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس حال میں دیکھا

اب ہم موٹروے سے اتر کر NORTH LAKES کے روٹ پر جا رہے تھے۔ بادل دھند کی شکل میں آ کر کبھی راستہ روک کر کھڑے ہونے پر مجبور کرتے کہ رک جاؤ اور دیکھو یہاں قدرت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے۔ مگر ہمیں جلدی کہ سلیم صاحب گلاسگو میں انتظار کر رہے ہوں گے۔ PENURA DUCK نامی پیٹرول پمپ آیا تو جاوید نے گاڑی روکی کہ پیٹرول بھی لیں اور راستہ بھی پوچھیں۔ شاید پیٹرول پمپ میں کوئی زمین دوز تار بچھائی ہوئی تھی۔ جیسے ہی ہماری گاڑی پیٹرول پمپ میں داخل ہوئی، ملحقہ گھر میں گھنٹی بجی اور ایک بوڑھی عورت باہر نکلی۔ ہم نے راستہ پوچھا تو وہ گھر سے نقشہ اٹھا لائی جاوید کو اچھی طرح سمجھایا۔ پوچھنے لگی کہ یہ علاقہ تو لیک ڈسٹرکٹ کہلاتا ہے۔ کئی جھیلیں ہیں۔ کون سی جھیل دیکھنا پسند

Marfat.com

کروگے۔ جاوید نے بتایا گراس میئر کہ وہ سب سے خوبصورت جھیل ہے۔ ہمارے انتخاب سے خوش ہوئی اور ہمیں ۵۹۱ A کے روٹ پر چلنے کی ہدایت کر کے خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔ وہاں سے چلے تو چائے پینے کی خواہش ہوئی۔ راستے میں WHITE HORSE INN میں چائے پی۔ پھر تازہ دم ہو کر نکلے۔ راستہ اور بھی خوبصورت ہو گیا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ ساری خوبصورتی آنکھوں میں سمو کر آنکھیں بند کر لوں۔ وہ جو ایک شعر ہے ؎

کتنے حسین لوگ تھے جو مل کے ایک بار
آنکھوں میں جذب ہو گئے دل میں سما گئے

تو یوں سمجھئے کہ لوگوں کی جگہ نظاروں نے لی تھی اور دل میں جذب ہو رہے تھے۔ پہاڑیوں کے درمیان سڑک گزر رہی تھی۔ یہ سڑک موٹروے کی طرح نہیں تھی بلکہ کہیں اونچی ہو جاتی کہیں ایک دم ڈھلوان میں نیچے چلی جاتی۔ فاصلے فاصلے پر مکان نظر آ رہے تھے۔ اب THRILL SPOT ہوٹل نظر آیا۔ ایسی THRILLING جگہ پر ایسے ہی نام کا ہوٹل ہونا چاہیئے تھا۔ ہمارے دائیں ہاتھ پر جھیل شروع ہو گئی، پرسکون، سفید چادر کی طرح زمین پر بچھی ہوئی جھیل۔ سڑک کے گرد پائین کے درختوں کا پہرا تھا۔ کبھی جھیل نظروں سے دور ہو جاتی، کبھی چاندنی جیسی سفید جھلک دکھائی۔ اسی آنکھ مچولی میں گراس میئر کا گاؤں آ گیا۔ سرسبز گھاس کے میدان میں گزرتا راستہ دور تک چلا گیا تھا۔ اسی جھیل کے کنارے ورڈزورتھ نے بیٹھ کر اپنی شہرۂ آفاق نظم DAFFODILS لکھی تھی۔ اور اپنے اردگرد کی پہاڑیوں سے متاثر ہو کر THE COCKOO اور LUCY GRAY

جیسے شہ پارے تخلیق کئے تھے۔ اب بارش رک گئی تھی۔ گاؤں میں داخل ہوتے تو PRINCE WALES HOTEL کے سامنے SINGING BIRD ریسٹورنٹ کے پاس گاڑی روکی۔ ہوٹل اور ریسٹورنٹ کا نام بھی بڑے خوبصورت تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ جاوید بھائی کہنے لگے کہ آؤ یہاں سے چلتے کا ایک ایک کپ پیتے ہیں۔ پھر تمہیں ورڈزورتھ کی جائے رہائش DOVE COTTAGE دکھاؤں گا۔ اس وقت تو میں خود اپنی قسمت پر نازاں تھی کہ ایسے حسین علاقے میں مجھے آنا تھا۔ یہ تو کبھی خواب وخیال میں بھی سوچا نہ تھا۔ وہاں سے پیدل ہی نکلے۔ گاؤں کی پرپیچ گلیوں سے ہوتے ہوتے ایک گلی میں DOVE COTTAGE کے پاس آن پہنچے۔ چھوٹا سا کاٹیج تھا، پتھروں سے بنا ہوا۔ اس کے قریب کھڑے ہو کر تصویر اتروائی تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آتے۔ اب کبھی ادھر آنا نصیب ہوگا یہ نہ توقع تھی نہ امید تھی۔ اس لئے قدرت نے اپنی فیاضی سے جو لمحات مہیا کئے تھے اُن سے خوب خوب لطف اٹھایا۔ خوشی ومسرت کے یہ جگنو ؤں جیسے لمحے ہتھیلیوں میں بند کر کے گھر لے آئی ہوں۔ اب بھی جب کبھی رات کی تنہائی میں اداسی کی لہر خاموشی سے میرے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے تو میں ان لمحات کو یادوں کے جزیرے سے نکال کر دوبارہ زندہ کر لیتی ہوں۔ اور ورڈزورتھ کی طرح ایک بار پھر خوشی حاصل کر لیتی ہوں۔ سفر کے احساسات شاید دوسروں کی بہ نسبت میرے لئے زیادہ گہرے اور دیرپا ہوں کیونکہ میرے بُرج .... کا امتیازی نشان "سفر" ہے اور سفر سے مجھے بے انتہا خوشی حاصل ہوتی ہے۔

Marfat.com

ہم اب گراس میئر جھیل کے کنارے آگئے۔ وہاں دو بنچ پڑے ہوتے تھے جن پر ۱۹۷۰ء کی تاریخ درج تھی۔ اس سے صرف چار سیڑھیاں نیچے اتر کر جھیل کے پانی کو چھو لیں یا نزدیک تر ہو کر جھیل کا خوبصورت نظارا کریں۔ قدرت کی صناعی اور شاہکار نظارے اپنی اپنی خوبصورتی میں انفرادیت لئے ہوتے ہیں۔ اب اس جھیل کے کنارے سکون و آتشی کی فضا دل کو چھو رہی تھی جبکہ نیاگرا فال کے کنارے غیظ و غضب کے شور میں قدرت کا جلال دل کو گرماتا تھا۔ شاید کسی اور کے لئے یہ نظارہ اتنا خوبصورت نہ ہوتا مگر میرے لئے تو بے حد متاثر کن تھا۔ جھیل کے ساتھ ساتھ ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر پارکنگ کے نشانات تھے کیونکہ یہ جگہ ایسی ہے کہ بار بار رک کر نظارہ کیا جائے تاکہ روح کی بالیدگی کا سامان مہیا ہوتا رہے۔ ابھی ٹورسٹ آفس نہیں کھلا تھا۔ آج اس جھیل پر پہنچنے والے ہم پہلے دو فرد تھے۔ خیال تھا کہ جھیل کے خوبصورت نظاروں کے لئے پوسٹ کارڈ لے لوں گی کیونکہ شہیلہ کی ہابی یہی ہے۔ پھر وہ ساتھ یہ بھی ہدایت کرتی ہے کہ پوسٹ کارڈ کو پوسٹ کر کے گندا نہیں کریں، صاف ستھرے اپنے ہمراہ لے آئیں۔ مگر یہ خواہش یہاں پوری نہ ہو سکی۔

اب واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ رات دیر سے سوئی تھی۔ صبح سویرے اٹھے تھے۔ پھر کھلی آنکھیں رکھ کر جگہ جگہ کرتے نظارے دیکھے تھے۔ اس لئے اب نیند آرہی تھی۔ بھائی جاوید ویسے ہی چاق و چوبند گاڑی دوڑا رہے تھے۔ GRETNA GREEN کا قصبہ آیا تو جاوید نے مجھے جگایا۔ وہ جانتے ہیں کہ میں باربرا کارٹ لینڈ کی کتابیں بہت پڑھتی ہوں اور اس قصبے کا ذکر بار بار

Marfat.com

. . . . اس کی کتابوں میں ہوا ہے کہ جن لڑکیوں کو ماں باپ کمسنی کی وجہ سے شادی کی اجازت نہ دیتے تھے وہ انگلینڈ سے بھاگ کر سکاٹ لینڈ کے اس قصبے میں آجاتی تھیں۔ انگلینڈ میں شادی کی حد سولہ سال ہے جب کہ سکاٹ لینڈ میں پندرہ سال۔ اسی لئے یہ قصبہ محبت اور رومانس کی شادیوں کے لئے مشہور ہو گیا۔ یا برا کاٹ لینڈ نے تو اپنی ایک ہیروئن کا نام ہی GRETNA رکھ دیا تھا۔ مجھے بابرا کے یہ ناول اتنے پسند تھے کہ کیا بتاؤں۔ اب بھی میری لائبریری میں سو کے قریب اس کے ناول موجود ہیں۔

سفر بڑے خوشگوار موسم میں ہو رہا تھا۔ انگلینڈ میں یہ واحد بارش تھی جو ہمیں نصیب ہوئی۔ سارا سفر نیلے آسمان تلے پیلی دھوپ میں نہاتے اور سرسبز علاقوں سے گزرتے طے ہوا تھا۔ اس وقت اودے نیلے کالے بادل ارد گرد رواں دواں تھے جو بھلے لگ رہے تھے۔ سبھی لوگ کہتے تھے کہ آپ خوش قسمت ہیں کہ اتنا اچھا موسم نصیب ہوا۔ لیکن میرا دل چپکے چپکے یہی چاہتا تھا کہ خوب برفباری ہو، سارا انگلینڈ برف کی سفید چادر اوڑھے اور میں سردیوں، گرمیوں دونوں موسموں کو اپنی شدتوں کے ساتھ انہی دنوں میں دیکھ لوں۔ مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ایسا ہونا کیسے ممکن تھا۔ دل بھی کبھی کبھی عجیب عجیب خواہشیں کرتا ہے۔ سکاٹ لینڈ کی سرزمین کے متعلق جغرافیہ کی کتابوں میں پڑھا تھا کہ یہ پہاڑیوں، دریاؤں، خاکی جھاڑیوں اور کم گھنے جنگلات پر مشتمل ہے۔ مگر میری امیدوں کے برخلاف یہ بڑی سرسبز، پل پل رنگ بدلتی، دل و نظر کے لئے طراوت اور ٹھنڈک کے احساس سے معمور نظر آئی۔ اب صبح کے ۱۰ ½ بج گئے تھے۔ جاوید اور میں سلیم صاحب

Marfat.com

کے دوست کے ہاں UDDINGSTON TOWN پہنچ گئے۔ یورپین سٹائل کا چھوٹا سا گھر تھا جس کے سامنے ننھا منھا سا باغیچہ اس میں گلاب کے رنگ برنگے پھول سورج کی پیلی روشنی میں مسکرا رہے تھے۔ وہاں پھر ناشتے کا اہتمام ہوا۔ اب جاوید بھائی نے مجھے خدا حافظ کہا ہم لوگوں کا یہ ساتھ مختصر ترین تھا۔ بے اختیار یہ شعر زبان پر آ گیا ؎

راہرو ملتے ہیں پل بھر میں بچھڑ جانے کو!
پھر بھی جاتے ہوئے چند اشک ڈھلک پڑتے ہیں

چند گھڑیوں کے میل کے بعد بہن بھائی بھاری دل اور نم آنکھوں سے جدا ہوئے۔

ایڈنبرا اور گلاسگو

اب سب کا پروگرام بنا کہ ایڈنبرا کا شہر دیکھا جائے۔ میرا ایڈنبرا سے پہلا تعارف اٹلس کے حوالے سے ہی ہوا تھا کہ اٹلس اور انسائیکلوپیڈیا پر عام طور پر اشاعت کی جگہ لندن ایڈنبرا لکھا ہوا ہوتا تھا۔ اس سے یہ تو خیال تھا کہ پڑھے لکھوں کا شہر ہے۔ اب جو حقیقت میں یہاں پہنچے تو اونچی نیچی سڑکوں، قدیم طرز کی عمارتوں، پرانے گرجا گھروں اور ایک چھوٹے سے قلعے پر مشتمل یہ شہر بڑا خوبصورت لگا۔ اُن دنوں ایڈنبرا قلعہ میں TATOO SHOW ہونے والا تھا۔ اس کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں، ٹی وی کیمرے لگ رہے تھے نشستیں تیار تھیں۔ مختلف ممالک کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ ہم لوگ قلعہ میں داخل ہوئے۔ یہ قلعہ اگرچہ لاہور کے قلعہ کی مانند وسیع و عریض تو نہیں، پھر بھی قلعہ کی روایات کے مطابق پائیدار، مضبوط اور

Marfat.com

اونچائی پر واقع ہے اس کے اندر ایک چھوٹا سا میوزیم بھی ہے جہاں ملٹری کے ہر دور کے یونیفارم، کیپ اور سٹارز وغیرہ رکھے گئے تھے، ساتھ ساتھ تاریخیں اور عبارتیں بھی درج تھیں۔ چونکہ ملٹری کا شعبہ کسی زمانے میں بھی ہم سے متعلق نہیں رہا، اس لئے سرسری نگاہ ڈالی اور نکل آئے۔ قلعہ کے اندر سوونیئر شاپ سے کارڈز خریدے۔ قلعہ کی دیوار سے دور سمندر کا نظارہ کیا۔ یہ NORTH SEA تھا جس میں ایک دو سٹیمر نظر آ رہے تھے۔ باہر نکلے تو پرنس سٹریٹ میں رونق عروج پر تھی۔ یہ ایڈنبرا کی خوبصورت ترین سٹریٹ ہے۔ شہر بھی یورپ کے خوبصورت شہروں میں سے ایک ہے۔ وہاں سے واپس گھر آئے۔ اب میں نے اپنی سہیلی منصورہ کو فون کیا۔ اس کا گھر SPRING KELL PARK میں ہے۔ بڑی پیاری جگہ پر پیارا سا چھوٹا سا گھر جسے منصورہ نے اپنے اعلیٰ ذوق کے مطابق سجایا ہوا تھا۔ اس کا گھر دیکھ کر دل بے حد خوش ہوا۔ اس کے پاس INDOOR PLANTS کا نادر ذخیرہ تھا۔ رات ہم نے وہیں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ میں اور منصورہ دیر تک کالج کے زمانے کی باتوں میں محو رہے۔ جوانی کے دور کی جو بیت گیا، حال جو گزر رہا ہے اور مستقبل کی جو دوڑتا چلا آ رہا ہے۔ منصورہ نے ہمیں گلاسگو کی سیر بھی کروائی۔ وہاں کی سڑکوں سے گزرتے بارہا خیال آیا کہ بھائی علیم مرحوم اِن جگہوں سے گذرتے ہوں گے۔ یہ عمارتیں اس وقت ایسے ہی تنی کھڑی ہوں گی، مگر انہیں تہہ خاک ہوئے نو سال بیت گئے۔ بھلے وہ زندہ رہتے چاہے یہیں بستے ۔

آیا تھا اک ٹوٹتے ہوتے چاند کا خیال
تارے ہزار ٹوٹ کے دامن میں آ گرے

Marfat.com

وہ مدتوں اسی شہر میں رہائش پذیر رہے۔ میں نے سات آٹھ سال کی عمر میں گلاسکو کا نام سنا تھا اور سوچتی تھی کہ وہ کیسا ظالم شہر ہے جس نے ہمارا بھائی ہم سے چھین لیا۔ ۱۹۵۱ء کے گئے ہوئے وہ ۱۹۷۲ء میں اکیس سال کی طویل مدت کے بعد پاکستان آئے۔ اس وقت میرے تین بچے ہو چکے تھے۔ صرف ایک ماہ کا قلیل عرصہ یہاں گزارا اور چلے گئے۔ ہمارے پاس تو اُن کی یاد کا صرف ایک ماہ ہی ہے۔ یہ شہر ہی خوش نصیب تھا کہ وہ مدتوں یہاں رہے۔ اس کی سڑکوں پر گزرتے ہوئے ان کی یاد آتی اور بے تحاشا آتی۔ ۱۹۷۴ء میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پاکستان چلے آئے کبھی نہ جانے کے لئے۔ آج جہلم کے قبرستان میں اپنے امی ابو کے پاس محو خواب ہیں۔ ساری زندگی جدائیاں رہیں، موت نے تینوں کو اکٹھا کر دیا ہمارے لئے زندگی کا یہ سانحہ ناقابلِ فراموش ہے۔ امی زندگی بھر ہر عید، ہر خوشی کے موقع پر اُن کی کمی محسوس کرتیں ؎

جن سے ملنے کا آسرا ہی نہیں عید ان کا خیال لاتی ہے

والا حساب تھا۔ خود بھی زار و قطار روتی تھیں، ہمیں رلایا کرتی تھیں۔ جب ان کی میت آئی تو دل غم سے پھٹ گیا یا باری تعالیٰ، بھائی کی خوشی بس ایک ماہ کے لئے ہمارے واسطے تھی اور غم ہمیشہ کے لئے۔ امی کا رونا دیکھا نہ جاتا تھا ایسی ایسی آہ وزاری کرتی تھیں کہ دل دہل جاتا تھا ؎

کوئی تو روتے پیٹ کر جوان لاشوں سے
اس لئے وہ بیٹوں کو مائیں دیتا ہے

آپا فردوس تو بس ایک ہی جملہ کہے جا رہی تھی تم کیوں ہنستے بستے گھر سے اجڑ گئے، میری زندگی تو پہلے سے اجڑی ہوئی تھی۔ میں مرجاتی

Marfat.com

تو اچھا تھا۔" آپا فردوس کے لئے تو بھائی اختر اور دوسرے بھائی ہی سہارا تھے۔ انہیں شروع سے ہی بھائی اختر سے بڑا پیار تھا۔ اسی پیار کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنی پہلی نظمیں بھائی کے لئے ہی کہیں۔ ان کی ایک نظم تو میرے پاس اب بھی پڑی ہوئی ہے۔ یہاں نقل کر رہی ہوں ؎

چلے آؤ کہ مجھ کو ہے تمہارا انتظار اب بھی

میرے ہمدم مرے بھیّا ہیں آنکھیں اشک بار اب بھی
دلِ مضطر ہے ویسا ہی پریشاں بے قرار اب بھی
یہ چشمِ منتظر تکتی ہے سمتِ رہ گزار اب بھی
جو آجاؤ تو آجائے بیاباں میں بہار اب بھی
چلے آؤ کہ مجھ کو ہے تمہارا انتظار اب بھی

چمن کے گوشے گوشے پر ہے جوبن اور نکھار اب بھی
نسیمِ صبح کے جھونکے رواں ہیں مشک بار اب بھی
فضائے بادِ رنگینی سے حاصل ہے قرار اب بھی
وطن کے ذرّے ذرّے ہیں بنجوم تابدار اب بھی
چلے آؤ کہ مجھ کو ہے تمہارا انتظار اب بھی

یونہی ہر شام مغرب میں شفق کا رنگ بکھرتا ہے
ہوا کے دوش پر سنّاٹے میں نغمہ ابھرتا ہے
تلاطم خیز موجوں کا وہ جہلم بھی بپھرتا ہے
اسی انداز سے آبِ رواں اب بھی گزرتا ہے

Marfat.com

چلے آؤ کہ مجھ کو ہے تمہارا انتظار اب بھی

ابھی امید باقی ہے تمہارے لوٹ آنے کی
گواہی دے رہا ہے دل تمہارے پھر نہ جانے کی
بدل دے گی کبھی اپنا بھی رُخ گردش زمانے کی
کہو کیا اب بھی کوشش نہ کرو گے لوٹ آنے کی
چلے آؤ کہ مجھ کو ہے تمہارا انتظار اب بھی

کہو وہ دیس ہے کیسا جہاں پہ دل لگایا ہے
الجھ کر کن فضاؤں میں ہمیں تم نے بھلایا ہے
جدائی میں تمہاری ہم نے اپنا جی جلایا ہے
ہماری یاد نے بھی کیا وہاں تم کو ستایا ہے
چلے آؤ کہ مجھ کو ہے تمہارا انتظار اب بھی

Marfat.com

سکاٹ لینڈ آکر گلاسکو دیکھنا میری دلی خواہش تھی جو بفضلِ خدا پوری ہو ہوگئی۔ یہ شہر ایڈنبرا کے مقابلے میں دھیما دھیما سے لگا یا یوں بھی ہو سکتا ہے کہ اندر کا موسم اثر انداز ہو رہا ہو۔

دل تو اپنا اداس ہے ناصر　　شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

۱۸ ، اگست ۱۹۸۴ء

رات منصورہ کے پاس گلاسگو میں بسر کی۔ صبح اس سے رخصت ہو کر UDDINSTON واپس آئے۔ گیارہ بجے گلاسگو ایئرپورٹ پہنچے۔ وہاں پھر منصورہ اور بشیر صاحب موجود تھے کہ یہ آپ کے تحائف ہیں۔ شاید وہ ہمیں رخصت کر کے شاپنگ کو نکلے تھے۔ سبھی کو الوداع کہا۔ سبھی نالاں کہ یہ آنا کیا آنا تھا۔ بہر حال اب سکاٹ لینڈ کی سرزمین کو چھوڑنا تھا جس کے متعلق سر والٹر سکاٹ نے کہا ہے:

LAND OF BROWN HEATH AND SHAGGY WOOD . LAND OF MOUNTAIN AND FLOOD

اگرچہ ان کے اشعار سکاٹ لینڈ کی خوبصورتی بیان نہیں کرتے مگر اس کے FAUNA AND FLOURA پہ ضرور روشنی ڈالتے ہیں۔

اب BRITISH MIDLAND کا D-C-9 گلاسگو سے ہیتھرو ایئرپورٹ پرواز کرنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ جلدی جلدی الوداع کہا۔ پھر آنے کے جھوٹے سچے وعدے کئے اور گیارہ پچپن پر لندن کے لئے روانہ ہو گئے۔

Marfat.com

لندن سے گلاسگو بذریعہ سڑک پہنچے تھے۔ اب ایک گھنٹے کی پرواز کے بعد دوبارہ منزل پر واپسی تھی۔ راستے میں بادلوں کے ٹکڑوں سے جھلکتا سرسبز سکاٹ لینڈ اور انگلینڈ دیکھا۔ بادلوں کی دھند ہٹتی تو ننھے منے گھر سبزہ زاروں میں گھرے نظر آتے کہیں چھوٹی چھوٹی جھیلیں، کہیں ننھی منی پہاڑیاں، کہیں چوکور تکونے خطوں میں تقسیم زمین کے ٹکڑے نظر آتے۔ کبھی منظر گہرا سبز ہوتا، کبھی خاکستری رنگ میں بدل جاتا۔ کبھی بادل یوں سدِ راہ ہوتے کہ زمین سفید روئی کا گدیلا اوڑھ کر نظروں سے پنہاں ہو جاتی۔ ساڑھے بارہ بجے لندن ائیر پورٹ پر تھے۔ وہاں لینے کے لئے کوئی نہیں آیا تھا۔ کشور کو اگرچہ فون کر دیا تھا، مگر آخر ہماری اتنے دنوں کی صحبت رنگ لائی۔ وہ انجم کو بتانا بھول گئی۔ امجد کو کوئی کام پڑ گیا۔ سلیم صاحب جانتے تھے کہ ہائی ویکمب تک ٹیکسی تقریباً ۳۲ پونڈ لے گی۔ پہلی دفعہ تو کڑوا گھونٹ پی کر دے دیا تھا، مگر اب آہستہ آہستہ جیب ہلکی ہوتی جا رہی تھی۔ پونڈ کی قدر بڑھ رہی تھی، اپنی گھٹ رہی تھی۔ اس لئے اس دفعہ بس پر واپس پہنچنے کا ارادہ کیا۔ دو بسیں بدلیں۔ ہائی ویکمب کی مارکیٹ تک پہنچے۔ جو بس ڈرائیور مارکیٹ تک لایا، وہ سکھ تھا۔ کہنے لگا "آپ نے غلط ٹکٹ لیا تھا۔ میں نے پہنچا دیا۔ آئندہ احتیاط کریں۔" میں نے کہا "آئندہ کی خدا جانے ہم تو کل امریکہ جا رہے ہیں۔" باچھیں پھیلا کر ہنسنے لگا کہ پھر رب راکھا۔

گھر پہنچ کر کھانا کھایا اور سامان باندھنا شروع کیا۔ سامان دیکھ کر سلیم صاحب کے تو ہوش اڑ گئے۔ نہ کچھ خریدا نہ تحفے وصول کئے۔ جو ملے وہ بھی ادھر ادھر بانٹ دیئے۔ پھر بھی اپنی ذاتی استعمال کی چیزیں ہی

Marfat.com

بڑھ گئی تھیں۔ سوونیئر کی وجہ سے بھی وزن زیادہ ہوگیا تھا۔ سلیم مجھ پر ناراض ہونے لگے کہ تمہاری شاپنگ کی وجہ سے یہ ہوا ہے۔ اب اتنا لمبا سفر ہے، سامان کہاں اٹھاتے پھریں گے۔ میں نے کہا کہ اب جو ہو سو ہو۔ یہاں سے تو سامان اٹھاؤ۔ امریکہ ظفر کے پاس چھوڑ دیں گے۔ وہ کسی دوست کے ذریعے پاکستان بھیج دے گا۔ تھوڑی سی تلخ کلامی کے بعد ان کا موڈ درست ہوا، سامان بندھ گیا۔ نئے سفر، نئی سرزمین اور نئے لوگوں کے تصوّر کو ذہن میں لئے نیند کی وادیوں میں کھو گئے۔ برطانیہ والوں کے لئے تو یہی پیغام تھا ؎

اب کوئی آئے تو کہنا کہ مسافر تو گیا
یہ بھی کہنا کہ بھلا اب بھی نہ جانا لوگو

Marfat.com

امریکہ۔ کولمبس کی سرزمین

۱۹ر اگست ۱۹۸۳ء

آج اپنے سابقہ آقاؤں کے دیس سے رخصتی تھی اور موجودہ دوستوں کی سرزمین کی طرف روانگی تھی۔ دل میں ہلچل، ذہن میں نئی امنگ، جسم میں انوکھی ترنگ۔ جانے بحر اوقیانوس کے اُس پار نئی دنیا کیسی ہوگی جس کی دریافت نے قوموں کی زندگی، تاریخ اور قسمتوں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس کی دریافت سے اہم کوئی دریافت نہ تھی۔ دوسرے برِاعظموں کے مقابلے میں شمالی امریکہ شاید قدرتی دولت، آب وہوا اور زمین پر اپنے محل وقوع کے لحاظ سے خوش قسمت ترین براعظم ہے۔ دو طویل بحروں کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے دشمنوں سے محفوظ ہے۔ غیر ملکی حملوں سے بچا ہوا ہے۔ تجارت کے فروغ کے لئے بھی ایک طرف مشرقی ممالک ہیں تو دوسری طرف مغربی ممالک۔ یورپی ممالک . . ۳۰ میل کے فاصلے پر ہیں تو چین، جاپان، روس . . . ۸ میل کے فاصلے پر۔ ہاں شمالی روس اور امریکہ کی سٹیٹ الاسکا میں صرف ۵۵ میل کا فاصلہ ہے جو BERING STRAIT

نامی آبنائے پر مشتمل ہے۔ بہر حال یہ بحرالکاہل اور بحرِ اوقیانوس کے سمندر اس کی لاکھوں میل لمبی زرخیز زمین کے گرد حفاظتی بند باندھے ہوئے ہیں۔
یہاں کے لوگوں کا معیارِ زندگی ایسا ہے جیسی دوسرے ملکوں کے لوگ صرف خواہشیں کر سکتے ہیں۔ پھر یہاں نباتات کی ایسی DIVERSITY ہے کہ ہر نوع کے پھل ہر طرح کی سبزی ہر قسم کے پھول یہاں موجود ہیں۔ زیادہ تر علاقہ منطقۂ معتدلہ میں ہے۔ لیکن اسی براعظم میں قطب شمالی کی یخ بستہ برفیلی ہوائیں بھی چلتی ہیں اور میکسکو اور کولوریڈو کے وسیع صحرا اور گرم ترین علاقے بھی موجود ہیں۔ حتیٰ کہ مشرق سے مغرب کی طرف جاؤ تب بھی مختلف قسم کی آب و ہوا سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کیونکہ کہیں راکی جیسے اونچے بلند قدیم ترین پہاڑ ہیں، کہیں APPALCHIAN RANGE جیسے کم بلندی والے اور کہیں سطحِ مرتفع کے علاقے ہیں اور کہیں میلوں لمبے گھاس کے میدان ہیں۔
یہاں کے لوگ بلند ہمت، چاند پر کمندیں ڈالنے والے ہیں مگر ان کو کون سمجھاتے سے

بستیاں چاند ستاروں کی بسانے والو
کرۂ ارض پہ بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ

ان کی ہر چیز سب سے بڑی، عمارتیں سب سے اونچی، زمین دوز گزرگاہیں سب سے لمبی، غرضیکہ یورپ کا براعظم جتنا چھوٹا ہے یہ اتنا ہی بڑا ہے۔ یورپ تو اصل میں ایشیا کا مغربی PENINSULA ہے۔ جغرافیہ دان تو یورپ اور ایشیا کو اکٹھا ملا کر یورشیا کہتے ہیں۔ اگرچہ یہ ننھا منّا سا براعظم ہے، مگر

Marfat.com

اسکی تہذیب شمالی امریکہ جنوبی امریکہ اور آسٹریلیا تک پھیلی ہوتی ہے۔ یورپ اپنے رقبے کے لحاظ سے لمبا ترین ساحلی علاقہ رکھتا ہے کیونکہ INLETS اور آبنائے وغیرہ سے اسکے ساحل اٹے پڑے ہیں۔ ۴۰۰ میل کے بعد سمندر لہراتا جھاگیں اڑاتا سدِ راہ ہو جاتا ہے۔ یہی سمندر یورپ کی خوش نصیبی رہا۔ اسی سمندر کی وجہ سے یورپی دور دراز کے علاقوں پر حکومتیں کرتے رہے۔ اسی سمندر کی وجہ سے کولمبس نے امریکہ دریافت کرلیا۔ غرضیکہ یورپ آغوشِ سمندر میں ہے تو یورپ نے بھی سمندروں کو اپنی آغوش میں لے رکھا ہے مثلاً بحیرۂ اسود، بحیرۂ روم، بحیرۂ اڈریاٹک، بحیرۂ یوجین، بحیرۂ بالٹک اور شمالی سمندر۔ اسی لئے یورپی اقوام زیادہ تر سمندروں سے متاثر رہیں۔ ان کا پیشہ کشتیاں بنانا، مچھلیاں پکڑنا، سمندری ڈاکو بننا اور نت نئے علاقے ڈھونڈتا رہا ہے۔

کولمبس کے سفر کو تو ۵۰۰ سال سے زائد کا عرصہ بیت گیا تھا۔ ہمارا سفر جدید دور میں اس سے بالکل مختلف حالات میں ہو رہا تھا۔ وہ بیچارا تو سمندر کی صعوبتیں برداشت کرتے کرتے منزلِ مقصود سے بھٹکتے ہوئے امریکہ کی سرزمین تک جا پہنچا تھا ــــــ مگر ہم سورج کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پانچ گھنٹے کے قلیل وقفے کے بعد ایک دم امریکہ جا پہنچے۔ اس دفعہ جہاز میں اچھی سیٹ نہیں ملی تھی یعنی کھڑکی کے پاس، کیونکہ ائرپورٹ پہنچتے پہنچتے لیٹ ہو گئے تھے۔ ہاتی ویکمب سے ہتھیرو ائرپورٹ تک جاتے ہوئے انجم کے گھر بھی جانا تھا کہ اب تک فرصت ہی نہ مل سکی تھی۔ اگرچہ ۹ بجے سے گھر سے نکلے تھے مگر RUSH HOURS کی وجہ سے دس بجے

Marfat.com

ائیرپورٹ پہنچے۔ سوا گیارہ بجے فلائٹ تھی۔ PAN AM کے کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے کہا "آپ کی فلائٹ آج نہیں اکیس کو ہے"۔ سلیم کشور انجم سبھی خوش ہو گئے۔ مجھ پر اوس پڑ گئی۔ میرا بھائی ظفر نیو یارک آیا ہوگا۔ وہ مجھے اسی فلائٹ پر دیکھے گا اور مایوس واپس جائے گا۔ میں نے اصرار کیا کہ ہماری فلائٹ آج ہی ہے۔ دو تین جگہ اور گئے۔ چیکنگ ہوئی اور ہماری سیٹیں اسی روز کے لئے کنفرم نکلیں۔ چلتے انگلینڈ سے رخصتی پکی ہو گئی۔ کشور اداس ہے، میں خوش ہوں۔ اس کا بھائی اس سے جدا ہو رہا ہے، میرا بھائی مجھے ملے گا۔ بس دنیا میں یونہی چلتا ہے کہیں شادیانے کہیں ماتم کہیں شہنائیاں کہیں اداسیاں۔ یہی تنوع اور رنگارنگیٔ زندگی کا حسن ہے ؎

وہ الوداع کا منظر وہ بھیگتی پلکیں
پسِ غبار بھی کیا کیا دکھائی دیتا ہے

سفر میں سیٹیں درمیان میں ملیں۔ مجھے چین کہاں۔ اب تک جتنے سفر کئے کھڑکی کے ساتھ بیٹھ کر کئے۔ اب بحر اوقیانوس کو دیکھنے کا ارمان، دو تین بار اٹھ کر کھڑکی سے جھانکا۔ اوپر نیلا آسمان، نیچے سفید بادلوں سے ڈھکی سرزمین، درمیان میں ہم۔ سارے سفر میں کچھ بھی نظر نہ آیا۔ سمندروں پر شاید تبخیر کی وجہ سے بادل زیادہ ہوتے ہیں۔ بہرحال دن کے ڈیڑھ بجے فلائٹ نیو یارک کے کینیڈی ائیرپورٹ پر اتری۔ جہاز لاؤنج سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ مسافر راہداری سے گزرے اور سیدھے لاؤنج میں جا پہنچے۔ بڑا سا ہال تھا جہاں امیگریشن کے سات آٹھ افسر بیٹھے ہوتے تھے۔ ہمارا

Marfat.com

پاسپورٹ دیکھ کر افسر مسکرایا کہنے لگا خوب سیر کیجئے" ہنی مون منایئے۔ میں نے کہا چالیس سے اوپر ہیں، کیسا ہنی مون، خوب قہقہہ لگا کر ہنسا اور کہنے لگا" "OH - NO - NO"۔ اب جانے اس سے اس کا کیا مطلب تھا۔ ہم نے کاغذات سمیٹے اور اسے ہنستے چھوڑ کر سامان کی چیکنگ کروانے آ پہنچے۔ افسر مجاز نے پوچھا کہ آپ پاکستان میں کیا کرتے ہیں۔ سلیم صاحب نے بتایا کہ پولیس آفیسر ہوں۔ اُس نے بغیر چیکنگ کے سامان آگے کر دیا۔ باہر نکلے تو جنگلے سے باہر انسانوں کا ایک ہجوم تھا۔ میری نظریں تو بس ظفر کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ پھر اتنے بے شمار اجنبی چہروں کے درمیان ایک مسکراتا ہوا پیارا سا چہرہ نظر آیا جسے دیکھ کر دل خوشی سے لبریز ہو گیا۔ امریکہ جو چند لمحے پہلے پرایا پرایا سا لگ رہا تھا، ایک دم اس چہرے کی وجہ سے اپنا لگنے لگا۔ پھر صالحہ سعدیہ اپنی امی کا ہاتھ پکڑے نظر آئیں۔ ظفر اور ظفر کی فیملی بس میں تو یہی کہوں گی ے

چمن تم سے عبارت ہے بہاریں تم سے زندہ ہیں
تمہارے سامنے پھولوں سے مرجھایا نہیں جاتا

ظفر ہم سے مل کر فوراً ہی پارکنگ سے کار لینے چل پڑا۔ عذرا اور میں پُرجوش اور پرمسرت آوازوں میں ایک دوسرے کا حال پوچھنے لگیں۔ بچیوں کو پیار کیا۔ وہ حیرانی اور استعجاب سے آنکھیں کھولے ایک ٹک مجھے اور سلیم کو دیکھ رہی تھیں۔ سلیم ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہی ہنگامہ پرور فضا جو ہر ایرپورٹ پر نظر آتی ہے۔ کوئی سامان اٹھائے جا رہا ہے، لائنیں لگی ہیں، چیکنگ جاری ہے، سامان کے سلائیڈز

Marfat.com

گھوم رہے ہیں، کوئی ٹرالی کھینچ رہا ہے، کوئی ہیلو ہیلو اور کوئی بائی بائی کر رہا ہے۔

اتنے میں ظفر کار لے کر آ گیا۔ سلیم اور ظفر آگے بیٹھے، عذرا اور میں پیچھے۔ اب عذرا ایک ایک کا حال پوچھ رہی تھی۔ میری یہی کوشش کہ باہر دیکھوں۔ گاڑی ہائی وے پر تیزی سے رواں دواں تھی۔ بڑی بڑی فیکٹریاں، کیفے، ہوٹل، عمارتیں، سبھی ایک پل کے لئے نظر آتیں اور پھر اوجھل ہو جاتیں۔ کھلی وسیع سڑکیں گاڑیوں کے پانچ پانچ ٹریک۔ سائیڈ بائی سائیڈ پانچ چھ گاڑیاں دوڑ رہی ہیں۔ یوں جیسے ریس لگی ہو۔ سائیں سائیں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تیز ہوا سے بال اڑے جا رہے تھے۔ عذرا نے شیشہ چڑھایا تو سکون محسوس ہوا۔ امریکہ تو واقعی بے حد تیز طرار نکلا۔ ظفر نے گاڑی نیوجرسی کی طرف موڑی۔ وہ نیوجرسی سٹیٹ کے دارالخلافہ ٹرنٹین میں رہتا ہے۔ اسّی نوّے میل کا فاصلہ گھر پہنچتے پہنچتے تھک گئے۔ عذرا کھانا تیار کر کے گئی تھی، لہٰذا کھانا کھا کر بیٹھے تو اباجی کی باتیں چھڑ گئیں۔ ان کو وفات پائے تین ماہ ہو چکے تھے۔ ظفر ان کی وفات سے ایک ماہ پہلے واپس امریکہ آیا تھا۔ اسے یہ دکھ کہ میں آخری وقت ان کے قریب نہ تھا۔ جب ظفر امریکہ آنے کے لئے اباجی سے رخصت ہوا تو ہم سب کو معلوم تھا کہ یہ ان دونوں کی آخری ملاقات ہے۔ ظفر سبھی سے ملا۔ وہ اِدھر اُدھر کمروں میں پھرے مگر اباجی کے کمرے میں جانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اباجی کو بھی اس حقیقت کا علم تھا کہ اب کی بار جو ملیں گے تو پھر ملنا نصیب نہ ہو گا۔ وہ انتظار میں کہ بیٹا آ کر رخصت ہو۔ آخر کافی دیر انتظار کرنے کے بعد ہم میں سے کسی سے کہنے لگے "ظفر سے کہو مجھ سے مل لے"۔ اب ظفر جو

Marfat.com

کمرے میں داخل ہوا تو سبھی کی چیخیں نکل گئیں۔ موت سے پہلے ہی موت کا ہنگامہ تھا۔ دیر تک اباجی کے سینے سے لگا ہچکیاں لیتا رہا۔ جب دونوں طرف سے کچھ حوصلہ ہوا تو اباجی کہنے لگے "بیٹا! ماں کی حفاظت کرنا۔ اب جاؤ۔ خدا حافظ و ناصر ہو۔" ظفر کا کہاں دل کہ اُس مشفق سینے سے سر اٹھاتے۔ آخر امی نے اسے علیحدہ کیا۔ اباجی نے نقاہت سے آنکھیں موند لیں یا بیٹے کی رخصتی کا عالم نہ دیکھنا چاہتے ہوں گے۔ ظفر نظر بچی کرتے کمرے سے نکلا ؎

چہرہ جسے پلٹ کے بھی میں دیکھتا نہیں
شاید عزیز ہے مجھے سارے جہان میں

گیلری میں عرفان کھڑا تھا۔ اب دونوں بھائی ایک دوسرے سے چمٹے روتے جا رہے ہیں۔ بہنوں کی حالت الگ دگرگوں۔ امی کا رو رو کر بُرا حال۔ بھائی جاوید گھبرا کر باہر نکل گئے۔ ظفر تو پنڈی آ کر امریکہ چلا گیا۔ مگر اباجی کو اسی دن تین دفعہ دورہ پڑا۔ بعد میں نہ انہوں نے کوئی بات کی نہ کسی کا ذکر کیا ؎

تمہارے بعد چراغوں کا کام ہی کیا تھا
نہ تم ہی لوٹ کے آتے نہ پھر چراغ جلے

دوائی دی گئی تو پی لی ورنہ سارا سارا وقت قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہتے۔ بعض اوقات امی گھبرا جاتیں کہ اتنا پڑھنے سے کہیں دماغ پہ اثر نہ ہو جائے۔ ایک دن آپا کہنے لگیں "اباجی! اب پڑھنا بند کر دیں، زوال کا وقت ہے"۔ کہنے لگے "اچھا بچو! اب بند کر دیتے ہیں"۔ لیکن پانچ چھ منٹ

Marfat.com

کے بعد پھر پڑھنا شروع کر دیا جب تھک جاتے تو اپنے دوست چوہدری صاحب سے کہتے کہ مجھے سورۃ یٰسین اور سورۃ الرحمٰن سناؤ۔ وہ صبح شام پاس بیٹھ کر تلاوت کرتے۔ انہوں نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ ابا جی کی ساری بیماری میں پاس ہی رہے حتیٰ کہ وفات کے بعد بھی ہمارے ہی گھر ٹھہرے، چھ ماہ بعد جب امی جی بھی فوت ہو گئیں تو کہنے لگے "بچو! اب میرا یہاں رہنا بے کار ہے۔ جن کی وجہ سے ٹھہرا ہوا تھا وہ لوگ تو چلے گئے۔"

ظفر سے ابا جی کی باتیں کرتے کافی رات گزر گئی۔ اسے امی کا پیغام دیا کہ بیٹا جب تک تم آ کر میرے گلے لگ کر رو گے نہیں مجھے تمہارے باپ کے دکھ سے قرار نہیں آئے گا۔ آنسو بہاتے روتے کافی دیر کے بعد سوتے۔ سونے سے پہلے کوشش کی کہ امی سے جہلم بات ہو جاتے۔ مگر کال مل نہ سکی۔ آج ظفر کے گھر آ کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اپنے جہلم کے گھر میں ہوں۔ بڑا سکون اور اطمینان حاصل ہوا سفر کی بے چینی ختم ہو گئی۔ الحمد اللہ۔ بچوں کی طرف سے فکر ہے کہ وہ اب اداس ہو گئے ہوں گے۔ خدا اُن کی زندگیاں خوشیوں سے منور رکھے۔ آمین، ثم آمین۔ اب تو یوں لگتا ہے کہ واپسی کا سفر ہے۔ دن بدن پاکستان نزدیک سے نزدیک تر ہوتا جا رہا ہے ؎

ملکوں ملکوں گھومے ہیں بہت جاگے ہیں بہت روتے ہیں بہت
اب تم کو بتائیں کیا یارو، دنیا کا نظارا کیسا ہے

Marfat.com

سٹورز کی سیر

۲۰ر اگست ۱۹۸۴ء

آج ظفر کو چھٹی نہ تھی۔ اگرچہ امریکہ "ڈاکٹروں کی جنت" کہلاتا ہے مگر ڈاکٹروں کی مصروفیات بے پناہ ہیں۔ جنت میں جنت لوٹنے کے مزے مفقود ہیں۔ ہاں بنک بیلنس دیکھو تو اگر اس کا بھاری پن جنت کہلاتا ہے تو یقیناً میرے بھائی سمیت سبھی ڈاکٹر جنتی ہیں ہم مشرقی بدھوؤں کی نظر میں یہ جنت قطعی نہیں بلکہ برزخ ہے یعنی جنت اور دوزخ کے بیچ بیچ میں ہم سب سو رہے تھے کہ ظفر اٹھا چاۓ بنائی۔ پی کر اپنا اورآل پہنا اور ہمیں خدا حافظ کہا اور چل دیا۔ سوتے جاگتے اسے رخصت کیا اور پھر سو گئے۔ دوپہر کو ہم سب لوگ جاگے، ناشتہ کیا، پھر سلیم کہنے لگے کہ عذرا ہمیں کسی نزدیک ترین مارکیٹ میں لے چلو۔ اس وقت تک عذرا کو گاڑی چلانی نہیں آتی تھی۔ اب تو ماشاء اللہ اپنی گاڑی لی ہے۔ خوب اچھی ڈرائیور ہے۔ ہم تینوں ہی نے بچیوں کو لیا اور قریب کی مارکیٹ K-MART پہنچے۔ کچھ چیزیں خریدیں، کچھ رسالے لئے اور واپس گھر آ گئے۔ عذرا نے جلدی جلدی کھانا تیار کیا۔ اتنے میں ظفر آ گیا۔ اکٹھے مل کر کھایا اور پھر تیار ہو کر چل نکلے۔ اب کی بار ہمیں ظفر BAMBERGER سٹور لے گیا۔ بے حد خوبصورت اور دو منزلہ تھا۔ فوارے چل رہے تھے۔ ان سے رنگین پانی اچھل رہا تھا۔ دکانیں بند ہونے کا وقت ہو رہا تھا۔ جلدی جلدی کچھ چیزیں خریدیں۔ میری امریکہ میں زیادہ تر شاپنگ

Marfat.com

"کاجو" کی تھی اور کچھ خریدوں نہ خریدوں نمکین لذیذ کرکرا تا کاجو ضرور خریدتی تھی۔ پاکستان میں تو کاجو پانی میں بھیگا پھُس پھُس سا ملتا ہے پھر مہنگا بھی بے پناہ۔ وہاں کاجو اور نمکین مونگ پھلی ایک ہی بھاؤ میں ملتی۔ سلیم میری خریداری دیکھ کر ہنستے تھے کہ عذرا اسے دیکھو میرا سارا زرِ مبادلہ کاجو میں ختم کر دے گی۔ سٹور کے بند ہونے پر وہاں سے نکلے تو سلیم کو بھوک لگ رہی تھی۔ ظفر نے کنٹکی چکن (KENTUCKY CHICKEN) خریدا۔ اس چکن کی بھی عجب کہانی ہے۔ اس کی شہرت امریکہ سے نکل کر یورپ تک پھیل گئی ہے۔ کہتے ہیں کرنل سینڈرز نامی ایک شخص کسی ریسٹورنٹ میں کام کرتا تھا۔ اس کی کسی وجہ سے ریسٹورنٹ کے مالک سے لڑائی ہو گئی۔ علیحدہ ہونے پر اس نے خود چکن کو روسٹ کر کے سائیکل کے پیچھے رکھ کر بیچنا شروع کر دیا۔ لوگوں کو پسند آیا۔ بڑھتے بڑھتے اس کا اپنا ریسٹورنٹ کھل گیا۔ بعد میں یہ چکن اتنا مشہور ہو گیا کہ کرنل سینڈرز اسے دوسرے شہروں میں بھیجنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے امریکہ میں KENTUCKY CHICKEN کی بے شمار دکانیں کھل گئیں۔ اللہ جسے عزت دے، دولت دے یہ اس کی اپنی دین ہے۔ اب یورپ کے کئی شہروں میں بھی یہ چکن فروخت ہوتا ہے۔ اس میں گیارہ مصالحے ڈال کر بھونا جاتا ہے۔ اکثر لوگ تو بے حد پسند کرتے ہیں۔ مجھے اور سلیم کو کچھ خاص نہیں لگا۔ سلیم صاحب تو کہنے لگے کہ اس سے تو بہتر پنڈی میں BROADWAY BAKERY کا چکن ہوتا ہے اور یہ ان کی بات سچ بھی تھی۔ بہر حال، رات گئے گھر پہنچے۔ اب

Marfat.com

پھر فون کی کوشش کر رہے ہیں مگر جہلم کال ہی نہیں مل رہی تھی ہیں تو اَب سکون سے ہوں۔ بچوں سے بات ہو تو مکمل اطمینان حاصل ہو۔ کیونکہ سفر میں اب تک کوئی پریشانی نہیں ہوئی اور نہ آئندہ دس دن انشاءاللہ ہوگی، سوائے اس کے کہ بچوں کی خیریت کی خبر ملتی رہے۔ ان کی جدائی ہی سفر میں باعثِ تکلیف ہے اور ان سے فون پر بات کر لینا باعثِ مسرت و راحت ہے۔ مختصر یہ کہ رنج و خوشی کا مفہوم بدل گیا ہے ؎

تو جو بچھڑا تو یہ ہوا معلوم
فاصلے کیا ہیں قربتیں کیا ہیں

Marfat.com

AMERICA – THE BEAUTIFUL

امریکہ! حسین امریکہ

۲۱۔ اگست ۱۹۸۳ء

قسمت کی بات کہ اس سفر کے دوران امریکہ کی تین اسٹیٹس دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ تینوں بیشتر وجوہات کی بنا پر اہم ترین اسٹیٹس تھیں۔ سب سے پہلے تو ہم نے نیوجرسی دیکھی پھر نیویارک اور پھر کیلی فورنیا یہ تینوں امریکہ کی VARIETY ، VOLUME اور VALUE کے لحاظ سے منفرد ہیں۔

نیوجرسی اگرچہ رقبے کے لحاظ سے چھوٹی سی سٹیٹ ہے مگر صنعتی لحاظ سے یہ دیوزاد ہے نیویارک سے ٹرینٹن کے راستے میں دونوں اطراف سے دھواں اگلتی فیکٹریاں اور کارخانوں کا شہر آباد ہے۔ حتیٰ کہ اسی رستے میں صنعتی شہر EDISON CITY بھی آتا ہے جو مشہور زمانہ امریکی موجد ایڈیسن کی یاد میں بنایا گیا ہے۔ ٹریفک اتنی زیادہ ہے کہ انگریزی میں ایک محاورہ ہے BUMPOR TO BUMPOR ٹریفک، وہی یہاں صادق آتا ہے۔ نیوجرسی اسٹیٹ کو گارڈن اسٹیٹ بھی کہتے ہیں۔ اصل میں امریکہ کی ساری اسٹیٹس کے پاپولر نام گاڑیوں کے

Marfat.com

نمبر پلیٹ کے ساتھ درج ہوتے ہیں:

فلوریڈا کا نام	SUNSHINE STATE
ہوائی کا نام	PARADISE OF PACIFIC
کناسس کا نام	SUNFLOWER STATE
نیو میکسیکو کا نام	LAND OF ENCHANTMENT
نیویارک کا نام	EMPIRE STATE
پینسلوینیا کا نام	KEYSTONE STATE
ورمونٹ کا نام	GREEN MOUNTAIN STATE
واشنگٹن کا نام	EVERGREEN STATE
میری لینڈ کا نام	DIAMOND STATE

اسی طرح پچاسوں سٹیٹس کے علیحدہ پاپولر نام ہیں حتیٰ کہ بعض اہم شہروں کے بھی دوسرے نام درج ہوتے ہیں۔ جیسے DETROIT کا موٹر سٹی یا ایک سٹی ہے۔

نیوجرسی کا نام گارڈن اسٹیٹ ۱۶۸۴ء میں سکاٹ لینڈ میں شائع شدہ ایک پوسٹر کی وجہ سے پڑا۔ اس میں نیوجرسی کی بے انتہا پیداوار، سبزیوں پھلوں پھولوں کی بہتات اور دیگر خوبیوں کو درج کرنے کے بعد لکھا تھا کہ یہ علاقہ اس قدر زرخیز ہے کہ اسے دنیا کا باغ کہا جا سکتا ہے۔ یہ علاقائی جنت ہے۔ یہ جگہ خوشگوار اور نفع بخش فضا کی حامل ہے اور یہاں ایک آدمی PLENTY AND PLEASURE میں رہ سکتا ہے۔

Marfat.com

دنیا کا لمبا ترین لٹکتا ہوا پُل (SUSPENSION BRIDGE)
جو کہ نیویارک میں واقع ہے VERRAZANO BRIDGE
کہلاتا ہے۔ یہ اس شخص کے نام پر ہے جو سب سے پہلے نیو جرسی آیا۔
نیو جرسی کو SALAD BOWL OF THE UNITED STATES
بھی کہتے ہیں۔ اس کا ریاستی پھول VIOLET ہے۔ شاید یہی وجہ
ہے کہ ظفر کی دونوں لڑکیاں PURPLE رنگ کے کپڑے پہننا پسند
کرتی ہیں۔ یہ ہر لحاظ سے خوبصورت رہائشی علاقہ بھی ہے۔ لوگ
نیو جرسی میں رہتے ہیں اور روزانہ نیویارک یا فلاڈلفیا میں کام کے لئے جاتے
ہیں۔ خود نیو جرسی میں بھی ۲۰۰۰ سے زیادہ فیکٹریاں ہیں جن کا تیار شدہ
مال اردگرد کی ریاستوں میں فروخت ہوتا ہے۔ نیو جرسی نہ صرف آج
کل اہم ہے بلکہ انقلاب کے زمانے میں بھی یہاں ۱۰۰ کے قریب جنگیں
لڑی گئیں۔ جنرل واشنگٹن نے اپنی مشہور زمانہ CROSSING (ڈیلاویر
دریا پار کرکے) ٹرینٹن کے قریب ہی کی تھی۔ غرضیکہ ہم نے اہم ترین
ریاستوں میں سے ایک گھوم پھر کر دیکھی۔ آج ظفر کو چھٹی تھی۔ وہ کہنے
لگا۔ آج آپ کو نیویارک کا شہر دکھاتا ہوں، مگر پہلے جہلم بات کریں۔
جب بات ہوئی تو امی بےحد خوش ہوئیں۔ بار بار کہیں کہ "تم بھائی
کے پاس پہنچ گئی ہو۔ ظفر کے پاس سے بول رہی ہو۔ ظفر سے بات
کراؤ۔" اتفاق سے کہ ظفر اسی وقت کسی کام سے باہر گیا تھا۔ جب میں
نے بتایا تو بڑی مایوس ہوئیں۔ مگر پھر اپنی بہو اور بچوں سے باتیں
کرنے لگ گئیں۔ سچ ہے اپنی اولاد سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ سولہ دن

Marfat.com

بعد میں جب سفر ختم کر کے پاکستان واپس آئی تو میرے آنے کے پانچ چھ دن کے بعد انہیں BRAIN HAMARAGE ہوا۔ دس بارہ دن بے ہوش رہیں۔ جب ہوش آیا تو کسی کو بھی نہیں پہچانتی تھیں۔ ہم لوگوں نے گھبرا کر ظفر کو امریکہ سے بلوا لیا۔ اس سے امی اور ابا جی دونوں کو شدید لگاؤ تھا۔ امی نے ظفر کو اس حالت میں دیکھا تب بھی فوراً پہچان گئیں۔ ظفر سے جیسا ان کو پیار تھا میں نے کم ہی دیکھا ہے۔ ابا جی بھی اسی شدت سے ظفر سے پیار کرتے تھے۔ مگر ظفر کی کم نصیبی کہ اسے دونوں کے مرنے سے ایک ایک ماہ پہلے واپس امریکہ جانا پڑا۔ جب امی سے رخصت ہو کر واپس امریکہ جا رہا تھا تو امی کافی ہوش میں آ چکی تھیں۔ اب سب کو اچھی طرح پہچاننے لگی تھیں۔ صحت بھی اچھی ہو گئی تھی۔ ظفر نے امی کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور کہا کہ "اچھا امی اب مجھے رخصت کریں"۔ امی رونے لگیں۔ ظفر کہنے لگا "نہیں امی! مت روئیں۔ ہم پھر ملیں گے"۔ کہنے لگیں "ہاں بیٹا! ہم پھر ملیں گے"۔ مگر ملنا ان کے نصیب میں نہ تھا۔

خیر جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے وہی بھگتنا پڑتا ہے۔ امی سے بات کرنے کے بعد بچوں سے بات ہوئی۔ سارے بچے بار بار کہیں کہ امی اپنا پروگرام چھوٹا کریں۔ میں نے کہا کہ تمہارے ماموں کے پاس بیٹھ کر چھوٹا کروں گی اور پھر فون پر اطلاع دوں گی۔

ظفر گھر واپس آیا تو وہ بھی بے حد اداس ہوا کہ دو دن کی کوشش کے بعد کال ملی بھی تو بات نہ ہو سکی۔ میں نے اپنا پروگرام دکھایا جس میں

Marfat.com

لاس ویگاس، میامی، ڈیٹرائیٹ، واشنگٹن، کلیولینڈ، ہوسٹن، ٹیکساس، لاس اینجلز، سان فرانسسکو اور ہوائی شامل تھے۔ ظفر دیکھ کر بڑا حیران ہوا کہ باجی کیسے اتنے شہروں میں آپ لوگ جائیں گے۔ تھکاوٹ علیحدہ ہوگی۔ ہوٹلوں کا کھانا کھانا پڑے گا جو بھائی سلیم کے لئے ایک مشکل امر ہے۔ اصل میں ہم نے پاکستان سے ورلڈ ٹور کا ٹکٹ لیا تھا۔ امریکہ میں اس ٹکٹ پر کسی بھی ریاست کے کسی بھی شہر میں جا سکتے تھے۔ جتنے دن مرضی رہو، وہاں قیام کرو پھر چل نکلو۔ PAN AM کی اس سہولت سے ہم نے یہ فائدہ اٹھایا کہ سبھی اہم شہروں کے نام لکھ دیئے۔ ہر شہر کے لئے دو تین دن رکھے۔ اب ہمیں کون سمجھاتا کہ جہاں اپنا کوئی نہ ہو، وہاں ہم جیسے لوگوں کو سیر کون کرائے گا۔ سلیم صاحب کا گزارا کیسے ہوگا۔ جنہیں اس بات کی بھی فکر ہوتی ہے کہ کہیں سئور کی چربی میں یہ چیز پکی نہ ہو۔ یا سئور کے گوشت میں استعمال شدہ چھریاں کانٹے نہ استعمال کئے جا رہے ہوں۔ بہر حال ظفر نے کہا کہ باجی لاس ویگاس آپ نے کیوں جانا ہے کیا جوا کھیلنا ہے؟؟ ہم دونوں ہنسنے لگے۔ کہنے لگا میں آپ کو اٹلانٹک سٹی ATLANTIC CITY لے جاؤں گا۔ جو لاس ویگاس کی مانند ہے وہاں جوئے کا پورا انتظام ہے۔ بے شک کھیلئے گا۔ واشنگٹن بھی بائی ایئر نہ جائیں، ٹرین کے ذریعے جائیں تاکہ راستے میں خوبصورت مناظر دیکھیں اور رات کو بھی وہاں رہنا نہ پڑے۔ صبح کی ٹرین سے جائیں، شام کو واپس آجائیں۔ کلیولینڈ اور ڈیٹرائیٹ چونکہ صرف نیاگرا فالز کی وجہ سے جانا ہے وہ میں خود دو تین دن کی چھٹی

Marfat.com

لے کر آپ کو دے جاؤں گا۔ اس کو بھی کاٹ دیں۔ میں نے کہا "ہوائی کچھ جزیرے ہی ہیں اسے بھی کاٹ دو۔" کہنے لگا "باجی جیسے ہم پاکستانیوں کو امریکہ دیکھنے کا شوق ہے، ویسے ہی امریکیوں کو ہوائی دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے اس لئے اسے ضرور دیکھیں۔ لاس اینجلز بھی رہنے دیں۔ وہاں ہالی وڈ ہے، ڈزنی لینڈ ہے۔"

چلیں جی اب پروگرام سیٹ ہو گیا۔ نیو یارک سے سیدھا کیلی فورنیا جانا تھا۔ باقی سب ظفر کے ذمے ہو گیا۔ گھر بیٹھے PAN AM کے دفتر فون کیا۔ انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے سیٹیں کمپیوٹر پر کنفرم کر دیں۔ کٹ کٹا کر سفر اب صرف پندرہ سولہ دن کا رہ گیا۔ اگرچہ کافی بستیاں قریب گھوم چکے تھے لیکن ابھی امریکہ دیکھنا باقی ہے۔

نیو یارک — بلندیوں کا مرکز

پروگرام سیٹ کرنے کے بعد ظفر نے کہا کہ آج آپ کو نیو یارک کی سیر کرواتے ہیں۔ اس شہر کے متعلق میرے ذہن میں بڑے پیارے پیارے خیالات تھے کہ یہ امریکہ کی رعنائیوں، دلکشیوں اور خوبصورتیوں کا دروازہ ہے۔ مختلف نسلوں کی قوس قزح آبادی کا گہوارا ہے، کیونکہ کہیں پڑھا تھا کہ اس میں لون سے بڑھ کر جرمن، فلورنس سے بڑھ کر اٹلی کے باشندے، سان جوآن سے بڑھ کر پورٹیریکین رہتے ہیں، حتیٰ کہ کتنی ملین ایسے لوگ بستے ہیں جو جانے کس کس نسل کے ہیں۔ پھر یہ بھی خیال تھا کہ نیو یارک ہمارے شہروں کی طرح کا ایک شہر ہو گا COMPACT

Marfat.com

قسم کی عمارتیں ہوں گی بلند و بالا۔ مگر نیویارک میرے خواب و خیال سے بڑھ کر اور مختلف تر نکلا۔ اس میں پانچ سیکشن ہیں:

۱۔ مین ہٹن (مختصر ترین جزیرہ)
۲۔ بروک لین (لانگ آئی لینڈ)
۳۔ کوئینز (لانگ آئی لینڈ)
۴۔ رچمنڈ (سٹیٹن آئی لینڈ)
۵۔ برونکس BRONX (یہ صرف مین لینڈ سے ملا ہوا ہے)

یعنی چار حصے ہیں جو تین جزیدوں پر واقع ہیں۔ ان سب میں اہم جزیرہ MANHATTAN (مین ہٹن) کا ہے جس میں اہم عمارات، دفاتر، ادارے وغیرہ واقع ہیں۔ یہ ایک طرح سے امریکہ کا پاور ہاؤس ہے۔ یہاں صنعتیں بہت کم ہیں، مگر صنعتوں کی پالیسی وضع کرنے والے ہاتھ یہیں پر ہیں اور تو اور، تیسری دنیا کی قسمت کا فیصلہ بھی یہیں ہوتا ہے۔ کہتے ہیں مین ہٹن میں تمام امریکہ میں دفتروں کے لئے استعمال شدہ علاقے کا ۱/۵ حصّہ واقع ہے سنتے امریکہ کا پہلا دارالخلافہ یہی تھا۔ جارج واشنگٹن نے یہیں حلف اٹھایا تھا۔ پھر ۱۷۹۰ء میں یہ دارالخلافہ فلاڈلفیا منتقل ہو گیا۔ دس سال بعد، یعنی ۱۸۰۰ء میں نئے تعمیر شدہ شہر واشنگٹن میں شفٹ کر دیا گیا۔

مین ہٹن ایک CROWDED ISLAND ہے جس میں صرف اوپر جانے یا زمین کے نیچے جانے کی جگہ ہے۔ اسی لئے اس کی عمارتیں اوپر ہی اوپر چڑھتی چلی گئی ہیں۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے TWIN TOWERS

ایک سو دس منزلہ ہیں۔ ایمپائیر سٹیٹ بلڈنگ کی ایک سو دو منزلیں ہیں۔ اسی طرح اور بھی کئی سکائی سکریپرز ہیں جو نیویارک کی خوبصورت سکائی لین بناتے ہیں سطحِ زمین کے نیچے سیوریج، ٹیلی فون، گیس سیٹم، واٹر ٹیوب، ٹنل وغیرہ کا ایک پیچیدہ نظام ہے جو ڈھائی لاکھ لوگوں کی ضروریات کو کنٹرول کرتا ہے۔ ان لوگوں میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ روزانہ ہزاروں سیاح یہاں آتے ہیں جن کے لئے اس میں ایک مقناطیسی کشش ہے۔ جہاں یہ جزیرہ اتنی خصوصیتوں کا مالک ہے وہاں اس کی تاریخ بھی عجیب و غریب نوعیت کی ہے۔

مین ہٹن کی کہانی ۱۶۰۹ء میں شروع ہوتی ہے ان دنوں ہنری ہڈسن نے مین ہٹن کے جزیرے کے جنوبی کنارے پر ایک تجارتی چوکی قائم کی۔ کچھ عرصے بعد ڈچ ویسٹ انڈیا کمپنی نے وہاں ایک قلعہ بنا لیا۔ پھر ڈچ آباد کار آنا شروع ہو گئے۔ ۱۶۲۶ء میں پیٹر مینیوٹ (PETER MINIUT) جو اس کالونی کا گورنر تھا" نے سارا جزیرہ ۲۴ ڈالر کے عوض مقامی لوگوں سے خرید لیا پہلے اس گاؤں کا نام نیو المسٹرڈم رکھا گیا ۱۶۶۴ء میں برطانوی لوگوں نے اس پر قبضہ کر کے اپنے ڈیوک آف یارک کی عزت افزائی میں اس کا نام نیویارک رکھ دیا۔ انقلاب آنے تک یہ جزیرہ برطانیہ کے ہی زیرِ نگین تھا۔

شروع شروع میں مین ہٹن کی وہ شکل قطعی نہ تھی جو آج ہے بس چند گلیاں، کچھ مکانات تھے۔ شمالی طرف سے چونکہ انڈین کا خطرہ تھا اس لئے اس طرف ایک دیوار بنائی گئی تھی۔ آج جو سٹرک WALL STREET

Marfat.com

کے نام سے موسوم ہے اور بنکنگ کا مرکز ہے، اسی دیوار کی جگہ بنائی گئی ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ نیویارک شہر بڑھتا گیا۔ مین ہٹن کے علاوہ دو جزیرے اور مین ہٹن کا کچھ حصہ بھی اس میں شامل ہو گیا۔ اس کی ترقی میں اسکی اچھی بندرگاہ ہونے کے لحاظ سے اس کی بہترین حیثیت نے بڑا رول ادا کیا ہے۔ آج بھی کئی سو جہاز اور سٹیمر دن رات آتے جاتے رہتے ہیں۔ ایک سال کے اندر پندرہ ہزار تک جہاز اس کی بندرگاہ سے گزرتے ہیں۔ یو ایس اے کی ۴۰ فی صد تجارت اور لین دین یہیں سے ہوتا ہے۔

سیاحوں کے لئے یہاں بہت سی دیدہ زیب عمارتیں، یادگاریں اور قسم قسم کی تفریحات ہیں۔ ہزاروں فیکٹریاں، سینکڑوں دفاتر، عجائب گھر، شاہکار پل، بڑے بڑے بنک، اوپرا، کنسرٹ، سٹورز، غرضیکہ کیا کچھ گنوایا جائے۔ کئی چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں جن میں ایک جزیرہ LIBERTY ISLAND کہلاتا ہے۔ اس پر آزادی کا مجسمہ ایک ہاتھ میں مشعل اٹھائے اور دوسرے میں کتاب لئے کھڑا ہے۔ اس جزیرے میں جانے کے لئے فیری استعمال ہوتی ہے جب کہ دوسرے جزیروں اور مین لینڈ کو آپس میں ملانے کے لئے بے شمار پل، کئی سرنگیں اور SUB-WAYS ہیں۔ جن پر انسانوں کا ہجوم اِدھر سے اُدھر دن رات چلتا رہتا ہے۔ اہم پل اور سرنگیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ جارج واشنگٹن برج۔ یہ دریائے ہڈسن پر واقع ہے اور نیوجرسی اور مین ہٹن کو ملاتا ہے۔

Marfat.com

۲۔ بروک لین برج۔ بروک لین اور مین ہٹن کے درمیان واقع ہے یہ ۱۸۸۳ء میں مکمل ہوا اور انجینئرز کی مہارت کا مکمل شاہکار ہے۔

۳۔ ویری زونا برج۔ بروک لین اور سٹیٹس آئی لینڈ کے درمیان واقع ہے۔ ۱۹۶۴ء میں ویری زونا نیویارک آیا۔ اسی کے نام پر یہ سان فرانسسکو کے گولڈن گیٹ برج سے ۶۰۰ فٹ لمبا SUSPENSION BRIDGE مشہور ہے۔

۴۔ ہالینڈ ٹنل نیوجرسی اور مین ہٹن کے درمیان ہے۔

۵۔ لنکن ٹنل۔ نیوجرسی اور مین ہٹن کے درمیان دریائے ہڈسن کے نیچے بنائی گئی ہے۔ یہاں سے روزانہ تقریباً نوے ہزار کاریں گزرتی ہیں۔

یہ اور کئی اور راستے اب ایک اکائی بن گئے ہیں۔ جنہوں نے نیویارک کے ایک حصے کو دوسرے سے ایسا جوڑ دیا ہے کہ یہ ایک جسم بن گیا۔ جس میں شاہراہیں رگوں کی حیثیت رکھتی ہیں اور خون کی طرح آدمیوں کی آمدورفت ہر وقت، ہر ساعت، ہر گھڑی جاری و ساری رہتی ہے۔ اس کے ہوٹلز اور فوڈ شاپس کبھی بند نہیں ہوتیں۔ رات کو تو اس شہر کا نظارہ واقعی بڑا دلکش ہوتا ہے جیسے ہیروں اور جواہرات سے جڑا ہوا کالا دوپٹہ، کھڑکیوں سے جھانکتی ہوئی لامحدود روشنیاں، راز فاش کرتے ہوئے بند دریچے، ایسا ڈائمنڈ ہے جس سے بے شمار روشنیاں منعکس ہو رہی ہیں۔ دن کو تو یہ دوڑتی بھاگتی گاڑیوں، تیز تیز قدموں سے چلتے انسانوں کا سمندر بن جاتا ہے جس میں قدرتی فضا مفقود ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب ظفر ہمیں لنکن ٹنل کے ذریعے نیویارک لے گیا تو اس کے متعلق سارے خیالات و

Marfat.com

تصورات کی عمارتیں اڑا اڑا دھم گر گئیں۔ میرا پہلا تاثر تو سخت مایوس کن تھا۔ کالی کالی بلند و بالا اسکائی سکریپرز، لوہے کے جنگلے، تارکول کی سڑکیں اور ان پر نیگروز کے ننگ دھڑنگ بچے، بھیک مانگتے بوڑھے، چوری چکاری کرتے جوان، غرض غربت و امارت کی انتہاؤں کا شہر ذرا بھی متاثر کن نہ تھا۔ یورپ اور امریکہ کے دیگر شہروں کی طرح اس میں صفائی بھی نہیں تھی۔ سڑکوں پر اس قدر کوڑا کرکٹ پھیلا ہوا تھا کہ مجھے پنڈی بھی اس سے ستھرا معلوم ہوا۔ وہاں دل گھبرا رہا تھا۔ ذہن پر ایک بوجھ تھا۔ ایسے غیر قدرتی ماحول اور جرم کی بو لئے ہوئی خوفزدہ فضا میں ہم نے خاک لطف اندوز ہونا تھا۔ خود امریکی مصنف JOSEPH LYFORD کہتا ہے کہ نیویارک ایک AIRTIGHT CAGE ہے۔ یوں لگتا ہے تھوڑی سی جگہ میں بہت سے لوگوں کو بند کر دیا گیا ہے جو گاڑیوں، ٹیکسوں، بسوں میں بیٹھ کر ادھر سے اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ ہر ایک کو کسی اور جگہ جلد از جلد پہنچنا ہے۔ جیسے جان کا خطرہ ہو۔ بہرحال نیویارک امریکہ کی طاقت کا نشان ہے۔ اب یہ طاقت کسی صورت میں بھی ہو، ہے تو طاقت ہی نا۔

اس کے متعلق پہلے صدر واشنگٹن نے پیش گوئی کی تھی کہ ایک دن نیویارک SEAT OF THE EMPIRE بنے گا۔ شاید اسی مناسبت سے اس ریاست کا پاپولر نام EMPIRE STATE ہے۔

یہ سب کچھ تو نیویارک شہر کے متعلق تھا۔ لیکن یہاں سے باہر نکلئے تو نیویارک کی ریاست اپنی رعنائیوں اور دلکشیوں کا جال بچھائے مسافروں

Marfat.com

کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔ اس میں بے شمار تفریحی مراکز ہیں جہاں اَن گنت سہولتیں ہیں۔ اس لئے امریکی بھی دوسری ریاستوں سے اس ریاست میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ سائز کے لحاظ سے یہ اگرچہ تیسویں نمبر پر ہے مگر آبادی کے لحاظ سے پہلے نمبر پر ہے۔ بیرونِ ملک سے آنے والے لوگوں کو نیویارک ریاست سے مکمل طور پر متعارف ہونے کے لئے بلکہ امریکہ کی سیر سے لطف اندوز ہونے کے لئے نیویارک شہر سے گزرنا پڑتا ہے جو اِن خزانوں کے لئے کھل جا سم سم کا کردار ادا کرتا ہے۔

نیویارک کے لئے THE BIGGEST ، THE MOST ، THE GREATEST اور THE TALLEST وغیرہ کے الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں، یعنی ہر چیز کی زیادتی اور کثرت ہے۔ یہاں کروڑوں روپوں کی لاگت سے بڑے بڑے سٹورز بناتے گئے ہیں، مگر باہر بیٹھے ہوتے بھکاری کو نانِ جویں میسّر نہیں۔ زمین تنگ سے تنگ تر ہوتی جا رہی ہے۔ آسمان ایک چھوٹا سا مربع بن گیا ہے۔ بلند عمارتیں سارے ماحول پہ چھائی ہوتی ہیں جو دہشتناک اور خوفناک لگتی ہیں۔ بلکہ انسان کو بدحواس کر دیتی ہیں۔ ظفر نے نیویارک کے کرائم سے ویسے ہی ڈرا دیا تھا کہ لوگ دن دھاڑے لوٹ لیتے ہیں۔ پرس، کیمرے اور ہاتھ میں پکڑی ہوتی ہر چیز لے کر بھاگ جاتے ہیں۔ اکیلا دوکیلا دیکھ کر قتل کر دیتے ہیں بلکہ ہر منٹ کے بعد ایک قتل ہوتا ہے۔ پولیس مجبور تماشائی ہے۔ ایسی بھیانک تصویر کہ نیویارک میں میری حالت تو ڈرپوک چوہے کی طرح ہو گئی۔ ہر لمحہ چوکنا، ہر نیگرو سے ڈر لگے۔ سلیم صاحب ایک

بھکاری نیگرو کو کچھ سکے دینے لگے تو عذرا اور میں گھبرا گئیں، بلکہ عذرا تو خوفزدہ ہو کر چلائی "بھائی جان! ان کے سامنے ڈالر مت نکالیے" عذرا کا خوف تھا بھی بجا کیونکہ اباجی کی بیماری میں جب دوسری دفعہ ظفر کو فوری طور پر آنا پڑا تو وہ اکیلا آ گیا۔ عذرا اور بچیاں وہیں رہیں۔ ایک دفعہ عذرا اکیلی مارکیٹ جا رہی تھی۔ ایک نیگرو نے خنجر کی نوک پر اس کی بارہ سونے کی چوڑیاں اتروا لیں۔ جب ملنے جلنے والوں کو پتہ چلا تو سبھی مبارک دینے آتے کہ شکر کرو جان بچ گئی۔ بچیوں کو لے کر نہیں بھاگا۔ کوئی اور نقصان نہیں ہوا ورنہ وہ چوڑیاں اتروا کر خنجر بھی بھونک سکتا تھا۔

ظفر نے ہمیں MESSI سٹور کے سامنے اتارا کہ باجی آپ اور بھائی جان سٹور دیکھیں میں ابھی تھوڑا سا کام کر کے واپس آتا ہوں۔ سلیم تو سٹور دیکھنے لگے۔ میرا دل باہر سڑک پر اٹکا ہوا۔ ظفر کو ہم نہ مل سکے تو واپس کیسے جائیں گے۔ گھبراہٹ میں سلیم صاحب کا ہاتھ پکڑ کر باہر آ گئی کہ سڑک کنارے ظفر کا انتظار کرتے ہیں۔ وہ تو خیر گزری کہ ظفر بیس پچیس منٹ کے بعد ہی واپس آ گیا ورنہ میرا تو بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا اور لینے کے دینے پڑ جاتے۔

پھر ظفر نے ہمیں براڈوے دکھائی جہاں بڑے بڑے تھیٹرز ہیں۔ گرین ویلیج دکھایا جہاں کے ایک ریسٹورنٹ میں خلیل جبران بیٹھا کرتا تھا۔ جہاں آج بھی کئی مصنف، ڈرامہ نگار، ادیب رہتے ہیں۔ جہاں مستقبل کے TALENT زمانے کی نظروں سے پوشیدہ سطح آب پر آنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔

Marfat.com

آخر میں ہمیں سنٹرل پارک لے گیا۔ یہ پارک ۱۸۵۰ء میں شہر سے باہر آٹھ سو ایکڑ زمین لے کر شہریوں کی تفریح کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس زمانے میں یہ زمین تقریباً باون لاکھ ڈالر میں خریدی گئی تھی۔ اسی پارک کے متعلق ولیم ڈین نے کہا ہے:

THE PARK IS NOWISE TAKEN AWAY FROM NATURE BUT IS RENDERED BACK TO HER WHEN ALL HAS BEEN DONE TO BEAUTIFY IT.

ولیم ڈین کے مقولے کے پہلے حصے سے تو مجھے اتفاق ہے کیونکہ پارک واقعی قدرتی حالت میں تھا۔ اونچی نیچی چٹانیں، خشک جھاڑیاں، ناہموار زمین اور اس پر انسان کی اتنی سی کاریگری کہ سگریٹ کی ڈبیاں، ماچس، کاغذ کے ٹکڑے اور چھلکے وغیرہ بکھرے پڑے تھے۔ سامنے کچھ نوجوان باسکٹ بال کھیل رہے تھے۔ خوبصورت علاقہ بھی ہوگا مگر جو حصہ ہم نے دیکھا وہ خوبصورتی کے زمرے میں نہیں آتا۔ مٹی دھول بھی اڑ رہی تھی جو امریکہ اور یورپ کے دیگر شہروں میں بالکل نظر نہیں آتی۔

اب رات پڑ رہی تھی۔ ظفر کہنے لگا "باجی! اب پھر کسی دن آئیں گے"۔ مگر میں نے کہا "اتنا بھی بہت ہے۔ یہ بھی ہضم کر لیں تو صد شکر۔ آئندہ کے لئے معافی۔"

اب تو تھکاوٹ آہستہ آہستہ جسموں میں سرایت کر رہی تھی نئی جگہیں دیکھنے کا شوق ماند پڑ رہا تھا۔ گھر جانے کا ارمان تھا سے

Marfat.com

ڈھل گئیں راتیں ڈھلتے ڈھلتے ۔ بجھ گئیں شمعیں جلتے جلتے
جانے کتنی دور ہے منزل ۔ تھک گئے ہم تو چلتے چلتے

ویلی کا ٹیج

۲۲، اگست ۱۹۸۴ء

آج صبح ہی نیویارک کے علاقہ ویلی کا ٹیج جانا تھا کیونکہ سردار شوکت حیات خان صاحب سے ملنا تھا جو بغرضِ علاج امریکہ اپنی بیٹی عظمیٰ کے پاس تشریف لاتے ہوتے تھے۔ گھر سے نکلتے نکلتے بارہ بج گئے۔ راستے میں کئی گاڑیاں آگے پیچھے دوڑتی جا رہی تھیں۔ ان کے نمبر پلیٹ سے ریاستوں کے پاپولر نام پڑھنے سے پتہ چل جاتا تھا کہ کہاں کے لوگ ہیں۔ زیادہ تر گاڑیاں نیوجرسی، نیویارک، میری لینڈ، ڈیلاویر اور پنسلونیا کی تھیں۔

ہائی وے سے علیحدہ ہوتے تو پہاڑی راستہ شروع ہو گیا۔ جوں جوں آگے بڑھتے گئے بار بار سائیڈز پر لگے MOUNTAIN BEAR PARK کے نشانات آ رہے تھے۔ ایک جگہ VIEW POINT بنا ہوا تھا۔ وہاں رک کر جو نیچے دیکھا تو ایک خوبصورت دریائے ہڈسن آہستہ خرامی سے بہتا نظر آیا۔ شاندار، خاموش، پرسکون، نیلی چادر کی مانند دور نیچے پھیلا ہوا، جس پر جا بجا سفید بادبانوں والی کشتیاں تیر رہی تھیں۔ دریائے ہڈسن صرف ۳۰۶ میل لمبا ہے، اس نے امریکہ کی معیشت اور ترقی میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ اسی لئے اس کو LORDLY HUDSON کہتے ہیں۔ یہ لیک TEAR OF CLOUDS (بادلوں کے آنسو) سے

Marfat.com

نکل کر بحر اوقیانوس کی گہراتیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ اس کے انداز شاہانہ ہیں۔ شاعروں نے اس پر نظمیں لکھی ہیں۔ واشنگٹن ارونگ کی ایک نظم ایک دفعہ پڑھی تھی۔ یہ میرے اِن جذبات کی بھی بالکل صحیح عکاسی کرتی ہے جو میں نے ہڈسن کو دیکھ کر محسوس کئے۔ یہی کچھ اس کے RIPVAN WINKLE نے دیکھا وہی ہمیں خدا نے دکھایا:۔

THE LORDLY HUDSON

IN A LONG RAMBLE - ON A FINF AUTUMN DAY RIP HAD UNCONCIOUSLY SCRAMBLED, TO ONE OF THE HIGHEST PARTS OF KATSKILL MOUNTAIN FROM AN OPENING BETWEEN THE TREES HE COULD OVERLOOK ALL THE COUNTRY FOR MANY A MILES OF RICH WOODLAND. HE SAW AT A DISTANCE THE LORDLY HUDSON, FAR FAR BELOW HIM MOVING ON ITS SILENT MATESTIC COURSE,

امریکیوں نے انقلاب کے بعد دریائے ہڈسن اور دریائے موہیک کے راستے کے ساتھ ساتھ ایک نہر ERIE کھودی جو اندرونِ ملک سامان کی اِدھر اُدھر TRANSPORT کے لئے استعمال ہوتی رہی۔ یہ ۱۸۲۵ء

Marfat.com

میں مکمل ہوئی تھی اور اس سے اس قدر فائدہ ہوا کہ ایسی کئی اور نہریں کھودی گئیں۔ لیکن جتنی EFFECTIVE یہ نہر ہوتی یا جتنا فائدہ اس سے ہوا کسی اور نہر سے نہ ہوا۔ بعد میں اس کو گہرا اور چوڑا کیا گیا۔ پھر اس کا نام NEW YORK STATE BARGE CANAL رکھ دیا گیا۔ ریاست کی ترقی میں دریائے ہڈسن اور دریائے موہیک کی گزرگاہ کا بڑا ہاتھ ہے۔ نہریں اور ریلوے لائنیں اسی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ بنائی گئیں۔ کیونکہ آس پاس پہاڑ ہیں۔ صرف یہ راستہ میدانی ہے اور خوبصورت بھی بے پناہ ہے۔ ویسٹ پوائنٹ سے دریا کا بے حد دلکش نظارہ دکھائی دے رہا تھا۔ ہم لوگ کافی دیر وہاں کھڑے رہے۔ تصویریں بھی کھینچیں۔ پھر وقت کی کمی کے باعث چلنا پڑا۔

ویلی کاٹیج اونچے اونچے درختوں سے گھرا خوبصورت علاقہ ہے۔ وہاں ہم سردار صاحب، آپا مسرت اور عظمیٰ سے ملے۔ کافی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اٹھنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ بھلا اتنے پیارے مخلص لوگوں کی محفل سے جانا کون پسند کرتا۔ عذرا ظفر سردار صاحب سے پہلی دفعہ ملے تھے اور بڑے متاثر تھے۔ ان کا دل نشین اندازِ گفتگو، پُر وجاہت شخصیت اور محفل پر چھا جانے والی خصوصیت ذہن و دل کو مسخر کر لیتی ہے۔ آپا مسرت کی باتیں محبت سے پُر تھیں۔ عظمیٰ کا چھوٹی بہنوں جیسا اصرار کہ " اوا سلیم آپ ہمارے یہاں رہیں "۔ ان سے وعدہ کیا کہ ایک دفعہ پھر آئیں گے اور رخصت طلب کی۔

وہاں سے نکلے تو عذرا کے بہنوئی سے ملنے NEW BUROUGH

روانہ ہوتے۔ وہ پی آئی اے میں پائلٹ ہیں۔ صبح ہی اطلاع ملی تھی کہ وہ فلائٹ لے کر آتے ہوتے ہیں اور RAMADA INN میں ٹھہرے ہوتے ہیں۔ وہاں پہنچے تو بڑا خوبصورت علاقہ تھا۔ ماحول بھی دلکش اور ہوٹل بھی اچھی جگہ پر واقع تھا۔ چونکہ اونچائی پر تھا اس لئے پستیوں پر دُور دُور تک نگاہ کام کرتی تھی۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ اکیلا درخت بھی نہ ہو۔ وہ بھی بڑے بور ہو رہے تھے۔ مل کر بڑے خوش ہوتے۔ ظفر نے پیش کش کی کہ آپ بھی چلیں۔ نیو جرسی لئے چلتے ہیں۔ مگر انہیں کچھ کام تھا اس لئے معذرت کر لی۔ گپ شپ لگاتے شام ہو گئی۔ باہر نکل کر "برگر کنگ" کھایا۔ بڑا لذیذ اور اچھا خاصا ڈینر تھا۔ ساتھ میں کئی لوازمات تھے۔ امریکہ میں میکڈانلڈ اور برگر کنگ کے کئی ریسٹورنٹ ہیں مگر سبھی اپنی مدد آپ کے تحت چل رہے ہیں۔ یعنی اپنی ٹرے لو۔ اپنی پسند کی چیزیں لے کر میز پر بیٹھ جاؤ۔ کھا کر اپنے برتن خود اٹھاؤ اور سائیڈ پر پڑے ڈرم میں ڈال دو۔ برتن کاغذ اور گتے کے ہوتے ہیں۔ اب بل کونٹر پر جا کر دو اور ٹھنڈے ٹھنڈے رخصت ہو جاؤ۔ انتظامیہ کے لئے بہت کم کام رہ جاتا ہے۔ صرف ایک آدمی صفائی پر مامور ہے۔ جو فرش کو بار بار وائپر سے چمکاتا ہے۔ واپسی کا سفر سوتے جاگتے گزرا۔ رات گئے گھر پہنچے۔

امریکہ میں سفر کروانے کی ساری ذمہ داری ظفر نے لے لی تھی۔

ہمارا تو بس اس کے کہنے کے مطابق چل پڑنا کام ہونا تھا ؎

ایک آواز پہ مقسوم تھا چلتے رہنا\
بے تعین تھا سفر رختِ سفر کیا لینا

Marfat.com

خیر ہمارے لئے سفر بے تعین سہی، ظفر نے خوب PLANNING کی ہوئی تھی۔ اسی لئے باری باری ہر جگہ دکھاتے جا رہا تھا۔ ہر دن مصروف سے مصروف تر گزر رہا تھا۔ اب کل واشنگٹن سے ملاقات کا دن تھا۔ اس لئے پرانی تھکاوٹ دور کرنے کے لئے فوراً سو گئے تاکہ کل کے لئے تازہ دم ہو جائیں۔

Marfat.com

واشنگٹن ڈی سی

۲۳ ۔اگست ۸۳ ۱۹ء

آج صبح سویرے منہ اندھیرے ظفر نے ہمیں جگایا اور نیوجرسی سٹیشن پرلے گیا وہاں سے واشنگٹن کے لئے ٹرین پکڑی اور عظیم امریکہ کے دارالخلافہ ...... کو دیکھنے چل پڑے۔ اسے صرف واشنگٹن نہیں کہتے کیونکہ امریکہ کی ایک ریاست کا یہی نام ہے۔ بلکہ واشنگٹن ڈی سی کہتے ہیں۔ یعنی یہ ڈسٹرکٹ آف کولمبیا میں واقع ہے۔ یہ جگہ امریکہ کے پہلے صدر جارج واشنگٹن نے خود چنی تھی۔ اُن دنوں امریکہ پچاس ریاستوں پر مشتمل نہ تھا بلکہ صرف تیرہ ریاستیں تھیں۔ اور یہ جگہ اُن سب کے درمیان واقع تھی۔ پھر جارج واشنگٹن کی رہائش MOUNT VERNON سے بھی دور نہ تھی۔ صرف گھنٹہ بھر کی مسافت کا فاصلہ تھا۔ اگرچہ واشنگٹن میری لینڈ ریاست اور ورجینا ریاست کے درمیان ہے مگر یہ کسی ریاست میں بھی شامل نہیں۔ اس شہر بے مثال کی الگ حیثیت ہے۔ ممتاز مقام ہے۔ اسے باقاعدہ منصوبے کے تحت بنایا گیا ہے۔ ایک فرانسیسی انجینئر L'ENFANT نے اس کی سڑکیں اس طرح ترتیب دی ہیں کہ درمیان میں ایک دائرہ ہے

Marfat.com

اور دائرے سے سڑکیں ایسے نکلتی ہیں جیسے سائیکل کے پہیئے سے SPOKE نکلتے ہوں۔ اسی دائرے کے گرد تمام یادگاریں ہیں اس لئے ہم نے تقریباً سبھی یادگاریں پھر کر دیکھیں۔ علاوہ ازیں ٹور موبائیل کی وجہ سے واشنگٹن دیکھنا بے حد آسان ہو گیا۔ سیاحوں کی سہولت کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے مہیا کردہ یہ بسیں اپنے ساتھ گائیڈز بھی رکھتی ہیں جو رواں تبصرہ کرتے رہتے ہیں۔ اِن بسوں کے اٹھارہ سٹاپ ہیں جن میں اہم وائٹ ہاؤس، واشنگٹن مونیومنٹ، یونائیٹڈ سٹیٹ کیپٹل، آرلنگٹن سپیس سنٹر، لنکن میموریل، نیشنل آرٹ گیلری، جیفرسن میموریل، سمتھ سن میوزیم اور کئی اور۔

واشنگٹن دریائے پوٹومیک POTOMACK کے دونوں اطراف واقع ہے۔ شمالی حصہ میری لینڈ میں اور جنوبی حصہ ورجینیا ریاست سے لیا گیا۔ بعد میں ورجینیا کا علاقہ واپس کر کے کولمبیا کا علاقہ دارالخلافہ کے لئے چنا گیا۔ کہتے ہیں کہ یہ جگہ چننے وقت کافی غور و خوض سے کام لیا گیا کیونکہ سبھی ریاستوں کے درمیان رقابت تھی۔ لیکن اس کے نام کے لئے سبھی متفق تھے۔ سوائے ایک شخص کے اور وہ تھا خود واشنگٹن۔ بہر حال ۱۷۹۳ء میں واشنگٹن نے کیپٹل کا سنگِ بنیاد رکھا۔ ۱۸۰۰ء میں مکمل طور پر دارالخلافہ یہاں منتقل ہو گیا۔

نیوجرسی سے واشنگٹن تک کا سفر بے حد لطف اور مزے کا حامل رہا۔ ٹرنیٹن سے نکلے تو پہلے فلاڈلفیا آیا۔ فلاڈلفیا کو بھی یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ دس سال کے لئے امریکہ کا دارالخلافہ رہا ہے۔ فلاڈلفیا کے بعد

Marfat.com

خلیج ڈیلاویئر کا حصہ پار کیا۔ اس وقت تو میں اسے دریا ہی سمجھی اور بڑی حیران ہوئی کہ امریکہ نہ صرف خود عظیم ہے بلکہ اس کے دریا بھی عظیم تر ہیں۔ اتنے بڑے، اتنے کشادہ، کہاں یورپ کی ندیاں۔ پھر ولنگٹن آیا اور اس کے بعد CHESAPEAKE BAY کا حصہ کراس کیا تو بالٹی مور آگیا۔ بالٹی مور میں دور سے فورڈ کا کارخانہ دیکھا۔ شہر کی جو جھلک تھی وہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ دیکھی تھی، اس لئے دو دو منزلہ مکانات دو دو کھڑکیوں والے ہی نظر آتے۔ مزا تو تب تھا کہ وہاں اتر پڑتے اور اس امریکہ کی اہم بندرگاہ کا تفصیلی دورہ کرتے جو ۴۵ میل لمبا ساحلی علاقہ رکھتی ہے جہاں ہر ہفتے تقریباً سو جہاز آتے ہیں اور دنیا جہان کی مختلف چیزیں لاتے اور لے جاتے ہیں۔

بالٹی مور کے متعلق ایک امریکن رائیٹر نے کہا ہے:

THE CITY HAS CURLED UP WITH ITS MEMORIES AND WATCHED THE WORLD GO BY (ANAPOLIS)

امریکہ کا قومی ترانہ

یہ ۱۸۱۴ء کا ستمبر ہے۔ پچاس برطانوی جنگی جہاز تباہی کے سامان سے لیس بلائے بے درماں کی طرح اس شہر پر ٹوٹ پڑنے کے لئے سمندر میں کھڑے ہیں۔ چند ہفتے پہلے ہی ان جہازوں میں سوار برطانوی سپاہیوں نے واشنگٹن ڈی سی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے۔ بچے کھچے شہر کو

Marfat.com

آگ لگادی تھی اور اب یہ خطرہ سنگین صورت اختیار کر گیا ہے کہ اگر بالٹی مور کو بھی واشنگٹن والی قسمت سے دوچار ہونا پڑا تو امریکہ کی فوجوں کا حوصلہ ٹوٹ جائے گا۔ وہ امریکی جو پہلے ہی شکست خوردہ ہو چکے ہیں، اب اور کمزور ہو کر بے یار و مددگار ہو جائیں گے۔ ۱۲ ستمبر کو برطانوی جہازوں نے دھائیں دھائیں بمباری شروع کر دی۔ بندرگاہ کے دہانے پر فورٹ ہنری کا قلعہ واقع تھا۔ فورٹ ہنری پر قبضہ کرنے کے لئے سارا دن ساری رات راکٹ برسائے گئے۔ بموں کی بوچھاڑ رہی۔ میری لینڈ کا ایک وکیل فرانسیس سکاٹ ایک جہاز پر سوار جنگ کی تباہ سامانیوں کو دیکھ رہا تھا۔ جونہی ۱۳ ستمبر کو سپیدۂ سحر نمودار ہوا تو اس نے دیکھا کہ امریکہ کا تیرہ ستاروں اور تیرہ لائنوں والا جھنڈا فورٹ ہنری پر بدستور لہرا رہا تھا۔ حملہ ناکام ہو چکا تھا۔ اس کے دل میں خوشی و مسرّت کے جذبات موجزن ہوئے اور اس نے قلم پکڑ کر ایک لفافے کی پشت پر چند لائینیں لکھیں جو آج کل یونائیٹڈ سٹیٹس کا قومی ترانہ ہیں۔

بالٹی مور سے آگے بڑھے تو واشنگٹن ڈی سی آ گیا۔ سٹیشن پر اترے اور باہر نکلے تو سب سے پہلے نظر کیپٹل پر پڑی۔ یہ واشنگٹن کی اہم ترین عمارت ہے جہاں کانگرس کا اجلاس ہوتا ہے۔ L-ENFANT نے نقشہ بناتے وقت اس کو تمام جگہوں پر DOMINATE کیا ہے۔ یہ ۸۰ فٹ اونچی عمارت ہے۔ واشنگٹن میں اس کا مشرق مشرق ہے اور اس کا مغرب مغرب ہے، یعنی شہر کا مرکز اسے ہی تصور کیا جاتا ہے۔ کیپٹل کے سٹاپ سے ٹورسٹ بس پکڑی اور آگے بڑھے۔ پہلے تو بس میں بیٹھے

Marfat.com

ہے اور صرف دور دور سے نظارہ کرتے رہے کیونکہ یہاں یادگاریں بے شمار ہیں بلکہ اس شہر میں یادگاریں بنانا ایک مشغلہ ہے ۔ ایک صنعت ہے جس جگہ آج کل لنکن اور جیفرسن میموریل ہیں وہاں پہلے دلدلی علاقہ ہوا کرتا تھا۔ سب سے اہم پنسلوینیا ایونیو ہے جس پر وہائٹ ہاؤس واقع ہے۔ گائیڈ نے ہم سے پوچھا آپ کو وائٹ ہاؤس کا ایڈریس معلوم ہے۔ ہم نے کہا۔ نہیں، کہنے لگی 1600, PENSYLVANIA AVENUE، یہ ایونیو بھی پہلے ایک نہر تھی جو بعد میں مٹی بھر کر سڑک بنا دی گئی۔

WHITE HOUSE

وائٹ ہاؤس پہنچے تو یہ عمارت اتنی خوبصورت نہ لگی جیسی تصویروں میں نظر آتی ہے۔ یہ بات تو ہے کہ تصویر میں ہر چیز اصل سے بڑھ کر پیاری معلوم ہوتی ہے۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ تاج محل دیکھنے والے تاج محل کو دیکھ کر مایوس ہو جاتے ہیں کیونکہ خوابوں اور خیالوں میں اسے سنگِ مرمر میں تراشیدہ حسین عمارت کا ایسا بلند و بالا پیکر سمجھتے ہیں جو چاند نگر سے اترا ہو۔ اب تاج محل کو چھوڑیئے، چاند ہی کو لے لیجئے۔ اس کے متعلق جان کر کیسی بیزاری ہوتی تھی بہرحال کچھ بھی ہو، یہ امریکی صدر کی رہائش گاہ تھی جس میں تقریباً ساری دنیا کے سربراہ اور نمائندے آچکے ہیں اور آتے رہیں گے۔ اس کے تقریباً ساٹھ سے زائد کمرے ہیں، خوبصورتی سے سجے ہوتے۔ اب تو ہر کمرہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ عوام کے لئے بھی تین چار کمرے ہفتہ کے کچھ دنوں میں کھولے جاتے ہیں۔ مگر جس دن ہم گئے، وہ دن کمرے دکھانے

Marfat.com

کا نہ تھا یا شاید ہمیں دکھانا منظور نہ تھا۔

وائٹ ہاؤس میں سب سے پہلے رہائش رکھنے والے صدر امریکہ کا نام جان آدم تھا۔ مسز آدم جب ۱۸۰۰ء میں بالٹی مور سے ہجرت کر کے نئے دارالخلافہ پہنچیں تو وہ شہر کو دیکھ کر بے حد مایوس ہوئیں۔ اپنی بیٹی کو ایک خط میں پہلے دن کی روئیداد لکھتے ہوئے کہتی ہیں کہ یہ شہر ایک بدشکل گدلے گاؤں کی مانند ہے جو ایک وسیع دلدلی علاقے میں بنایا گیا ہے۔ البتہ وائٹ ہاؤس ان کو پسند آیا اگرچہ اس وقت وائٹ ہاؤس کا ایک کمرہ بھی مکمل طور پر نہیں بنا تھا۔ کھڑکیوں پر شیشے نہیں تھے۔ نوکروں کو بلانے کیلئے کسی کمرے میں گھنٹی نہیں لگائی گئی۔ گھر کی گیلی دیواروں کو سنبھالنے کیلئے اور گھر کو گرم رکھنے کے لئے کئی جگہوں پر آگ جلانی پڑتی تھی جب کہ لکڑیوں کا حصول بھی مشکل تھا۔ ایک کمرے میں وہ اپنے کپڑے سکھانے کے لئے ڈالتی تھیں۔ جا بجا مستری مزدوروں کا سامان پڑا تھا۔ لیکن ان سب تکالیف کے باوجود وائٹ ہاؤس ان کو خوبصورت لگا۔ وائٹ ہاؤس کی کھڑکیوں سے دریا اور شہر کا نظارہ بھی تھا اور ورجینیا اور میری لینڈ کی ریاستیں بھی نظر آتی تھیں۔ لیکن ۱۴ سال بعد ہی برطانوی فوجیوں نے اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ۱۹ اگست ۱۸۱۴ء کو پنتالیس سو فوجیوں نے جنرل راس کی نگرانی میں واشنگٹن سے جنوب مشرق میں ۴۵ میل دور پڑاؤ کیا۔ اس وقت اس شہر میں صرف سو آدمی تھے جو بہت معمولی قسم کا اسلحہ رکھتے تھے۔ ان پر جلدی ہی قابو پا لیا گیا۔ مسز میڈیسن جو اس وقت کی امریکہ کی فسٹ لیڈی تھیں، وائٹ ہاؤس میں مقیم تھیں۔ ان کو اپنی فوجوں

Marfat.com

کی کامیابی کا اتنا یقین تھا کہ انہوں نے اپنی فوج کی پسپائی خود اپنی آنکھوں سے دیکھی اور برطانوی فوجیوں کے داخلے سے چند گھنٹے پہلے وائٹ ہاؤس خالی کیا۔ انگلش آرمی کے کمانڈنٹ نے وائٹ ہاؤس کو جلانے کے لئے اس کی پچاس کھڑکیوں کے سامنے ایک ایک سپاہی فائر مشین کے ساتھ کھڑا کیا۔ فائر کے حکم کے ساتھ انہوں نے ایک ساتھ کھڑکیوں کو توڑ کر آگ اندر پھینکی۔ ایک لمحے میں سارا گھر شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ آسمان انگارے کی مانند سرخ ہو گیا اور لوگ خوف کے عالم میں دم بخود یہ نظارہ دیکھتے رہے لیکن دوبارہ یہ عمارت کھڑی کی گئی اور جیمز ہابسن کے نقشے کے مطابق ہی بنائی گئی۔ ہنری ٹرومین کے دور میں بھی وائٹ ہاؤس کی بلڈنگ اتنی کمزور ہو گئی کہ اوپر کے کمرے سے پیانو کی ٹانگیں نچلے کمرے میں نکل آئیں۔ اب پھر اس کی مرمت شروع ہوئی۔ مگر کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کا نقشہ بدلا جائے۔ چنانچہ تمام بلڈنگ کو ایک سٹیل کے فریم ورک سے سہارا دیا گیا اور پھر عمارت کو توڑ کر بنایا گیا۔

اب آج کل وائٹ ہاؤس اندر سے کیسا ہے۔ مضبوط ساخت کا حامل ہے یا کمزور تو آپ کو کیا بتا سکتی ہوں کہ ان لوگوں نے اس دن ہمارے سمیت سارے ٹورسٹ کے لئے وائٹ ہاؤس کے لئے دروازے بند کر دیئے تھے کہ کیجئے نظارہ دُور دُور سے۔

واشنگٹن کی اہم شاہراہوں کے درمیان ایک پارک تھا جس میں کچھ لوگ بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے، کچھ دوڑ دوڑ کر ہلکان ہو رہے تھے۔ اپنے خیال میں تو وہ سمارٹ ہونے کے لئے ورزش کر رہے ہونگے

Marfat.com

مگر اصل میں ہوتا یہ ہے کہ خوب دوڑو، اپنے آپ کو تھکاؤ پھر اسی حساب سے کھانا کھالو، پھر کھانا ہضم کرنے کے لئے اور ورزش کرو۔ پھر کمزوری محسوس ہونے پر اور کھاؤ۔ اس لئے عموماً دیکھا گیا کہ ورزش والے کم ہی کمزور ہوتے ہیں۔ واشنگٹن کی اپنی آبادی دس لاکھ ہے جب کہ ہر سال تقریباً بیس لاکھ سے زائد افراد اسے دیکھنے آتے ہیں۔ ہم اب جس بس میں سوار ہوتے اس کی ٹورسٹ گائیڈ بڑی چرب زبان اور خوش خلق تھی۔ اس دن بس بھری ہوئی تھی۔ ہمارے علاوہ ایک ہندو خاندان کے لوگ بھی آئے ہوئے تھے۔ اُن سے بھی سلام دعا ہوئی۔ بس کا ٹکٹ ایک دفعہ خرید لو، پھر جہاں چاہو اترو اور پھر اپنی مرضی سے بس پکڑ کر کسی اور اہم جگہ اتر سکتے تھے۔ ہم دونوں تو بس سارا دن چڑھتے اترتے رہے اور خاص خاص جگہوں پر نزول فرماتے رہے۔

WASHINGTON MONUMENT

واشنگٹن کی یادگار ۵۵۵ فٹ اونچا ایک لمبا سا کالم ہے کہتے ہیں کہ دنیا کا بلند ترین پتھر کا بنا ہوا مینار ہے۔ ۵۰۰ فٹ چڑھ کر ایک کمرہ آتا ہے جس سے باہر دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ یادگار ۱۸۴۸ء میں شروع ہوئی ۱۸۸۴ء میں مکمل ہوئی یعنی ایک سال بعد اس کی ۱۰۰ ویں سالگرہ ہوگی۔ جب اس کی بنیاد رکھی گئی تو ایک آدمی نے کہا تھا کہ ۔" اسے آسمانوں تک بلند لے جاؤ مگر تم اسکے (واشنگٹن کے) اصولوں سے بلند پھر بھی نہیں لے جا سکتے۔"

Marfat.com

MUSEUM OF NATURAL HISTORY

SMITH SON کے نام کے بڑے بڑے ادارے وہاں موجود تھے جن کے متعلق پتہ چلا کہ ایک انگریز سائنسدان کے نام پر ہیں اور اسی کے دیئے ہوئے فنڈز سے بنائے گئے ہیں۔ ہم نے سمتھ سن میوزیم آف نیچرل ہسٹری گھوم پھر کر دیکھا۔ وہ ایک وسیع عمارت میں تھا اور اتنا دلچسپ کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ باہر نکلے تو سوچا کہ جلدی جلدی دو اور عمارتیں دیکھ لیں۔ کیونکہ جانوروں، پرندوں کیڑے مکوڑوں اور زیر آب حیوانات کی ایک وسیع و عریض دنیا دیکھ کر بھی تھکے نہیں تھے۔

LINCOLN MEMORIAL

پہلے بس پر چڑھے اور لنکن میموریل کے پاس اترے۔ اس میموریل کے ۳۶ کالم ہیں جو کہ اس کی موت کے وقت کی ۳۶ سٹیٹس کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ایک بے درو دیوار کمرہ ہے جس میں اکیلا لنکن کرسی پر بیٹھا ہے اور آس پاس کالم پر اس کے GETTSBERG کے ایڈرس کو کھدوایا گیا ہے۔

SPACE CENTRE

اب شام ہونے والی تھی۔ جلد ہی ٹورسٹ بسوں کا ٹائم ختم ہونے والا تھا۔ آخری قرعہ SPACE CENTRE پر پڑا کہ ہمیں چاند پر جانے والی چاند گاڑی دیکھنی تھی۔ اندر داخل ہوتے تو دو منزلہ عمارت

Marfat.com

نظی خلائی جہازوں کے ڈھانچے کھڑے تھے۔ خلا کے متعلق ہر قسم کی معلومات فراہم کی جارہی تھیں۔ کارڈز، پمفلٹ وغیرہ بک رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے گھڑی دیکھنا بھول گئے۔ اب جو وقت دیکھا تو بمشکل آدھ گھنٹہ گاڑی چلنے میں رہ گیا تھا۔ بھاگم بھاگ باہر نکلے۔ اسٹیشن کی عمارت کا انداز رکھ کر جو پیدل چلنا شروع کیا تو کبھی سڑک پر گزرے، کسی پارک کو پار کیا، کہیں درختوں کے نیچے سے گزر رہوا۔ تقریباً ورزش کرنے والوں کی طرح بھاگتے دوڑتے اسٹیشن پہنچے۔ سلیم صاحب لمبے قدموں سے مجھ سے کافی دور نکل جائیں تو ان کو آواز دے کر ٹھہرالوں اور پھر پیچھے رہ جاؤں۔ بہر حال اسٹیشن پہنچ ہی گئے۔ ٹرنٹین جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی یا شاید ہمارے ہی انتظار میں تھی۔ جونہی سیٹ پر بیٹھے گاڑی چل پڑی۔ خدا کا شکر ادا کیا اور کتنی دیر اپنا سانس درست کرتی رہی۔ صبح جو دوڑتے والوں پر ہنسی تھی، شام کو اس کا بدلہ اتارنا پڑ گیا۔ واپسی میں رات کا سفر تھا۔ باہر اندھیرا، ٹمٹماتی روشنیاں، آگ دھواں اگلتے کارخانے تھے اور اندر ہم تھکے ہارے مسافر۔ ٹرنٹین پہنچنے پر بارہ ایک کا وقت ہوگا۔ اب تو ٹیکسی لیتے ڈر لگے۔ ظفر کی آج رات ہسپتال میں ڈیوٹی تھی جس کا مجھے علم تھا۔ اس لئے اسے ہسپتال فون کیا کہ ہمیں آکر لے جاؤ۔ وہ آیا ہمیں گھر چھوڑا اور واپس ہسپتال چلا گیا۔

واشنگٹن نے ہم کو بے حد متاثر کیا۔ یہ شہر واقعی اس قابل ہے کہ اسے دنیا کی طاقتور ترین اور صنعتی لحاظ سے بلند ترین قوم کا دارالخلافہ کہا جاتے۔ یہاں "گورنمنٹ" کے علاوہ کوئی صنعت نہیں۔ یہاں جو لوگ

Marfat.com

آباد ہیں وہ اسے اپنا گھر نہیں سمجھتے۔ یہ ایک طرح سے NO MAN'S OR EVERY MAN'S LAND ہے۔ یہ ایک ریاست نہیں مگر ہر ریاست سے متعلق ہے۔ یہاں یا تو سرکاری ادارے ہیں یا سیاحوں کی بھرمار ہے۔ یہاں کا سب سے بڑا سالانہ تہوار CHERRY BLOSSOM FESTIVAL ہے جو اپریل میں ہوتا ہے۔ ان دنوں چیری کے درختوں سے سفید اور گلابی پھول ٹوٹ ٹوٹ کر سیاحوں پر نچھاور ہو رہے تھے۔ سیاح جو مارچ سے لے کر ستمبر تک جوق در جوق اس شہر کو دیکھنے امڈ پڑتے ہیں۔ یہ شہر جو دوسرے شہروں جیسا ہوتے ہوئے بھی ان سے الگ اور منفرد ہے۔ اس کے دریاؤں میں کوئی مال بردار جہاز نہیں آتا۔ اس میں کوئی فیکٹریاں نہیں چلتیں۔ لیکن اس میں دنیا کا طاقت ور انسان رہتا ہے جو اس ملک کا صدر ہے۔ جس کے پاس محدود اختیارات ہوتے ہوئے بھی وسیع اختیارات ہیں۔ جس کے فیصلے دنیا سنتی ہے۔ جس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی بڑی خبر بنا کر اخبارات میں چھاپا جاتا ہے۔ یوں سمجھیے یہاں پر ELECTED MONARCH رہتا ہے۔

واشنگٹن میں سب سے بڑی بلڈنگ PANTAGON ہے جو کہ تیس ہزار سے زائد ملازمین کو ACCOMODATE کرتی ہے۔ یہاں نیگروز کی بھی بہتات ہے۔ اُن کی گندگی اور غربت کی مظہر بستیاں بھی ہیں۔ غرضیکہ یہ تضادات کا شہر ہے اور دیکھنے کی چیز ہے۔ لیکن بار بار نہیں ایک دفعہ ہی کافی ہے۔

Marfat.com

ڈنر اور سیر سپاٹا

۲۴؍ اگست ۱۹۸۴ء

آج بڑی تھکاوٹ تھی۔ ظفر ہسپتال سے واپس نہیں آیا تھا، اس لئے سبھی دیر تک سوتے رہے۔ دوپہر کو ہم دونوں تو پیدل پھرنے کی خاطر K. MART تک گئے جو ظفر کے گھر کے نزدیک ہی تھی۔ عذرا گھر پر رہی۔ کھانا پکایا، گھر کی صفائی کی، بچوں کے کپڑے دھوتے۔ ساتھ ہم دونوں کے کپڑے بھی دھو ڈالے۔ بھابھی ہو تو ایسی ہو۔ ہم نے سارا سٹور گھوم پھر کر دیکھا مگر چونکہ سامان کی زیادتی سے الرجک تھے، اس لئے کچھ نہ خریدا۔ صرف صالحہ اور سعدیہ کے لئے AGO لی اور واپس آ گئے۔ عذرا ہماری شاپنگ دیکھ کر بہت ہنسی۔

شام کو ظفر آ گیا۔ آج ہم نے پھر ویلی کا ٹیج جانا تھا۔ سردار شوکت حیات خان صاحب نے کہا تھا کہ اکٹھے کھانا کھائیں گے۔ ویسے بھی اُن کے علاوہ ہمارا امریکہ میں اور کون تھا جس سے ملنے جاتے۔ بار بار اُنہی کے گھر کا طواف تھا۔ وہاں پہنچے تو بڑا لطف آیا۔ بڑی پیاری محفل سجی، دیر تک بیٹھے رہے۔ اٹھنے کا دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن ظفر بے چارے کا

Marfat.com

بھی خیال کرتا تھا۔ وہ دن کو ہسپتال کی ڈیوٹی دیتا۔ رات کو ہمیں لے کر نکلتا۔ نیند آنے پر گاڑی روک کر کسی وے سائیڈ کیفے سے بلیک کافی پیتا اور پھر چل پڑتا۔ اُس نے بڑی سخت ڈیوٹی دی۔ ایک دن بھی ہم نے اسے آرام نہیں کرنے دیا۔ مگر اس کی موجودگی میں ہر سیر دلفریب اور دلکش تھی۔ ہر جگہ دلربا اور دلنشین تھی۔ ہر سفر دلاویز اور دلنواز تھا ؎

کِھلا ہوا تھا ہر ایک پھول دل کے گلشن کا
تمہارے قرب کا ہر لمحہ روح پرور تھا

اتنی پیاری عادتوں والا اور اتنی اچھی فطرت والا بھائی کم ہی لوگوں کو نصیب ہوگا۔ یہ چار بہنوں کے بعد پیدا ہوا۔ ہر طرف سے بے پناہ پیار ملا۔ خوبصورت بھی بہت تھا۔ مگر پیار نے اسے بگاڑا نہیں سنوارا ہے۔ ہر ایک سے ہمدردی، ہر ایک کے لئے خلوص، آج تک میں نے اسے غصہ کرتے نہیں دیکھا۔ سب کچھ برداشت کرنا اور چپ رہنا۔ بولنا تو پیار بھرے بول، ہنسنا تو محبت بھری مسکراہٹ سے۔ ماں باپ دونوں کا لاڈلا۔ ہم سب بہن بھائیوں کی آنکھوں کا تارا ؎

آتے جاتے سارے موسم اس سے نسبت رکھتے ہیں
اس کا ہجر خزاؤں جیسا، اس کا قرب بہاروں جیسا

خدا اسے سلامت رکھے۔ اپنی ننھی منی پھلواری میں ہمیشہ جگمگاتے چاند کی مانند چمکے۔ آمین!

واپسی پر اگرچہ کافی رات بیت چکی تھی مگر بچوں سے بات کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ اس لئے جہلم بات کرنے کے لئے کال ملائی۔ جو قدرتِ خدا

Marfat.com

کی فوراً مل گئی۔ سبھی سے باتیں کیں۔ دل کو تسلی ہوتی۔ اُدھر سے ایک ہی اصرار ہے جلد واپس پہنچو۔ خاص طور پر شہنیلہ بڑی اُداس ہے۔ بعد میں شہنیلہ نے بتایا کہ نانی جی مجھے اداس دیکھ کر کہا کرتی تھیں "بیٹی! تمہاری امی کب تمہیں اتنے عرصے کے لئے میرے پاس چھوڑتی تھی۔ اب قدرت نے موقع دیا تو اکٹھے خوشی خوشی رہیں۔ جانے پھر کبھی ایسے رہنا نصیب ہو یا نہ ہو" میرے آنے پر بچے پنڈی آ گئے تو رفعت کا فون آیا۔ "امی بڑی اداس ہو گئی ہیں۔ گھر میں سخت بے رونقی ہو گئی، کہیں یہ تنہائی امی کی جان نہ لے لے"۔ اور وہی ہوا۔ بچوں کے آنے کے چھ دن بعد امی کے دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ وہ تو اللہ تعالےٰ نے ماں بیٹے کا میل کرانا تھا کہ امی BRAIN HAMARAGE کے حملے سے بھی بچ گئیں۔ نہ صرف ہوش میں آ گئیں بلکہ سبھی کو پہچاننے بھی لگ گئیں۔ اور ظفر کی ایک ماہ کی دن رات کی خدمت نے وہ معجزہ کر دکھایا جو ممکن نہ تھا۔ اتنی صحت یاب ہوئیں کہ خود اپنے قدموں چلتی پھرتی تھیں۔ خود کھانا کھاتیں۔ چھوٹے موٹے کام بھی کرنے لگ گئیں تھیں۔ مگر ظفر کی واپسی کے بعد ایک ماہ دلاسے دے دے کر گزارا کہ آپ جلد امریکہ بیٹے کے پاس چلی جائیں گی۔ پاسپورٹ ٹکٹ بالکل تیار تھے کہ مالکِ حقیقی کا بلاوا آن پہنچا۔ موت سے ایک دن پہلے سبھی بیٹیوں کو بلا بھیجا۔ آپا سے کہا "میری تیاری کر لو۔ مجھے فلاں عورت سے نہلوانا۔ میرے کفن کے لئے اپنے ماموں بشیر سے کہنا"۔ پھر کہنے لگیں "فردوس بیٹی! اب تم اکیلی رہ جاؤ گی"۔ پھر غنودگی طاری ہو گئی۔ اس میں کبھی ابا جی مرحوم اور کبھی ماموں مرحوم کا نام لیں کہ وہ آتے ہوئے ہیں۔

Marfat.com

ان تمام باتوں کے باوجود ہمارا دل یہ حقیقت ماننے کو تیار نہ تھا کہ آج ان کی رخصتی ہے۔ میں چھپ کر نکلنے لگی تو عرفان کہنے لگا:

"باجی! ایسے نہیں امی سے مل کر جائیں۔"

مجھے ہمیشہ گھر جانے سے روکتی تھیں" مسرت! ایک دن اور ٹھہر جاؤ"، لیکن یہ صرف بیماری میں اصرار تھا اُس دن مجھے یہی خیال تھا کہ جانا چاہوں گی تو روک لیں گی اور اگر انہوں نے رکنے کو کہہ دیا تو دل جانے کو نہ چاہے گا۔ پھر بھی دل کڑا کر کے ان کے پاس گئی کہ امی بچے اکیلے ہوں گے آپ اجازت دیں تو چلی جاؤں۔ آنکھ کے اشارے سے رضامندی کا اظہار کیا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ چند گھنٹوں کی مہمان ہیں۔ میں پنڈی پہنچی ہی تھی کہ فون آ گیا کہ باپ کے سائے سے محروم تھی ہی آج ماں کی ممتا سے بھی تہی دست ہو گئی ہوں۔ اسی وقت واپس جہلم روانہ ہو گئی۔ گھر پہنچی تو جسد خاکی پڑا تھا۔ روح پرواز کر چکی تھی۔ بہترا روئی، چلائی، معافی مانگی کہ اب آپ کے پاس سے نہ جاؤں گی۔ ایک دفعہ آنکھیں کھول کر دیکھ لو، مگر وہاں تو یہ عالم تھا ؎

شعلہ تھا جل بجھا ہوں ہوائیں مجھے نہ دو

میں کب کا جا چکا ہوں صدائیں مجھے نہ دو

ساری رات پاس بیٹھی وہ پیارے نقش دل میں اتارتی رہی جنہوں نے صبح پیوند خاک ہو جانا تھا۔ کبھی ہاتھوں کو پکڑوں، کبھی پاؤں چھوؤں۔ شاید امی جاگ جائیں، ممکن ہے ہمیں دھوکہ ہوا ہو۔ مگر وہاں

Marfat.com

اک خاموشی تھی، موت کا سناٹا تھا، اجل کا سکوت تھا۔ وہ جا چکی ہیں مگر اب بھی جب اُن کو یاد کرتی ہوں، دل میں طمانیت، طبیعت میں سکون اور چاروں طرف اجالا بکھر جاتا ہے ؎

میں اُس کے تصور سے مہکتا ہی رہوں گا
وہ شخص گلابوں کے جزیرے کی طرح ہے

Marfat.com

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

۲۵ر اگست ۱۹۸۵ء

جس دن سے ہم امریکہ آتے ہیں گھر کی پکی ہوئی روٹی نہیں کھاتی۔ ظفر ہی پکائی روٹی لے آتا ہے۔ ہم گرم کرکے کھا لیتے ہیں۔ عذرا ہنڈیا پکا لیتی ہے، جو اسے پاکستان میں نہیں آتی تھی۔ اب امریکہ نے تو اسے اچھا خاصا تربیت یافتہ باورچی بنا دیا ہے۔ ساگ گوشت تو اس مزے کا پکایا کہ سلیم صاحب پاکستان آنے تک تعریفیں کرتے رہے۔ آج ظفر کے ہسپتال جانے کے بعد ہم دونوں اٹھے تو دیکھا عذرا اور بچیاں سو رہی ہیں۔ سوچا تھوڑی سی سیر کر لی جاتے تو کیا ہرج ہے۔ گھر سے نکلے۔ سٹور کھلے ہوتے تھے۔ لندن کی طرح امریکہ نہیں کہ صبح کے وقت سویا ہوا ہو۔ امریکہ تو سمندر کی مانند ہر لمحہ ہر وقت جاگتا ہے۔ یہاں نہ دن کا پتہ نہ رات کا ہوش۔ زندگی ہر دم ہر آن اپنے ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔ پیدل چلتے ہوتے لوگ خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ زیادہ تر گاڑیوں میں سوار۔ ان میں بھی اکثر اوقات جوڑے بیٹھے ہوتے ہیں۔ یا ایک دو بچے۔ ہمارے ملک کی طرح آدمیوں سے لدی ٹھونسم ٹھانس گاڑیاں بالکل نظر نہیں آتی۔ ایک سڑک کے کنارے چھوٹا سا سپر سٹور نظر آیا۔ یونہی

Marfat.com

تجسس کے مارے اندر گئے۔ وقت گزاری کے لئے پوچھا۔ آپ کے پاس فلور ہو گا۔ دکاندار نے کہا "جتنا کہو مل جاتے گا"۔ بڑے خوش ہوتے کہ عذرا ظفر کو آٹا مل نہیں رہا کہ صرف نیویارک سے انڈین سٹور سے ملتا ہے۔ ہم دونوں نے کیسے دوکان ڈھونڈ لی۔ اسے فرصت نہیں مل رہی تھی کہ ہمارے لئے آٹا خرید کر لاتے۔ اس لئے مجبوراً پکی پکائی روٹیوں پر گزارا ہو رہا تھا۔ چنانچہ جلدی سے آٹے کا پیکٹ پکڑا۔ باقی سیر ملتوی کی۔ فوراً گھر پہنچے، عذرا کو جگایا کہ دیکھو تو سہی ہم کیا لاتے ہیں۔ وہ کہنے لگی "باجی میدہ تو کافی پڑا تھا۔ آپ اور کیوں لائی ہیں"۔ اب جو پیکٹ کھول کر دیکھا تو واقعی میدہ تھا۔ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ساری خوشی کافور ہو گئی۔

دوپہر کا کھانا ڈاکٹر نصرت کے گھر تھا۔ میاں بیوی دونوں ڈاکٹر ہیں۔ خوب گزر رہی ہے۔ دو بچے ہیں۔ بچوں کی تنہائی دور کرنے کیلئے کبھی ڈاکٹر صاحب کی بہن یا امی آجاتی ہیں، کبھی لیڈی ڈاکٹر صاحبہ کی امی آجاتی ہیں۔ دونوں سروس کرتے ہیں اور انتہائی مصروف رہتے ہیں۔ بچوں کی نگہداشت ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب کی امی سال کا حبس بے جا کا پیریڈ گزار کر جا چکی ہیں۔ اب لیڈی ڈاکٹر صاحبہ کی امی کی باری ہے۔ وہ بے چاری قید تنہائی کا شکار۔ جو بھی آتا ہے اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ آج ان کے ہاں ہماری دعوت تھی۔ یہی خیال تھا کہ وہ ہمارے ساتھ جانے کا پروگرام بنائیں گی۔ مگر ان کو نکلنے کون دے گا؟ بوڑھے لوگ وہاں جا کر بے حد بور ہوتے ہیں۔ بہت گھبراتے ہیں۔ مگر آنا اپنی مرضی

Marfat.com

سے جانا دوسروں کی خوشی کے تحت ہوتا ہے۔ اس لئے بیچارے پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ بہتیرا پنجرے سے سر ٹپکتے ہیں، زنجیروں کو توڑنا چاہتے ہیں مگر ہر کوشش بے کار، ہر سعی لاحاصل۔

ہماری ایک رشتہ دار فیملی نے اپنے بزرگ کو انگلینڈ بلایا۔ چند دن تو خوب آؤ بھگت ہوتی۔ مگر پھر صبح ہوتے ہی گھر کا ایک ایک فرد باری باری گھر سے نکلے اور رات گئے واپس لوٹے۔ بوڑھا بیچارا تنہا بیٹھا دیواروں پر لگے کاغذوں کے بیل بوٹے گنتا رہے۔ بار بار اپنے بیٹے سے کہے "میری خطا معاف، مجھے واپس پاکستان جانے دو"۔ مگر وہ ملے ولار اور لاڈ کے ابا جی کو اور رہنے پر مجبور کرے۔ زیادہ تنگ کرنے پر کہے: "ابا جی! کیا آپ کو اپنے پوتے پوتیاں اچھی نہیں لگتیں" بوڑھا بیچارا چپ کر جاتا۔ ایسے ہی ایک دن اداسی سے اپنے پوتے سے کہنے لگا۔ "دیکھو بیٹا! تمہارا ابو میرا پاسپورٹ نہیں دیتا۔ اس نے مجھے باندھ کر رکھا ہوا ہے۔ گھر جانے نہیں دیتا۔" پانچ سالہ پوتا کہنے لگا۔ "دادا ابو! آپ بھی نرے بیوقوف ہیں۔ فوراً پولیس سٹیشن جایئے۔ ابو کی شکایت لکھوایئے۔ پولیس آئے گی ابو کو پکڑ کر لے جائے گی۔ آپ کا پاسپورٹ آپ کو مل جائے گا۔" یہ ہے بیرونِ ملک پلنے والی نئی نسل کی سوچ کا انداز۔

یہی حال امریکہ میں بزرگوں کا ہے۔ اپنوں سے کٹ کر ایک گھر کی چار دیواری کے حصار میں قید۔ بھلا وہ کیا خوش ہوں گے۔ اسی لئے جب ہم ڈاکٹر صاحبان کے گھر پہنچے تو ان کی امی کہنے لگیں۔ "بیٹا! میں سارا دن کھڑکی میں بیٹھے رنگ برنگے موٹروں کو گزرتی دیکھتی ہوں۔ مجھے اپنا

Marfat.com

وطن، اپنے لوگ یاد آتے ہیں یہاں جب کوئی پاکستانی آتا ہے میری بیٹی ضرور مدعو کرتی ہے تاکہ میرا دل لگا رہے۔ میں تو اپنی زبان بولنے کو ترس جاتی ہوں۔ میرے بچے جب گھر آتے ہیں تو ٹی وی لگا کر بیٹھ جاتے ہیں یا تھکے ماندے سو جاتے ہیں۔ میرے لئے تو

جیسے یہ بھی ہو کوئی ہجر کی رات

دن بڑی مشکلوں سے ڈھلتا ہے

لمحہ لمحہ صدیوں پر محیط ہے۔ جانے کب پاکستان پہنچوں گی۔ رات کٹتی نہیں، دن گزرتا نہیں۔

تو یہ ہے وہاں کے لوگوں کا حال جس نسل کے لئے کما رہے ہیں، ان کے لئے وقت نہیں۔ دولت کا حصول ہی اوڑھنا ہے اور یہی بچھونا۔ جس شخص کو بھی روپیہ کمانے کا چسکا پڑ جاتے اس کی ساری زندگی کرنسی بنانے کی مشین بن جاتی ہے۔

ایک دفعہ ایک کینیڈین اپنے دوست سے کہنے لگا کہ میرے امریکی بھائی کو ڈالر حقیقت میں تباہ کر رہا ہے۔ وہ ہر وقت ڈالر اور پھر اور ڈالر کمانے کی سوچتا ہے۔ یہ بات نہیں کہ اسے رقم کی ضرورت ہے بلکہ وہ ڈالر کما کر اور پھر خرچ کر کے خوش ہوتا ہے۔

خوب کمانے اور خوب خرچ کرنے کا ہی رجحان امریکی زندگی کی دوڑ کی بنیادی وجہ ہے۔ وہاں لوگ کماتے ہیں پھر اڑاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ عیش کر رہے ہیں، مگر ذہنی سکون، دلی اطمینان، امن و آشتی ان کی طبیعتوں سے ایسے عنقا ہو گئی ہے جیسے جسم سے روح نکل جاتے۔ اب چاہے ان کو

Marfat.com

جھنجھوڑو، ہنگامہ کرو، شور مچاؤ، مگر بے جان جسموں میں حرکت پیدا کرنا محال ہے۔ ویسے جتنی مرضی سیر کرو، رونقیں دیکھو، لطف اٹھاؤ، مگر وہ سکون جو ہمارے بزرگوں کا مقدر تھا، عنقا ہو گیا ہے۔ چراغ لے کر بھی ڈھونڈنے سے نہ ملے گا۔

دعوت سے لوٹے تو اپنے وطن کی محبت تازہ ہو چکی تھی۔ اللہ تعالےٰ کا کروڑوں بار شکر کیا کہ ہم اِن دوڑنے والے لوگوں میں سے نہیں ہیں جو بغیر منزل کے دوڑے جا رہے ہیں۔ دولت کی ہوس نے نہ وطن کے لئے چھوڑا نہ اولاد کے لئے، نہ بہن بھائی کے لئے نہ ماں باپ کے لئے۔ حتیٰ کہ ایک دوسرے کے بھی نہ رہے۔

گھر پہنچے تو ظفر کی ایک رفیق کار ہم دونوں کو سیر کرانے کے لئے آئی ہوئی تھی۔ اس کا آج ڈے آف تھا۔ اسے علم ہوا کہ ظفر کی بہن اور بہنوئی آئے ہوئے ہیں تو گاڑی لے کر پھرانے کے لئے آن پہنچی۔ پہلے تو وہ ہمیں "BEST" کے شاپنگ سنٹر لے گئی۔ خالص عورتوں والی شاپنگ کروانے کے لئے کیونکہ یہ شاپنگ سنٹر ہیرے جواہرات سے بھرا پڑا تھا۔ سبھی شوکیس LOCKED تھے۔ اگر کوئی چیز باہر نکلوا کر دیکھنی ہو تو سیلز گرل کو بلا لیتے۔ وہ تالا کھول کر دکھاتے گی اور پھر تالا لگا دے گی۔ چنانچہ دل خوش کرنے کے لئے ایک دو ہیرے کی انگوٹھیاں نکلوائیں۔ پھر ناپسند کر کے بند کروا دیں۔ اصل میں وہ اتنی ناپسندیدہ قیمتوں کی مالک تھیں کہ ایک نظر دیکھنے کو بھی دل ڈرتا تھا۔ سخت بیزاری بلکہ کوفت ہوتی۔ خوش کیا ہونا تھا۔ ایسی چکا چوند چیزیں نہ جانے کس دنیا کے لوگ خریدتے ہوں گے۔

Marfat.com

پھر بھی گھوم پھر کر دیکھا۔ بار بار قیمتیں پوچھیں تو ایک کم قیمت والی انگوٹھی سلیم صاحب نے پسند کر لی۔ اب سلیم صاحب خریدتے ہوئے ہچکچائیں۔ سب نے اصرار کر کے سلیم صاحب کو رضامند کر ہی لیا کہ بھئی کچھ تو خریدو۔ ہمارے لئے نہ سہی' اپنے لئے ہی سہی۔ چنانچہ ڈھائی ہزار روپے کی انگوٹھی خرید کر دکان سے باہر نکل آئے۔ اب ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ ہمیں ضروریات زندگی خریدنی ہیں کیسی ایسے سٹور پر لے چلو۔ وہ ہمیں CLOVER کے سٹور پر لے گیئں۔ یہاں کا یہ سٹور اپنی مثال آپ ہے۔ ہر ایک کا کیا کہنا۔ ایک سی فضا' چیزوں کی بھرمار' خریداروں کا ہجوم' سیلز گرل کی مصروفیات' دھڑا دھڑ ٹائپ رائٹر چل رہے ہیں۔ چیزوں کی قیمت ادا کرنے کے لئے آٹھ آٹھ دس دس کاؤنٹر بنے ہیں' اس کے باوجود لائنیں لگی ہیں۔ پانچ بجے شام واپسی ہوئی۔

اٹلانٹک سٹی ۔ جوے کی ہٹی

ایک دو گھنٹے کے بعد ظفر آن پہنچا کہ چلیں آج اٹلانٹک سٹی چلتے ہیں۔ اس نے تو ایک دفعہ ہم دونوں کا پروگرام بنایا تھا کہ آپ لوگ چلے جائیں۔ اگر میں گیا تو عذرا اور بچیاں بھی جائیں گی۔ جب کہ وہاں سبھی جوا خانوں میں بچوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ کیونکہ اگرچہ جوا کھیلنا نہیں مگر جوا خانہ دیکھنا تو مقصود ہوتا ہے۔ مگر ہمیں تو خوف کہ کہیں امریکہ کے میلے میں ہم دو بالغ بچے گم نہ ہو جائیں۔ اس لئے ظفر کے بغیر قدم اٹھاتے بھی ڈر لگتا تھا۔ چنانچہ اسی سے کہا کہ تکلیف کرو اور ساتھ چلو ورنہ ہم اٹلانٹک سٹی دیکھے بغیر ہی چلے جائیں گے۔ بعد میں افسوس ہوا کہ خوامخواہ تکلیف دی۔

Marfat.com

اٹلانٹک سٹی کے لئے LIMOSEN SERVICE اور کئی اور بسیں بھی ٹرنٹن سے چلتی ہیں۔ یہ بسیں صبح دس بجے سے لے کر گیارہ بجے دن تک چلتی ہیں اور وہاں سے اپنے مسافروں کو رات بارہ سے ایک بجے تک کے وقفے میں واپس لاتی ہیں۔ وہ جو کرایہ وصول کرتی ہیں اس میں سے وہاں پہنچنے پر جوا کھیلنے کے لئے کچھ رقم سکوں کی صورت میں دیتی ہیں تاکہ آپ رقم خرچ کرنے کے لالچ میں جوا خانہ ضرور جائیں اور جب رقم ختم ہو تو ڈالروں کو سکوں میں تبدیل کر کے کھیلتے رہیں تا آنکہ آپکی جیب خالی ہو جائے۔ ٹورسٹ دن کو تو نہانے والوں کی چہلیں دیکھتے ہیں رات کو جوا کھیلتے ہیں۔ بسوں کے ٹرمینل مقرر ہیں۔ وقت مقررہ پر وہاں پہنچ جایئے۔ وہ آپ کو دوبارہ آپکے شہر میں پہنچا دیں گی۔

بہر حال ہم لوگوں کو ظفر لے کر رات کے آٹھ بجے چل پڑا۔ پونے ۹ بجے وہاں پہنچے تو گاڑی پارک کرنے کی جگہ نہ ملے۔ ظفر نے کتنے ہی چکر لگاتے مگر ہر جگہ فل تھی۔ گاڑیاں ہی گاڑیاں آخر BALLY'S PARK PLACE میں جگہ مل گئی۔ گاڑی کھڑی کی اور باہر نکلے۔ جیسے آج کل ہمارے ملک میں سینما ہال کو توڑ کر شاپنگ سنٹر بنانے کا رجحان ہے ویسے ہی وہاں عمارتوں کو توڑ کر کئی منزلہ پارکنگ لاٹ بنا دیتے گئے ہیں۔ پھر بھی یہ مسئلہ جوں کا توں ہے۔ حالانکہ تھوڑی سی جگہ میں ڈھلوان دار راستہ بنا کر سینکڑوں کاروں کی جگہ بنا لی جاتی ہے۔ یوں کاریں پانچویں چھٹی منزل تک پہنچ جاتی ہیں۔

نیوجرسی کے ساحل سمندر پر واقع یہ شہر ملکاؤں کا حسن رکھتا ہے اور شہنشاہوں کی سی شان۔ اس کی براڈ واک پر سولہ لاکھ لوگ

Marfat.com

ہر سال سیر کرتے ہیں۔ اس کے پانچ پائیر ہیں جہاں ہر وقت رونق رہتی ہے۔ اس کے گرم سمندر میں نہانے کے لئے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ اسی شہر میں ستمبر کے مہینے میں ملکہ حسن کا انتخاب ہوتا ہے۔ اس وقت امریکہ کی حسین ترین لڑکیوں کا یہاں جمگھٹا لگ جاتا ہے اور ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے تماشائی ٹوٹ پڑتے تھے۔ آخر "مس امریکہ" کے ٹائٹل جیتنے کے لئے مقابلہ کوئی معمولی بات تو نہیں۔

یہاں سارے ہوٹلوں کے ساتھ کیسنو وابستہ ہیں ہوٹل HURRAH "پلے بوائے" TROPICANA "انٹرنیشنل ہوٹل" غرضیکہ بے حساب جوا خانے اور بے شمار ہوٹل ہیں۔ ہم لوگ BELLE کیسنو میں گئے۔ پہلے ظفر اور سلیم اندر داخل ہوئے۔ عذرا اور میں بچیوں کے پاس رہے۔ پھر ظفر بچیوں کے پاس ٹھہرے، سلیم، عذرا اور میں اندر گئے۔ وہاں چمکتی رنگ برنگی روشنیاں تھیں اور سکوں کی جھنکار۔ مشروبات کی تقسیم تھی۔ میزوں پر انہماک سے سر جھکے ہوتے تھے۔ قسمت کا ناچ ہو رہا تھا۔ کسی پر وہ مہربان تھی کسی سے ناراض، کچھ چہرے خوشی سے دمک رہے تھے، کچھ اداسی اور یاس میں گھرے ہوتے تھے۔ ہم تینوں تو پہلے اِدھر اُدھر گھومتے رہے، پھر SLOT نامی مشین کے پاس سلیم صاحب لے گئے کہ یہ مشینیں نو آموز لوگوں کے لئے ہیں۔ بڑے پیمانے پر جواری بھی کھیل رہے تھے، مگر ان مشینوں پر بھی خوب رش تھا۔ میں نے سکے ڈالے تو وہ اندر جا کر غائب ہو گئے۔ عذرا نے ڈالے تو اور زیادہ نکل آئے۔ اس کی خوش قسمتی میں کسے شک تھا مگر ہم بھی کچھ کم نہیں۔ دوبارہ ڈالے مگر

Marfat.com

نتیجہ وہی. شاید اللہ میاں کو مجھے جوئے میں جیتی ہوئی رقم دینی منظور نہ تھی۔
سلیم کا بھی یہی حال تھا جب کہ ساتھ ہی کھڑی ہوئی امریکن عورت جب بھی سکہ ڈالتی تھی چھن چھن کر کے سکوں کی بارش ہو جاتی تھی. ہم مارے حسد اور رشک کے اسے تک رہے تھے۔ وہ بھی اپنی قسمت پہ نازاں مسکرا رہی تھی. اس نے علیحدہ ایک بڑا سا پیالہ سے رکھا تھا. جیتے ہوئے سکے اس میں ڈالنی جاتی تھی. سلیم صاحب نے اسے اپنا سکہ دیا کہ میری مشین میں ڈال کر ہینڈل گھمائے۔ وہ مسکراتی ہوئی آئی. ہینڈل گھمایا. دیکھئے جناب چھن چھن کرتے سکوں کا ڈھیر لگ گیا. سلیم صاحب نے سکے اکٹھے کیئے اور اسے دوبارہ مشین گھمانے کو کہا. مگر اس نے مسکرا کر معذرت کر لی کہ نہیں جناب اپنی قسمت کا پھل میں خود کھاؤں گی. اب جو سلیم صاحب نے سکے ڈالنے شروع کیئے تو ایک ایک کر کے سبھی اندر جا کر غائب ہو گئے. گھبرا کر انہوں نے بقایا عذرا کو دیئے کہ تم ڈالو. مگر جناب قسمت اس سے بھی روٹھ چکی تھی. ہم تینوں منہ لٹکائے باہر نکل آئے. ظفر انتظار کر رہا تھا. اب دونوں بچوں کو لے کر براڈ واک پر سیر کرنے چل پڑے. بحر اوقیانوس کا ساحل ویران پڑا تھا. دن کو یہاں رونق ہوگی مگر اس وقت تو ساری رونقیں ہوٹلوں میں سمٹ آئی تھیں۔

براڈ واک پر ٹرام چل رہی تھی تا کہ سیر کے شوقین آرام سے بیٹھ کر نظارہ کریں. کینڈا سے آئی ہوئی ہمارے ملک کی دو عورتیں پھرتی نظر آئیں. پہلے تو دور سے ہی ایک دوسرے کو سلام کیا. پھر پاس آ کر باتیں کیں. بچوں کی وجہ سے براڈ واک پر ہی پھرتے رہے جو ۵ میل لمبی ہے. پھر پیزا لے کر کھایا. کچھ سوونیئر خریدے. وہاں اکثریت جوڑوں کی صورت میں پھر

Marfat.com

رہی تھی۔ بچے بہت کم لوگوں کے ساتھ تھے۔ کالی عورت کے ساتھ گورا اور گوری کے ساتھ نیگرو۔ بوڑھے کے ساتھ جوان اور جوان کے ساتھ بوڑھی۔ بس ساتھ کی ضرورت تھی اور کسی قسم کی تمیز نہ تھی۔

وہاں موٹی عورتیں بھی دیکھیں۔ موٹی بھی ایسی کہ ریکارڈ توڑ قسم کی۔ پھر اُس پر اُن کا لباس جین اور جیکٹ۔ جسم کا ایک ایک حصہ پکار پکار کر متوجہ کر رہا تھا۔ اتنی بھدی OUTLINE تھی کہ شرم آرہی تھی۔ مگر وہ ٹھسے سے دگڑ دگڑ کرتی چل پھر رہی تھیں۔ وہاں کوئی بھی ان کی طرف دھیان نہیں دے رہا تھا۔ ہمارے یہاں تو ٹھٹھے کے ٹھٹھ لگ جاتے، پولیس آجاتی، آنسو گیس پھینکی جاتی تب کہیں مجمع چھٹتا۔ پھرتے پھرتے بچیاں نیند سے ہلکان ہونے لگیں۔ رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔ رات جوان تھی رنگین تھی۔ مگر اپنے میں ہمت نہ تھی۔ واپسی کا سفر شروع کیا۔ اب سڑک پر ٹریفک بھی کم تھی۔ کیفے بھی غیر آباد سے تھے۔ ظفر بلیک کافی پیتا رات کے تین بجے ہمیں گھر لے کر پہنچا۔

نیاگرا فال ــــ تفریحی چال

۲۶، اگست ۱۹۸۳ء

آج سب کی آنکھ دیر سے کھلی ہمارے جاگنے سے پہلے ہی ظفر ہسپتال جا چکا تھا۔ اس کی واپسی پر نیاگرا فال کے لئے روانہ ہونا تھا۔ اس لئے میں نے ناشتہ کے بعد کچھ پیکنگ کی۔ عذرا بھی اسی کام میں مصروف رہی۔ پھر سب نے مل کر کھانا کھایا اور سو گئے۔ ظفر ہسپتال سے آیا تو سب کو خواب خرگوش

Marfat.com

سے جگایا کہ چلو سفر طویل اور وقت قلیل۔ سبھی گاڑی میں بیٹھے۔ نیوجرسی سے
نکلتے ہی پنسلوینیا سٹیٹ شروع ہوگئی۔ اگرچہ "ویلکم پنسلوینیا" کا بورڈ دیر
میں آیا۔ راستہ بے حد خوبصورت تھا۔ فاصلے فاصلے پر مکانات نظر آ رہے تھے۔
ہائی وے چونکہ شہروں سے باہر باہر گزرتے ہیں۔ اس لئے شہروں کی اصل
رونق کم دیکھنے میں آتی۔ پھر BUSHKILL FALLS کا علاقہ آیا۔
یہ چھوٹے چھوٹے آبشاروں سے اٹا خوبصورت علاقہ ہے۔ ہمیں نہ وقت
نہ خواہش۔ ہماری منزل تو اور ہی آبشار تھی۔ QUAKER'S TOWN
آیا اور بعد ازاں ALLEN TOWN۔ اب چونکہ رات ہو چکی تھی،
اس لئے شہر جگ مگ کرتی روشنیوں سے منور نظر آئے۔ مگر ہم ان کا
دور سے نظارہ کرتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ظفر گاڑی دوڑائے لئے
جا رہا تھا۔ اب BLUE MOUNTAINS کا علاقہ شروع ہوگیا۔ ان
پہاڑوں کا ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ ایک سرنگ کے ذریعے پار کیا جو LEHIGH
TUNNEL کے نام سے موسوم ہے۔ یہ سرنگ روشن اُجلی چمکیلی بتیوں سے
فروزاں تھی۔ ہوا کا انتظام بھی ایسا تھا کہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ زیر زمین دوز
علاقے سے گزر ہو رہا ہے۔ اب POCEONO MTS کا علاقہ آیا۔
اگرچہ مقامی طور پر یہ پہاڑ ہر علاقے میں مختلف ناموں سے پکارے جاتے
ہیں مگر ہیں ایک ہی سلسلہ کوہ جسے جغرافیہ دان APPALACHIAN
MOUNTAINS کہتے ہیں۔ اب رات اندھیرے ماحول کو اپنی گرفت میں
لے چکی تھی۔ کوئی قصبہ یا شہر گزرتا تو روشنیوں کا خوبصورت نظارہ
دیکھنے کو مل جاتا۔ ورنہ اندھیرے میں گاڑی کی بتیوں سے روشن بل کھاتی

Marfat.com

سڑک نظر آتی اور کچھ بھی نہیں۔ ظفر کو نیند ستانے لگی تو ایک کیفے کے سامنے رک گیا۔ اس نے اندر جا کر کافی پی۔ ہم نے آئس کریم کھائی۔ بڑی لذیز اور خوش ذائقہ آئس کریم تھی۔ کھانے کے بعد بھی دیر تک زبان پر اس کا مزا رہا۔ رات کے بارہ بجے ہم پینلو ینیا سٹیٹ سے نکل کر نیویارک سٹیٹ میں داخل ہوئے۔ وہاں مختلف ریاستوں کے درمیان سفر کرتے ہوئے بالکل اندازہ نہیں ہوتا کہ کب ایک ریاست سے نکلے اور دوسری ریاست میں داخل ہوئے۔ ایک جیسے ترقی یافتہ خوبصورت علاقے۔ خداوند کریم نے امریکہ والوں کو نہ صرف خوبصورت سرزمین دی ہے بلکہ اس خوبصورتی کو اجاگر کرنے کے لئے ذہن اور ہاتھ بھی دیتے ہیں۔ ایک بجے کے قریب CARNING پہنچے۔ اب وہاں جس موٹل میں بھی جائیں فل کا بورڈ لگا ہوا۔ آخر TOWN MOTEL میں جگہ مل گئی۔ یہ روٹ نمبر ۷ اپر کارننگ سے ۲ میل مشرق کی طرف تھا۔ ہم ایک چھوٹے سے روشن کمرے میں پہنچے جہاں سے اپنے کمروں کا پوچھنا تھا۔ ایک ہندوستانی مل گیا جو اپنی بیوی کے ہمراہ اس موٹل کے مالک کے پاس ملازم ہے یہ بکنگ کرتا ہے۔ بیوی لوگوں کے کمرے صاف کرتی ہے۔ بستر کی چادریں تبدیل کرتی ہے۔ بڑی حیرت ہوئی کہ دنیا کے کون کون سے علاقے کے لوگ روزی کی خاطر کہاں کہاں پہنچے ہوتے ہیں۔ کہاں کارننگ اور کہاں کاٹھیاوار۔ ظفر عذرا اور بچیاں اپنے کمرے میں چلی گئیں سلیم اور میں اپنے کمرے میں آ گئے۔ آرام دہ بستر، نیلے پردے، کشادہ کمرے، صاف ستھرا باتھ روم، گھر سے باہر گھر کا مزا آ گیا۔ خوب گہری نیند سوئے۔

Marfat.com

CARNING STORE

۲۷ اگست ۱۹۸۳ء

رات چونکہ دیر سے پہنچے تھے اس لئے دیر تک سوتے رہے۔ پھر بھی ہم دونوں دوسرے ساتھیوں سے پہلے اٹھ کھڑے ہوتے۔ ان کو سوتا پاکر ناشتہ کی تلاش میں چل پڑے۔ پتہ چلا کہ آج اتوار ہے اس لئے موٹل کے ساتھ ملحقہ ریسٹورنٹ بھی بند ہے۔ چائے پینی ہے تو شہر جائیے۔ تھک ہار کر پھر آ بیٹھے۔ اب عذرا ظفر اٹھے اور ہمارے دروازے تک آتے مگر اس خیال سے کہ ہم سوتے ہوتے ہیں، جگانا مناسب نہ سمجھا۔ بغیر دستک دیئے واپس چلے گئے۔ کافی دیر ہوگئی سلیم صاحب کہنے لگے۔ اٹھو بھئی ظفر کو جگاؤ۔ وہاں پہنچے تو قافلہ تیار، نہایا دھویا، فٹ فاٹ ہمارے انتظار میں بیٹھا سوکھ رہا ہے۔ جلدی سے تیار ہوتے۔ ایک دوسرے کے لحاظ میں دس بج گئے تھے۔ میکڈانلڈ میں ناشتہ کیا کیونکہ عذرا کو ان کے BUNS بڑے اچھے لگتے ہیں اور بچیاں بھی جب باہر سفر میں ہوں تو یہیں ناشتہ کرنا پسند کرتی ہیں۔

اب چونکہ کارننگ میں آتے تھے جو اپنے برتنوں کی فیکٹری کے لئے امریکہ بھر میں مشہور ہے، اس لئے سوچا کہ کچھ شاپنگ کرتے جائیں۔ برتنوں کے سٹور میں پہنچے تو بے شمار خریدار۔ یہ برتن میکرو ویوا ودن میں بھی استعمال ہوسکتے ہیں، آگ پر بھی گرم کئے جائیں تو ٹوٹتے نہیں۔ ہمارے پاس MICRO WAVE اودن نہیں مگر اس خیال سے خریداری کرلی کہ

شاید انہی برتنوں کے طفیل یہ چولہے بھی میسر ہو جائیں۔ عذرا کے پاس کارننگ کی بنی ہوئی ایک بڑی خوبصورت چائے دانی تھی۔ وہ چائے دم کر کے اسے چولہے پر رکھ دیتی کہ چائے گرم تر رہے۔ میں نے بھی ویسی چائے دانی لی مگر بدقسمتی سے راستے میں پیکنگ کے دوران ٹوٹ گئی۔ اب نیاگرا فال کا سفر شروع ہوا۔ پہلے BATH , CHOCTON آیا۔ ظفر نے امریکہ کی سڑکوں کا نقشہ پاس رکھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے دیکھتے نیاگرا سٹی آن پہنچے۔ پھر نیاگرا انفارمیشن سنٹر پہنچے تو انہوں نے کہا کہ آپ TOUR لے لیں۔ تین گھنٹے کا ٹور ہوگا اور ستائیس ڈالر فی کس ہوں گے۔ ظفر گاڑی میں ہم سے پوچھنے آیا سلیم صاحب تو ہچکچائے مگر میں نے فوراً کہا کہ ظفر ٹکٹ لے لو۔ جب ٹور دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ فیصلہ بڑا مہنگا پڑا۔ انہوں نے دکھایا بھی کچھ نہیں۔ یہی کچھ ہم اپنی گاڑی میں بیٹھ کر دیکھ سکتے تھے۔ اسی لئے جب ظفر ٹکٹ لینے گیا تو وہاں بیٹھا ہوا امریکی کہنے لگا کہ آپ پہلے پاکستانی ہیں جنہوں نے یہ ٹکٹ لیا ہے۔ میں سمجھی مذاق کر رہا ہے۔ لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ اس میں کچھ تھوڑی سی سچائی بھی تھی۔

ہم لوگوں نے GATEWAY MOTEL میں دو کمرے لئے تھے۔ انفارمیشن سنٹر والوں نے کہا کہ اپنا ایڈریس بتا دیجئے۔ GRAY HOUND کی بس آپ کو وہاں سے لے لے گی۔ شام کو بس آن پہنچی ہم تینوں کو تو پچھلی سیٹیں ملیں سلیم صاحب کو فرنٹ سیٹ مل گئی۔ بس والوں نے RAMADS INN سے بھی سواریاں لیں۔ اب نیاگرا فال کی طرف چل پڑے۔

Marfat.com

DRAMA IN REAL LIFE

جب ہماری بس RAINBOW BRIDGE پر سے گزر رہی تھی جہاں امریکی RAPIDS ہیں تو ہم نے دیکھا کہ سڑک کنارے لگے ہوئے جنگلے سے ایک عورت دریا میں چھلانگ لگانے کی کوشش کر رہی ہے جبکہ ایک مرد اور ایک عورت اسے پیچھے کی طرف کھینچ رہے ہیں۔ ہمارے بس ڈرائیور نے جب یہ کشمکش دیکھی تو ایک مسافر سے کہا کہ فوراً پولیس کو اطلاع دو اور خود بس کھڑی کر کے دوڑتا ہوا ان لوگوں کی مدد کو بھاگا۔ دوڑتے ہوتے جب اس نے سڑک کا جنگلہ اچھل کر پار کیا تا کہ پیدل چلنے والوں کے راستے پر پہنچے تو اچھلتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکلا اور نیچے دریا کی لہروں میں گم ہو گیا۔

لیجئے جناب، عورت کا جھگڑا ہر جگہ ویسا ہی ہے جیسا ہمارے ملک میں ہے۔ اتنی آرام دہ زندگی بسر کرنے والی عورتوں کے لئے بھی آخری جائے پناہ دریا کی شوریدہ لہریں ہیں یا سمندر کا کنارا۔ بس کے ایک مسافر نے اٹھ کر وائرلیس پر پیغام دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سائرن بجاتی آگے پیچھے دو گاڑیاں آن پہنچیں۔ وہی عورت جو دو تین آدمیوں سے قابو میں نہیں آ رہی تھی، خاموشی سے سپاہی کے ساتھ پولیس گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اے عورت! تیرے ہزار روپ اور ہر روپ نیا، البیلا اور انوکھا۔

اب ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ بجلی بھی چمکنے لگی تھی۔ ڈرائیور پژمردہ سا واپس آیا۔ مسافر بھی بے صبرے ہو گئے تھے کیونکہ یہ ڈرامہ دیکھنے

Marfat.com

ہیں کافی وقت ضائع ہو گیا تھا۔ نیاگرا فال تک پہنچے تو بارش موسلا دھار ہو چکی تھی۔ اب آبشار کا پانی اور بارش کا پانی دونوں مل جل کر ایسی تیز بوچھاڑ ہم پر ڈال رہے تھے کہ سبھی لوگ پانی میں شرابور ہو گئے۔ آبشار کا شور، بجلی کی چمک، بادلوں کی گڑگڑاہٹ، پانی کی بوچھاڑیں، عجب ہیبت ناک نظارہ تھا۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کہاں سے آبشار شروع ہوا، کہاں سے بارش کا کمال ہے۔ ہم سب بھیگتے ہوتے سوونیئر شاپ تک پہنچے۔ باہر نکلنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ قدرت اپنے جلال پر تھی۔ کچھ چیزیں خریدیں پھر بس میں سوار ہوتے۔ بارش کہے کہ آج ہی برسوں گی اور خوب برسوں گی۔ اسی ماحول میں امریکہ کا بارڈر پار کیا۔ اب قدرے سکون ہو رہا تھا۔ ایک جیسا ماحول، ایک جیسے لوگ، ایک جیسی سڑکیں۔ صرف سڑک کے درمیان رکاوٹ ڈال کر دونوں ملکوں کو علیحدہ کیا ہوا تھا۔ امریکہ اور کینیڈا دو دوستوں کی طرح رہتے ہیں۔ اِن کی بارڈر لائن ۵۰۰ میل لمبی ہے۔ مگر اِن میں کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔

کینیڈا کی طرف پہنچے تو آبشار کا سارا نظارہ نظروں کے سامنے آ گیا۔ اب WILLIAM DEAN HOWELL کی نظم کا یہ ٹکڑا ذہن میں گونجا اور اپنی تمام تر سچائیوں سے اجاگر ہوا۔ وہ نیاگرا فال کے متعلق لکھتا ہے:۔

IT MOVES THE BEHOLDER BUT ITSELF

IT DOES NOT MOVE.

پانی ایک تسلسل سے گر رہا تھا۔ صرف پانی کہنا اس آبشار کی توہین ہے۔

Marfat.com

دو وسیع پاٹ والے دریا تھے جو ٹنوں پانی گرا رہے تھے۔ پانی گرنے کا شور کان پڑی آواز سننے نہیں دیتا تھا۔ اسی لئے انڈین اسے THUNDER OF THE WATERS کہتے ہیں۔ نیاگرا کوئی دنیا کا سب سے بڑا آبشار نہیں۔ ایسے پچاسوں آبشار دوسرے علاقوں میں موجود ہیں۔ حتیٰ کہ کیلی فورنیا کی ریاست میں UPPER YOSEMITE نامی آبشار نیاگرا سے آٹھ گنا بڑا ہے۔ لیکن اس کی بھی اپنی خصوصیات ہیں جس کی وجہ سے یہ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ایک تو یہ ایسے علاقے میں واقع ہے جہاں تک رسائی آسان ہے۔ دوسرے کسی آبشار میں بلندی ہے تو اتنا زیادہ پانی نہیں۔ کہیں چوڑائی ہے تو اتنی بلندی نہیں۔ غرضیکہ یہ سولہ سٹوری جتنا اونچا آبشار شاندار اور خوبصورت سمجھا جاتا ہے۔

نیاگرا فال دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک امریکن فالز کہلاتا ہے، دوسرا کینیڈین۔ کینیڈین حصہ وسیع ہے، بڑا ہے اور گھوڑے کی نعل کی مانند ہے اس لئے اسے HORSE SHOE FALL بھی کہتے ہیں۔ درمیان میں جو جزیرہ ہے وہ سخت چٹانوں پر مشتمل ہے۔ اس کا نام GOAT'S ISLAND ہے۔ اتنے خوبصورت جزیرے کا ایک غیر رومانٹک نام۔ شائد اس لئے کہ کسی زمانے میں یہاں بکریاں چرتی ہوں گی۔ مگر بکریاں گھاس چرنے کے لئے دریائے نیاگرا کے وسیع پاٹ کیسے پار کرتی ہونگی۔ بس اللہ کی اللہ جانے۔ آج کل یہ جزیرہ خوبصورت قطعہ زمین ہے جس پر ایک ریسٹورنٹ بھی واقع ہے۔

آبشار نیاگرا دونوں ملکوں (امریکہ کینیڈا) کے لئے بے بہا آمدنی

Marfat.com

کا ذریعہ ہے۔ ایک تو یہاں ٹورسٹ کا ہجوم رہتا ہے جو گرمیوں میں چمکیلے نقرئی پانی کی دھار دیکھنے آتے ہیں اور سردیوں میں سفید روئی کے گالوں جیسی جمی برف کے درمیان دھواں دار پانی بہتے دیکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کئی کارخانوں کو بجلی فراہم کرتا ہے۔

MAID OF THE MIST (کہر کی دوشیزہ)

امریکن فال ... افٹ چوڑا ہے جب کہ کینیڈین فال ۲۶.. فٹ۔ کینیڈین سائیڈ پر پانی زیادہ تیز رفتاری اور مقدار میں زیادتی سے گرتا ہے جس کی وجہ سے اس حصے پر دھویں اور دھند کے بادل چھائے رہتے ہیں۔ ٹورسٹ اس دھند بھرے آبشار کا قریب سے نظارہ کرنے کیلئے کشتیوں میں بیٹھ کر کالے پلاسٹک کے لبادے اوڑھ کر اور اسی قسم کے جوتے پہن کر جاتے ہیں تاکہ پانی کی بوچھاڑ سے محفوظ رہیں جن کشتیوں میں یہ THRILLING سفر کرتے ہیں ان کو MAID OF THE MIST کہتے ہیں۔ ۱۸۴۶ء سے لے کر اب تک سیاحوں، سربراہان مملکت اور کئی اہم شخصیتوں نے اس سفر کا مزا لوٹا ہے جو دنیا میں اپنی نوعیت کا بس ایک ہی ہے۔

نیاگرا دریا جب لیک ERIE سے نکلتا ہے تو لیک اونٹاریو میں پہنچنے تک راستے میں ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں بلند سطح زمین سے پستی کی طرف آنا پڑتا ہے۔ یہی مقام نیاگرا آبشار کو وجود میں لاتا ہے۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ جہاں آج کل نیاگرا فال ہے ہزاروں

Marfat.com

سال پہلے یہ وہاں نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ یہ آٹھ میل لانبا DOWN STREAM تھا۔ آہستہ آہستہ پانی پہاڑوں کو توڑتا رہا۔ نتیجتہً آبشار پیچھے کی طرف غیر محسوس طریقے سے سفر کرتا رہا۔ آئندہ کئی سو سالوں میں گوٹ آئی لینڈ بھی ختم ہو جاتے گا۔ آبشار کے دونوں حصے مل کر ایک بن جائیں گے۔ ہوتے ہوتے شائد آبشار ہی ختم ہو جاتے۔ مگر نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جھیل ایری بلند سطحِ زمین پر واقع ہے جب کہ جھیل اونٹاریو اس سے کم سطح زمین پر ہے۔ اس لحاظ سے پانی اونچائی سے گرے گا ہی چاہے RAPIDS کی شکل میں گرے یا جھیل ایری کے کنارے سے آبشار بنے۔

FLORAL CLOCK (پھول گھڑی)

ہمارا گائیڈ ہمیں ایک گھڑی دکھانے لے گیا کہ وہ بھی قابل دید جگہوں میں سے ایک شمار ہوتی ہے۔ یہ ONTARIO HYDRO FLORAL CLOCK تھا گھڑی دیکھی۔ اچھی تھی سلیم صاحب تو بڑے مایوس ہوتے۔ کہنے لگے کہ یہ گھڑی اتنا شور شرابا۔ خیر سلیم صاحب تو نیاگرا فال دیکھ کر بھی مایوس ہوتے تھے کہ کیا ہے پانی ہی تو گر رہا ہے۔ گائیڈ گھڑی کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ اس گھڑی میں تقریباً ۲۴۰۰۰ رنگین پودے ڈیزائن بنانے میں استعمال ہوتے ہیں۔ بالکل صحیح وقت دیتی ہے۔ ہر سال اس کا ڈیزائن بدلتا ہے۔ مگر کبھی بھی پچھلا ڈیزائن نہیں دہرایا گیا۔ یہ ۱۳۰ مربع فٹ پر بنی ہے اور جانے کیا کیا۔ ہم نے سوچا اب آتے ہیں تو تصویریں بنا لیں۔ ظفر نے کچھ

Marfat.com

تصویریں کھینچیں اور پھر آگے بڑھے۔

MAPLE LEAF VILLAGE

اب ہمارا گائیڈ ہمیں میپل لیف گاؤں لے گیا۔ اصل میں امریکہ اور کینیڈا والوں نے ٹورسٹ کی جیبیں خالی کرنے کے لئے طرح طرح کے جال بچھائے ہوتے ہیں۔ اگر ان کے تمام کھیل ڈرامے، شعبدہ بازیاں اور رنگینیاں دیکھنا چاہیں تو ایک ماہ بھی کم ہے۔ جابجا نت نئے ہتھکنڈوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اصل میں تو ایک آبشار ہی ہے نا، مگر اس سے ہزاروں تفریحی آبشار نکالے گئے ہیں۔ اب فالز ایونیو پر ہی ۲۳ قسم کی تفریحات ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر دلچسپ اور دلکش۔ میپل لیف ویلج میں گائیڈ نے ہمیں چار ٹکٹ دیئے کہ جو کھیل پسند کرو دیکھو۔ سب سے پہلے ہم TOWER پر چڑھے۔ عذرا کہنے لگی مجھے بلندیوں سے خوف آتا ہے، میں اوپر نہیں چڑھتی۔ سعدیہ اس کے حوالے کی اور صالحہ کو میں نے کر ظفر اور سلیم کے ہمراہ اوپر گئی۔ سلیم صاحب بھی بنیادی طور پر بلندی سے خوفزدہ ہیں، مگر ہم دونوں بھائی بہن بلندیوں کے شیدائی۔ ظفر کا تو پتہ نہیں، مگر میرا دل ہمیشہ اوپر چڑھنے کو مچلتا ہے۔ بلندی سے پستی بھی بڑی دلفریب لگتی ہے، بلکہ بلند جگہ پر کھڑے ہو کر اکثر دل چاہتا ہے کہ یہاں سے چھلانگ لگائی جائے تو کتنا مزا آئے۔ سلیم ہنستے ہیں اور کہتے ہیں تمہارا کوئی SCREW ڈھیلا ہے۔ اصل میں پستی میں بنے چھوٹے گڑیا گھر، ننھی منی دوڑتی گاڑیاں، فضا میں تیرتے بادلوں کی اوٹ سے جھانکتا شہر ایک جادو نگری لگتا ہے

Marfat.com

جس میں میرے لئے بے پناہ کشش ہے۔ ٹاور سے اترے تو عذرا غائب، سلیم بھی ہم دونوں سے پہلے اترے تھے۔ ہمیں تو نیاگرا شہر کے نظارے اور ٹورنٹو کی بتیوں نے مسحور کیا ہوا تھا اس لئے وہیں جمے کھڑے رہے۔ سلیم صاحب بھی ہجوم میں کھو چکے تھے۔ اِن دونوں کو کافی ڈھونڈا پھر سوچا کیوں نہ کچھ اور بھی دیکھ لیں۔ ۲۰ منٹ کی SCRAMTON RIDE لی۔ باہر نکلے تو سلیم صاحب مل گئے کہ ابھی ابھی عذرا ملی تھی۔ بڑی پریشان تھی۔ آپ کو ڈھونڈ رہی تھی اب تینوں زور وشور سے عذرا کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ یہ ڈھونڈا ڈھانڈی اور آنکھ مچولی کا تماشہ کیوں کہ میپل لیف ویلج کی حدود کے اندر ہو رہا تھا اس لئے امید تھی کہ جلد ہی عذرا مل جائے گی۔ عذرا ملی تو میپل لیف ویلج سے نکلنے کا وقت ہو رہا تھا گائیڈ سبھی ٹورسٹ کو اکٹھا کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ گرے لائن کی بس میں سوار ہوتے۔ کینیڈا اور امریکہ کے درمیان بارڈر لائن کو عبور کیا۔ یہ بارڈر لائن دنیا کی لمبی ترین سرحد ہے مگر قلعہ بندیوں سے بے نیاز، مکمل امن و آشتی کے ماحول میں واقع ہے۔ نیاگرا آبشار بھی امریکہ کینیڈا کے درمیان بارڈر لائن بناتا ہے۔ اس وقت نیاگرا پر دور سے بجلی کی رنگین روشنی پھینکی جا رہی تھی۔ بڑے بڑے طاقتور بلب مختلف حصوں پر مختلف روشنیاں منعکس کر رہے تھے۔ اس لئے آبشار کہیں سے گلابی، کہیں جامنی، کہیں نیلا، کہیں سُرخ، کہیں سبز تھا، لگتا تھا رنگ برنگی اوڑھنیاں اوڑھے ہوتے ہو۔

گرے لائن والوں کی بس ہمیں ہمارے موٹل پہنچا گئی۔ عذرا کی طبعت

Marfat.com

خراب تھی۔ وہ جلدی سوگئی۔ سلیم تھک چکے تھے۔ ظفر تھوڑی دیر کے بعد آیا کہ باجی میں ایک سٹور پر جا رہا ہوں۔ آپ نے آنا ہو تو چلیں۔ میں نے سوچا لیٹ کر کیا کرنا ہے۔ چلو گھوم پھر آئیں۔ ہم دونوں نیاگرا سٹی کے ایک سٹور میں گئے۔ میں نے کاجو خریدا۔ کوکا کولا کی ایک بڑی سی بوتل لی اور چند اور چھوٹی موٹی چیزیں خرید کرلے آئی۔ کمرے اچھے تھے مگر ایک خاص قسم کی مہک آ رہی تھی۔ میز پر انجیل پڑی تھی۔ نیند نہ آئی تو اسے پڑھنے لگی۔ چند سطریں ہی پڑھی ہوں گی کہ نیند نے آن گھیرا۔ پھر دنیا و مافیہا سے بے خبر سوگئی۔

۲۸ر اگست ۱۹۸۳ء

آج سفرِ مراجعت تھا۔ جانے سے پہلے سوچا کہ نیاگرا کی کچھ اور دلچسپیاں بھی دیکھ لی جائیں۔ کم از کم آبشار کو تو گھنٹہ بھر کھڑے ہو کر دل بھر کر دیکھ لو۔ اگر تفریحی مراکز اور رنگا رنگ پروگرام دیکھو تو باہر نکلنے کا راستہ ہی نہ ملے۔ انسان انہی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتا ہے۔

ہواؤں کا غار

THE CAVES OF THE WINDS

میں نے ایک دفعہ کسی سفرنامے میں ان کا ذکر پڑھا تھا۔ ظفر سے کہا کہ یہی دیکھنے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے ناشتہ کرنا ضروری تھا۔ اس لئے گوٹ آئی لینڈ گئے اور وہاں کے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ سامنے دونوں آبشاروں کا نظارا بھی کیا جو عجائبات دنیا میں شمار ہوتے ہیں۔

Marfat.com

ان میں ہر سیکنڈ کے بعد ۸۰۰ ٹن پانی گر رہا تھا وہاں سے نکلے تو THREE SISTERS ISLANDS گئے یہ چھوٹے چھوٹے تین جزیرے ہیں، ایک دوسرے سے پلوں کے ذریعے منسلک۔ وہاں تصویریں کھینچیں اور جھاگ اڑاتا پانی کیمرے میں مقید کر لیا۔

اب ہواؤں کے غار کا رُخ کیا۔ اُن لوگوں نے ہمیں امریکن آبشار کے ایک حصے جسے VIRGIN FALL بھی کہتے ہیں، کے نیچے پہنچا دیا۔ اصل میں چٹانیں اس طریقے سے قدرتی طور پر تراشی گئی ہیں کہ غار میں سے گزرتے ہوئے ہم عین آبشار کے نیچے آن پہنچے۔ اب اوپر سے دھڑا دھڑ پانی گر رہا ہے۔ کپڑے گیلے ہو رہے ہیں جس کا انتظام انہوں نے پہلے ہی کر رکھا تھا۔ ہم لوگوں کو پیلے رنگ کے پلاسٹک کے گون مہیا کئے گئے تھے، ہر سائز کے گون تھے حتیٰ کہ صالحہ اور سعدیہ جو تین چار سال کی عمر کی ہیں، کا سائز بھی دستیاب تھا۔ گون پہن کر سر پر ٹوپیاں کس کر پاؤں کو بوٹوں میں چھپا کر ہم اس ٹور پر نکلے۔ ورجن فال کے بالکل نزدیک جانے کے لئے لکڑی کے تختوں سے پل سا بنا دیا گیا ہے جو اتنا تنگ ہے کہ ایک انسان ایک وقت میں چل سکتا ہے۔ اگر آپ سفر پر چل نکلے ہیں تو واپسی ناممکن کیونکہ انسانوں کی ایک لمبی قطار آپ کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی ہے۔ ہم آگے ہی آگے قدم جما کر بڑھتے ہی چلے گئے۔ ظفر سے دونوں بچیاں چمٹی ہوتی تھیں کیونکہ ہوا کا زور، پانی کی بوچھاڑ، کان پھاڑنے والا شور، بلندی سے گرتا ہوا بے پناہ پانی کہ ذرا اور آگے بڑھو تو اسے چھو لو۔ بچیاں گھبرا گئیں۔ عذرا پکڑے تو اس کے پاس نہ جاتیں۔ میرے پاس تو آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ظفر کی ہمت کہ

Marfat.com

دونوں کو سنبھالے آگے بڑھ رہا تھا۔ آخر چکر لگا کر دوبارہ اسی غار تک جا پہنچے جہاں سے سفر شروع کیا تھا۔ شکر ادا کیا کہ بخیریت واپس آگئے ہیں۔ یہ سبھی کے لئے ایک چونکا دینے والا تجربہ تھا۔ وہاں سے نکلے تو اگرچہ قابلِ دید تو بے شمار چیزیں تھیں مگر بھوک بھی لگ رہی تھی اور ۵۰۰ میل لمبا سفر کر کے گھر بھی پہنچنا تھا کیونکہ ظفر کو اگلے دن ہمیں ایئر پورٹ چھوڑ کر ڈیوٹی پر بھی جانا تھا۔

ظفر ہمیں PIZZA HUT لے گیا۔ عذرا نے رقم ڈال کر اپنی پسند کا میوزک بجوایا۔ ہم پیزا کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ یہ تنور کی بڑی بڑی روٹیاں ہیں جن پر ٹماٹر، انڈے، گوشت کے ٹکڑے اور بے شمار مصالحے لگا کر اوون میں پکا لیتے ہیں۔ یہ اٹلی کا کھانا ہے۔ امریکن کیا سبھی لوگ بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ اب تو پنڈی میں بھی اکثر بیکری والے PIZZA بنانے ہیں مگر یہ امریکن پیزا سے مختلف ہوتا ہے۔ پیزا کی تیاری میں کافی وقت لگا۔ کھانا تو کسی اور جگہ بھی کھایا جا سکتا تھا مگر ظفر کا خیال تھا کہ ہمیں امریکہ کے خاص خاص ریسٹورنٹ، اُن کے کھانوں سبھی سے متعارف کروا دے۔ کہیں ملک میں جا کر سبکی نہ ہو کہ آپ نے فلاں چیز نہ کھائی، فلاں دیکھنے میں گئے۔ ۱/۲ بجے فارغ ہوئے۔ اب سب تھکے ہارے تھے اور آرام کے موڈ میں مگر ظفر ہوشیار اور ALERT تھا۔ ساٹھ ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جو چلے تقریباً ۵۰۰ میل سے زائد کا سفر طے کر کے رات بارہ بجے گھر پہنچے۔ واپسی کا ابتدائی حصہ تو نیاگرا اونٹاریو کے ساتھ ساتھ تھا پھر علیحدہ ہو گئے۔ سارا سفر خوبصورت نظاروں سے بھرپور تھا۔ امریکہ

Marfat.com

ہیں ساری زمین جنگلی جڑی بوٹیوں، فرن، بیلوں اور ننھے منے پودوں سے بھری ہوتی ہے اوپر سے چھتنار درخت سایہ کئے ہوتے ہیں۔ مٹی دھول کنکر پتھر دکھائی نہیں دیتے۔ ہر چیز اپنی جگہ پر جمی ہوئی ہوتی ہے۔

گھر پہنچے تو یاد آیا کہ ہم نے اپنے واقف کاروں کو سان فرانسسکو اطلاع نہیں دی۔ وہاں تو ساڑھے نو بجے ہوں گے۔ وہاں اطلاع دی تو کچھ صحیح پتہ نہیں چل رہا تھا۔ چھوٹی بچی بول رہی تھی۔ امی پاکستان گئی ہیں۔ گھر پر کوئی نہیں۔ چلیں اب پھر اٹکل پچو کام شروع ہو گیا۔ رات ۲ بجے تک سارا سامان باندھتی رہی۔ پھر نہائی اور گہری نیند سو گئی۔ باقی سب تو پہلے ہی سو چکے تھے ؎

آؤ ناصر ہم بھی اپنے گھر چلیں
بند اس گھر کے دریچے ہو گئے

۲۹ اگست ۱۹۸۳ء

صبح چھ بجے سبھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ظفر مجھے تیار ہوتے دیکھ کر کہنے لگا "باجی ابھی تو بڑی خوبصورت جگہیں ہیں۔ ابھی کہاں تیاری ہے"۔ میں نے کہا ؎

رفعتیں پیشِ نظر ہیں عرشؔ لیکن کیا کریں
رفعتِ پرواز دی اس نے مگر پر باندھ کر

بچوں کی وجہ سے ۲۹ ستمبر کو ختم ہونے والا سفر ۱۳ ستمبر تک مختصر کیا۔ اب اتنے تھک چکے ہیں کہ ممکن ہے راستے میں اور بھی جگہیں کاٹ

ڈالیں۔ عذرا نے دونوں بچیوں کو جگایا، اُن کو میکڈانلڈ میں ناشتے کا لالچ دیا۔ پھر بھی وہ آنکھیں بند کئے کپڑے بدلواتی رہیں۔ گھر سے باہر نکلے RUSH-HOURS کا وقت ہو چکا تھا۔ گاڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی چیونٹی کی رفتار سے رینگ رہی تھیں۔ دل تو یہی چاہتا تھا کہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلوں اور پیدل چل پڑوں مگر باہر نکلنے کا بھی راستہ نہ تھا۔ خدا خدا کر کے آگے بڑھے۔ VERROZANO BRIDGE پار کیا جو دو ستونوں پر CABLES کے ذریعے لٹکا ہوا تھا۔ یہ دنیا کا بھاری ترین اور لمبا ترین پُل ہے جو ۴۲۹۰ میل لمبا ہے۔ انجینئرنگ کا شاہکار ہے۔ ہم ایئرپورٹ پہنچے۔ جلدی جلدی چیکنگ سے فارغ ہوئے۔ عذرا علیحدہ اداس، ہیں الگ غمگین، لمز کے ساتھ اتنا اچھا وقت گزرا تھا کہ جدائی گراں محسوس ہو رہی تھی۔ جب اسے خدا حافظ کہا تو۔

بچھڑا وہ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

Marfat.com

سان فرانسسکو

پین ایم کا دیو راد طیارہ ہمیں لئے نیو یارک سے پرواز کر گیا۔ آج ہم نے سارا امریکہ پار کرنا تھا یعنی بحر اوقیانوس کے کنارے پر واقع شہر سے اڑ کر بحر الکاہل کے کنارے پر واقع شہر میں پہنچنا تھا۔ نیو یارک امریکہ کا مشرقی کنارا ہے تو سان فرانسسکو امریکہ کا مغربی کونا۔ درمیان میں امریکہ کے پہاڑوں کے سلسلے، وسیع میدان، بحر بیکراں کی طرح پھیلے ہوتے صحرا، دریاؤں کی وادیاں اور کئی سطح مرتفع کے علاقے ہیں۔

اس دفعہ بھی سیٹ اچھی نہ ملی، جانے لندن سے سوار ہوتے وقت کیا غلطی ہو گئی کہ اب سیٹ درمیان میں ملتی رہی جس سے مجھے سخت کوفت ہوتی تھی۔ ایک دو دفعہ اٹھ کر کھڑکی سے جھانکا، بادلوں کے گدیلے چاروں طرف پھیلے ہوتے تھے۔ راکینز مونٹین آتے تو پائلٹ نے پکارا کہ دیکھئے کیا خوبصورت نظارا ہے۔ اٹھ کر دیکھا کہ پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں زیر نگین تھیں، سورج کی روشنی سے برف کی چمک چکا چوند کر رہی تھی، کہیں کہیں آتش فشاں پہاڑوں کی طرح پیالہ نما جھیلیں، نوک دار چوٹیاں، کالی سیاہ چٹانیں نظر آ رہی تھیں۔ اب سوچا کہ سان فرانسسکو

Marfat.com

آنے ہی والا ہے۔ وہاں کے وقت کے مطابق دن کے ۱۲ بجے ایرپورٹ پر اترے۔ نہ کسی کو اطلاع تھی نہ کوئی لینے آیا۔ سارے ایرپورٹ کا چکر لگایا۔ شیشے کی دیواروں سے پہاڑیاں نظر آرہی تھیں جن کے اوپر اور دامن میں یہ اجنبی شہر آباد تھا۔ ان پر چھوٹے چھوٹے مکانات بھی تھے۔ کیفے میں بیٹھ کر چائے وغیرہ پی اور سر جوڑ کر بیٹھے کہ اب کیا کریں۔

سلیم صاحب کہنے لگے کہ ابھی اچھا خاصا دن ہے۔ ایک دفعہ پھر چکر لگا کر دیکھتے ہیں، شاید کوئی حل نکل آئے۔ دونوں اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر چڑھتے اترتے رہے۔ یہ تجربہ بھی خوب تھا۔ ایک ہندو خاندان اپنے مہمان رخصت کرنے آیا تھا۔ انہوں نے ہمیں جو یوں شترِ بے مہار کی طرح آوارہ گردی کرتے دیکھا تو پوچھا آپ نے کہاں جانا ہے۔ ہم نے کہا کہ ہمارے واقف کار تو SAN ROSE میں رہتے ہیں، مگر وہ ملے نہیں۔ کہنے لگے اوّل تو اسے سان روز نہیں بلکہ سان جوزے کہتے ہیں، دوسرے اگر آپ کے پاس ان کا ایڈریس نہیں ہے تو ہمارے ساتھ چلیں ہم آپ کو ان کے گھر پہنچا دیتے ہیں۔ سلیم صاحب کہنے لگے کہ ممکن ہے وہ وہاں ہوں ہی نہیں کیونکہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے، کوئی اٹھاتا نہیں۔ وہ کہنے لگے کہ ہو سکتا ہے سبھی سروس کرتے ہوں۔ شام کو گھر آجائیں۔ آپ ہمارے ہاں چلیں۔ اگر وہ آگئے تو وہاں پہنچا دیں گے ورنہ آپ جتنے دن چاہیں ہمارے ہاں رہیں۔ چشمِ ماروشن دلِ ماشاد۔

لیجئے ایرپورٹ پر پھرنے کا ایک فائدہ تو ہوا۔ مگر میں نے جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے کہ سلیم باہر جا کر بڑے مذہبی بن جاتے ہیں۔ کہنے لگے کہ

Marfat.com

چلیں تو جاتیں مگر جانے ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں۔ پھر کچھ اچھا بھی
نہیں لگتا۔ ہم کسی ہوٹل میں ٹھہر جاتے ہیں۔ اُن سے معذرت کی۔ اُن کی پیشکش
کا شکریہ ادا کیا اور ایئر پورٹ پر ہوٹل والوں کی طرف سے جو فری فون سروس
تھی وہاں سے چونکا اٹھایا تو سلسلہ سیدھا ہوٹل والوں سے جا ملا۔ وہاں پر
ریسور کے ساتھ ہوٹل کا نام درج تھا۔ جس کا ریسور اٹھاؤ اسی ہوٹل سے
رابطہ ہو جاتا تھا۔ سلیم صاحب نے ہالیڈے اِن کا ریسور اٹھایا اور کہا
کہ گاڑی بھیجیں۔ ہم آپ کے ہوٹل کو شرف میزبانی بخشنا چاہتے ہیں۔ انہوں
نے ایئر پورٹ سے باہر نکل کر کھڑے ہونے کو کہا۔ ہماری نشانی پوچھی تاکہ
گاڑی کے ڈرائیور کو بتا سکیں۔ میں نے کہا کہ پاکستانی ہوں شلوار قمیض
اور دوپٹہ میں ملبوس۔ صاحب بہادر بالکل انگریز ہیں پینٹ بشرٹ میں
ملبوس۔ بیس پچیس منٹ کے بعد گاڑی آن پہنچی۔ کمرہ لیا اور لیٹنے کی سوجھی کہ
ایئر پورٹ پر دو گھنٹے کی آوارہ گردی نے سارے کس بل نکال دیتے تھے۔
سلیم صاحب کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ چاہیں کہ میں باتیں کروں۔
ہوں ہاں کرتی رہی اور ے

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

جانے کب میں نیند کی وادیوں میں گم ہو گئی اور کب ان کو نیند آئی۔
کچھ خبر نہ تھی۔

Marfat.com

سنہرا دروازہ (GOLDEN GATE)

۳۰ اگست ۱۹۸۳ء

صبح اٹھے۔ چونکہ کوئی پروگرام نہ تھا، کہیں جانے کی جلدی نہ تھی اس لئے کسل مندی سے بستر پر ہی کروٹیں بدلتے رہے۔ پچھلے دس دنوں سے امریکہ ہمارے اعصاب پر سوار تھا۔ اب ایک دم سے اُسے اٹھا پھینکا۔ سلیم صاحب نے پوچھا کہ باہر چلنا ہے۔ میں نے کہا، چلنا کیوں نہیں، اس شہر کی تو بڑی تعریفیں سنی ہیں کہ یہ دنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ سات پہاڑیوں پر آباد ہے۔ نیلے آسمان تلے رنگ برنگی عمارتوں کھلی شفاف سڑکوں اور بے شمار پھولوں سے لدا ہوا یہ شہر امریکہ کی خوبصورت بندرگاہ بھی ہے اور پرانے لوگوں کے بقول "سنہرا دروازہ" بھی ہے۔ پھر گولڈن گیٹ برج بھی دیکھنا ہے جس کی شاہکاری کے چرچے دنیا کے دوسرے کونے تک پھیلے ہوتے ہیں۔ بحرالکاہل سے خلیج سان فرانسسکو میں داخل ہونے کے لئے اسی پُل کے نیچے سے گزرنا پڑتا ہے جسے اتنا اونچا بنایا گیا ہے کہ بڑے سے بڑا بحری جہاز باآسانی اس کے نیچے سے گزر سکتا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں یہ پُل بن کر مکمل ہوا ورنہ اس سے پہلے لوگ FERRY کے ذریعے آرپار جایا کرتے تھے۔ اس کی تکمیل پر اس کے ڈیزائنر اور خالق نے کہا تھا:

AT LAST THE MIGHTY TASK HAS BEEN DONE.

Marfat.com

سلیم صاحب صبح ناشتہ نہ ملنے پر بیزار بیٹھے تھے۔ کہنے لگے بس کرو یہ قصّے۔ آخر ایک پُل ہی تو ہے۔ دیکھ لیں گے۔ آخر بصد مشکل ان کو نکالا۔ ٹیکسی پکڑی اور پُل پر آن پہنچے۔

یہ پُل امریکہ کے ویری زونا برج کی طرح ہی لگا۔ اصل میں دونوں —— SUSPENSION BRIDGE ہیں۔ سان فرانسسکو سے YERBE BUENA کے جزیرے تک تو معلق پُل ہے پھر اس جزیرے کو کیلی فورنیا کے تین میدانوں سے ملانے والی سرزمین تک دوسرا پُل CANTI LEVER ہے۔

ٹیکسی وہاں چھوڑ دی تھی۔ ایک پارک میں بیٹھ کر کچھ وقت گزارا۔ گاڑیاں ہزاروں کی تعداد میں آجا رہی تھیں۔ کہتے ہیں کہ اس پل سے روزانہ ایک لاکھ کاریں گزرتی ہیں۔ جانے خدا کی مخلوق کدھر سے آتی ہے اور کدھر کو جاتی ہے۔ سان فرانسسکو مصروف ترین شہر ہے۔ اردگرد کے علاقوں سے لوگ دفتروں میں کام کرنے یا اس کے پارکوں میں دھوپ سینکنے یا صرف لطف اندوزی کی خاطر یہاں آجاتے ہیں۔ مجھے یہاں زیادہ تر جاپانی اور چینی نسل کے لوگ نظر آتے۔ ویسے کتابوں میں پڑھا تھا کہ یہاں سب سے پہلے ہسپانوی نسل کے لوگ آتے۔ جب دنیا بھر میں یہ خبر عام ہوتی کہ کیلی فورنیا کی سرزمین سونا اگلتی ہے تو جو GOLD RUSH شروع ہوا، ۱۸۴۹ء تک اس کو گولڈ رش کے تحت ہر ملک سے اور ہر جگہ سے ہزاروں لوگ سونے کی مقناطیسی کشش میں ڈوبے یہاں آن کر آباد ہوتے۔ آبادی میں یک لخت اضافہ ہوا۔ بحرالکاہل کا

Marfat.com

سمندر پار کرکے چینی تو اس قدر زیادہ آئے کہ آج کل ان کا علیحدہ چائنا ٹیلی فون ایکس چینج ہے۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت چائنا ٹاؤن بھی دیکھا جس میں جا کر یوں لگتا ہے جیسے چین میں پھر رہے ہوں۔ ویسے چائنا ٹاؤن نیویارک میں بھی ہے مگر وہ ہم نے نہیں دیکھا تھا۔

سان فرانسسکو میں جس طرف نکل جاؤ خوبصورت نظارے دم بخود کر دیتے ہیں۔ یہ شہر تین اطراف سے سمندر سے گھرا ہوا ہے۔ CABLE CARS کے ذریعے سفر اور بھی حیران کن اور خوشگوار ہوگا۔ مگر ہم بدقسمتی سے کر نہ سکے۔ کیبل کار ۱۸۷۳ء میں شروع ہوئی۔ ۱۹۷۳ء میں اس کا صد سالہ جشن منایا گیا۔ اس موقع پر کیبل کار کو پھولوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ ہم بہت دیر سے پہنچے یعنی صد سالہ جشن کے بھی دس سال بعد۔

دوپہر کا کھانا فش اینڈ چپس کی صورت میں کھایا کہ اُدھر تو سؤر کا خدشہ تھا، اِدھر سانپوں، چوہوں، مینڈکوں کا خطرہ تھا۔ چینی ریسٹورنٹ بے شمار تھے پر اِدھر تو ہم نے رخ بھی نہ کیا۔

پھرتے پھراتے شام ہو گئی۔ اب ہم کو معلوم نہ تھا کہ ہم کہاں ہیں اور ہمارا ہوٹل کدھر ہے۔ ویسے وہ ایئرپورٹ سائیڈ پر تھا۔ ٹیکسی لی اور خاصا موٹا تگڑا کرایہ دے کر واپس پہنچے۔ سوچا کل بس کا سفر کریں گے۔ کیونکہ ٹیکسی اپنی بساط سے باہر تھی۔ پھر جب سے سفر کے لئے نکلے ہیں کبھی کاروں میں، کبھی ٹیکسیوں میں پھر رہے ہیں۔ بس میں سفر کرنے کا الگ ہی لطف ہے کیونکہ اصل امریکیوں سے یہیں ملاقات ہوگی۔

Marfat.com

مچھیروں کی بستی (FISHERMAN WHARF)

۳۱۔ اگست ۱۹۸۳ء

آج صبح کا ناشتہ کرکے نکلے تو ہوٹل کے منیجر سے پوچھا ہمیں کون کون سی جگہ دیکھنی چاہیئے۔ مشہور زمانہ پل تو دیکھ چکے۔ اس کے علاوہ ہمیں علم نہیں کہ کون سی جگہ قابل دید ہے۔ کہنے لگا کہ FISHERMAN WHARF چلے جائیں جہاں ایک بحری جہاز میں سیر بھی کرائی جاتی ہے۔ سمندر کے کنارے تازہ سمندری خوراک بھی مہیا کی جاتی ہے۔ سلیم صاحب مچھلیوں کے ویسے بھی شوقین ہیں۔ کہنے لگے ہاں یہی ٹھیک ہے۔ اب اسی سے پوچھا کہ وہاں تک کوئی بس سروس ہے۔ اس نے سان فرانسسکو کا نقشہ نکال کر دیا۔ بس کا روٹ نمبر 7TH B بتایا جو فش اسٹریٹ لے جاتے گا۔ اب بچت کے سنہری اصول کے تحت بس کے ذریعے سفر کو نکلے۔ مجھے سیٹ ایک اپ ٹو ڈیٹ بوڑھی مگر خوبصورت عورت کے پاس ملی۔ لانگ بوٹ پہنے، چھاتا ہاتھ میں لئے، بال ڈائی کیئے ہوتے، شوخ لباس میں ملبوس تھی۔ وقت گذاری کی خاطر میں نے پوچھا کہ یہ بس ہمیں فشر مین وارف لے جاتے گی۔ کہنے لگی کہ میں آپ کو بتا دوں گی کہ کس سٹاپ پر اترنا ہے اور پھر کس نمبر بس پر چڑھنا ہے۔ پوچھنے لگی آپ کہاں سے آتے ہیں۔ میں نے بتایا کہ وہ اُدھر پرے میرے شوہر ہیں اور ہم دونوں پاکستان سے بغرض تفریح یہاں آتے ہیں۔ کہنے لگی انڈیا، پاکستان۔ اوہ میں اپنی جوانی میں کلکتہ، بمبئی اور دہلی گئی تھی۔ میں نے کہا اب آپ کون سی بوڑھی ہیں۔ بڑی خوش ہوتی۔ کہنے لگی کہ

Marfat.com

میرے ساتھ چلو۔ میں اکیلی رہتی ہوں۔ ایک لڑکا ہے جو شادی کر کے علیحدہ ہو گیا ہے۔ اب بنک جا رہی ہوں کہ کچھ رقم کی ضرورت تھی۔ کیونکہ آج بیوٹی پارلر جانا ہے۔ بال ڈائی کروانے تھے۔ ہر پندرہ دن کے بعد میرا ایک پورا دن بیوٹی پارلر میں گزرتا ہے۔ فیشل بھی لیتی ہوں۔ میں نے کہا توبہ استغفار۔ وہ سمجھی تعریف کی ہے۔ اور کچھ بتانے لگی کہ میں اپنا پورا خیال رکھتی ہوں۔ فرٹا کا بیوٹی کا جنتی کہ اپنا چشمہ بنوانے ہانگ کانگ جاتی ہوں۔ میں نے اب اپنی توجہ باہر کی طرف کر لی۔ بس میں سفر کرنے والی شخصیتیں اتنی امیر ہیں تو کاروں میں سفر کرنے والے امریکی کیسے ہونگے، سڑک نیچے ہی نیچے کی طرف جا رہی تھی۔ اصل میں ہم لوگ سمندر کی طرف جا رہے تھے۔ اتنے میں ہمارا امبش سٹریٹ کا اسٹاپ آگیا۔ اس نے اگلی بس کا نمبر ۱۹ بتایا۔ جلدی سے اترے۔ باہر سنہری دھوپ پھیلی ہوتی تھی۔ تھوڑے سے فاصلے پر کیلی فورنیا کی پولیس کے دو نمائندے گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کر کے آتے جاتے لوگوں کو تاک رہے تھے۔ "CHIPS" کی فلم میں ان کی کارکردگی خوب دکھائی گئی ہے۔ علی اسد یہ فلم بہت انجوائے کرتے تھے۔ اب ان کو دیکھتے تو خوش ہوتے۔ بچوں کی یاد نے پھر اداس کر دیا۔ اب تو سفر میں بھی کم ہی دل لگتا تھا۔ مگر اسی خیال سے کہ شاید پھر آنا نصیب ہو یا نہ ہو، زبردستی دیکھے جا رہے تھے۔ جانے لوگ کیسے اپنے وطن سے باہر رہ لیتے ہیں۔ مجھ سے تو شاید کبھی بھی نہ رہا جاتے۔ ہم ویسے جس سے بھی ملے ہیں اس نے یہ خواہش کی کہ دل چاہتا ہے اپنے ملک میں مستقل رہائش رکھیں مگر حالات اجازت نہیں دیتے۔ وہ لوگ نماز روزہ کے بھی ہم سے زیادہ پابند

نظر آتے. لیکن ان کی بچیاں بیچاری کمپلکس کا شکار نہیں. گھروں میں ان پر اس قدر پابندی کہ صبح بیڈروم سے نکلتی ہیں تو دوپٹہ لپیٹ کر اوڑھا ہوا کہ ایک بال بھی نظر نہ آئے. سکولوں میں مخلوط تعلیم حاصل کرتی ہیں بلکہ ان لوگوں کو آزادی کی شرعی حدود بھی پھلانگتے دیکھتی ہیں تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ صحیح طرز زندگی کیا ہے. خاموش تنہائی پسند دبی دبی سی لڑکیاں، ان میں زندگی کی حرارت مفقود تھی. شاید سکول میں ہم اپنی عمر لڑکیوں سے گپیں لڑاتی ہوں مگر گھر میں تو خاموش بت بنی بیٹھی رہتی ہیں. ایک تو زبان کا بھی مسئلہ ہے. وہاں تمام بچے انگریزی لب ولہجہ میں آپس میں گفتگو کرتے ہیں جو ہم جیسے پڑھے لکھوں کے لئے بھی سمجھنا کار دارد ہے جب کہ ان کی ماؤں کی اکثریت انگریزی سے نابلد ہے جو انگریزی کا استعمال صرف اس حد تک کرتی ہے کہ "ایپل کھا لو" "ونڈو کھول دو" "تمہارا ڈیڈی آنے والا ہے" "ڈور شٹ کر دو" وغیرہ وغیرہ. یہ بات چیت بھی ٹھیٹھ پوٹھواری پنجابی میں ہوتی ہے جو ان بچوں کے منہ سے عجیب لگتی ہے جب وہ ماں کو کسی بات کا جواب دیتے ہیں. "میں تنہا نو آکھیا سی میرے کپڑے پریس کر دیو" ان کا لہجہ عجیب ہوتا ہے. بات کرتے کرتے رک جاتے ہیں کیونکہ الفاظ کی کمی کا شکار ہوتے ہیں. ان کو دیکھ کر ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی. اس نسل بیچاری کا کیا بنے گا؟ آدھا تیتر آدھا بیٹر، نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے صنم. ماں باپ کی خواہش کہ بچیاں پاکستان میں بیاہی جاتیں جب کہ وہ ہمارے ماحول سے قطعی ناآشنا یہاں تو اردو بولنے والی لڑکی پنجابیوں میں

Marfat.com

چلی جاتے تو اس کی باتوں پہ ہنسا جاتا ہے. بہرحال خدا سبھوں کی بہتری کرے۔ بڑا دکھ ہوتا ہے۔ ان والدین کا سب سے بڑا مسئلہ بچیاں ہیں جو پڑھتی، لکھتی اور جوان تو اس ماحول میں ہوتی ہیں مگر بیاہی جاتیں گی پاکستان میں۔

لیجئے بات کہاں سے کہاں سے نکل گئی۔ بہرحال اب ۱۹ نمبر بس پکڑی اور SEAMAN WHARF پہنچے۔ وہاں سمندر کے کنارے چھوٹی بڑی کشتیوں کی قطار بندھی تھی ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ سڑکوں پر کیفے، سوونیئر شاپس، ہوٹل اور ریسٹورنٹ تھے کچھ دکانوں میں جھانک کر دیکھا۔ اِدھر اُدھر گھومے پھرے۔ سامنے ہی جزیرہ ALCATRAZ نظر آرہا تھا جو ۱۲ ایکڑ پر محیط سینۂ سمندر سے نکلی ہوئی ایک خوبصورت چٹان ہے۔ یہ جزیرہ تو سرکاری اور ملٹری استعمال میں تھا مگر اب سیاحوں کے لئے کھول دیا گیا کہ آؤ اور دیکھو سان فرانسسکو کا گولڈن گیٹ برج بھی سامنے ہی نظر آرہا تھا۔ سلیم صاحب کو بھوک لگی تو ایک کیفے میں جا کر دہی، فش اور چپس لیئے۔ دیسی کھانا نہ ملنے پر سلیم بور ہو رہے تھے۔ مچھلی سے رغبت نہ ہوتی تو اور بھی بُرا ہوتا۔

اب دوبارہ بس سٹاپ پر آگئے۔ وہیں سان فرانسسکو کی ایک اور بڑھیا ملی خوب پھیلے ہوئے جسم کے ساتھ بنچ پر بیٹھی بس کا انتظار کر رہی تھی ہم نے اس سے بس نمبر کا پوچھا جو ہمارے ہوٹل تک جاتی گی۔ کہنے لگی آپ فکر نہ کریں میں اپنی بس میں کر دوں گی مگر آپ کو صحیح بس پر چڑھا دوں گی۔ اب باتیں شروع ہوگئیں۔ کہنے لگی آپ انڈیا سے آئی ہیں؟ میں نے کہا "نہیں! پاکستان سے" شرمندہ سے ہوگئی۔ کہنے لگی مجھے افسوس

Marfat.com

ہے آپ کو انڈین کہا۔ مجھے یوں نہیں کہنا چاہیئے تھا کہ آپ انڈیا سے آئی ہیں بلکہ یوں پوچھنا چاہیئے تھا کہ آپ کہاں سے آئی ہیں؟" لیجئے یہ بوڑھی بھی ہمارے حساس تعلقات کے بارے میں اچھی خاصی باخبر ہے۔ اسی کی مہربانی سے صبح بس پکڑی اور شام کو تھکے ہارے ہوٹل پہنچے۔ سوچا کہ بس اب بہت ہو چکا۔ سان فرانسسکو! پھر کبھی زندگی رہی تو ملیں گے۔ سلیم صاحب بھی گھبرا گئے تھے۔ اپنا پروگرام نکالا، ہوائی اور لاس اینجلز کو بھی کاٹ دیا۔ چونکہ یہاں سے سیدھی فلائٹ روزانہ ہانگ کانگ جاتی ہے، اس لئے سوچا کہ اسی سے کل سیٹ بک کروا کر اڑن چھو ہو جائیں گے۔ امریکہ سے اپنے مشرقی ممالک کی سمت میں تو تھر درویش برجان درویش اِن ملکوں جگہوں پر چلی ہی جاتی مگر سلیم صاحب کے بار بار کے کہنے سے آمنّا صدقنا کہا اور پاکستان کے لئے کال بک کروائی۔ اُن سے بات ہوئی۔ وہاں صبح کا وقت تھا، یہاں رات، بچوں سے باتیں کر کے ہم دونوں کا موڈ بھی خوشگوار ہو گیا۔ ان کو جب یہ نوید سنائی کہ ہم ۲ ستمبر کو تمہارے پاس پہنچ رہے ہیں تو وہ بھی بے حد خوش ہوئے امی اور بہنیں بھی بڑی خوش ہوئیں اور اپنا تو یہ حال کہ ؎

غربت کی دھوپ تیز بہت تیز ہی سہی
لیکن ہمارے ساتھ بھی یادوں کے سائے ہیں

Marfat.com

ہانگ کانگ : خوشبودار بندرگاہ

یکم ، ۲ ستمبر ۱۹۸۳ء

آج ہماری ہانگ کانگ کے لئے روانگی تھی۔ رات ہوٹل والوں کو کہہ دیا کہ صبح ہمیں گاڑی ائیرپورٹ چھوڑ آئے۔ چنانچہ ناشتہ کرنے کے بعد سان فرانسسکو کے ہوائی اڈے پہنچے۔ اب تو یہ ائیرپورٹ اپنا دوسرا گھر لگ رہا ہے۔ اچھی خاصی واقفیت ہو گئی ہے۔ PAN AM کے کاؤنٹر پہ پہنچے کہ آج کی فلائٹ سے ہمیں دو سیٹیں چاہئیں۔ اسی وقت بکنگ کارڈ مل گئے۔ اب ۲½ بجے تک یہیں گھوم پھر کر وقت گزارنا تھا۔ اس وقت گیارہ بجے تھے۔ یعنی تین ساڑھے تین گھنٹے پہلے پہنچ گئے۔ آس پاس زیادہ تر لوگ چائینز، کورین یا جاپانی ہی نظر آئے۔ کل بس کا سفر کرتے وقت جس روٹ سے ہم گزرے تھے وہاں انہی لوگوں کی دکانیں تھیں۔ اب ائیرپورٹ پر بھی زیادہ کاریدار یہی نظر آئے۔ سنا تھا کہ سان فرانسسکو میں سکھوں کی بھی کافی تعداد ہے۔ مگر سوائے ایک سکھ کے جو ہانگ کانگ جا رہا تھا، ہمیں تو کوئی سکھ نہیں ملا۔ میں تو اِدھر اُدھر پھرتی رہی۔ سلیم صاحب اس سے گپ شپ لگاتے رہے۔ دونوں گاؤں کی کھلی فضا، لسی اور ساگ کا ذکر کرتے اور قہقہے لگاتے۔ وہ کہنے لگا۔ "او جی ہندو تے

Marfat.com

بڑا بنیا اے، اساں نساں تے بہادر قوماں آں" یہ سکھ ہانگ کانگ
میں کام کرتا تھا۔ لیکن بچے سارے امریکہ میں آباد تھے۔ بلکہ سبھی گرین کارڈ ہولڈرز
ایک لڑکی تو کولوریڈو میں بیاہی گئی تھی۔ اس کے پاس سے ہو کر آرہا تھا۔
کہہ رہا تھا "میں اور میری بیوی پنجابی جانتے ہیں۔ بچے بس جاپانیز زبان جانتے
ہیں یا انگریزی"۔ پھر کہنے لگا کہ ہندو بڑی چالاک قوم ہے۔ کبھی کاٹھ کا
الّو بنا کر مسلمان کو صدر نشین کر دیتی ہے، کبھی سکھ کو۔ آج کل ہمارا صدر
بھی یہی کچھ بنا ہوا ہے۔ ان دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر میں ڈیوٹی فری
شاپ میں آ گئی۔ اگرچہ وہاں اکانومی کلاس کے مسافروں کا داخلہ ممنوع
تھا، مگر مجھ پر انہوں نے مہربانی کی جس کے جواب میں، میں نے ان پر
مہربانی کرتے ہوئے اپنے ٹریولرز چیک کا فی استعمال کر لئے۔ لپ اسٹک،
میک اپ کا سامان، کولون اور خوشبوئیں دل کھول کر خریدیں، اب جبکہ
چار پانچ دن بعد پاکستان واپس پہنچ جانا ہے تو رقم سنبھال کر کیا کریں۔
اس وقت میرا حال اس عورت جیسا تھا جس نے دکاندار کو ۱۰۰ ڈالر
پکڑاتے ہوئے کہا کہ اس میں میری پسندیدہ اشیاء دے دو جب
مطلوبہ چیزوں کی قیمت سو ڈالر تک آن پہنچی تو سامان پکڑتے ہوئے
اس نے دکاندار سے کہا کہ اب مجھے ایک پینی واپس دے دو۔ دکاندار
بڑا حیران ہوا تو وہ کہنے لگی آج میرے خاوند نے مجھے سو ڈالر دیتے وقت
کہا تھا کہ ان کو ایک بار ہی خرچ کر دینا۔ اب گھر جا کر میں سچائی سے
کہہ سکوں گی کہ میں نے تمام رقم خرچ نہیں کی ہے۔ اسے یہ جاننے
کی ضرورت نہیں کہ میں تمام رقم خرچ کرنے کے کتنی نزدیک آن پہنچی ہوں۔

Marfat.com

میرے ٹریولر چیک بھی بس تمام خرچ ہونے کے نزدیک آگئے تھے۔ ڈیوٹی فری شاپ والوں نے کہا کہ سامان یہیں رہے گا آپ کو جہاز میں داخلے کے وقت ملے گا یہ جٹ سے جاتے تھے۔ چٹ سے کر ٹھنڈے سے باہر نکل آتی۔ لیکن اس چیز کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ میں سلیم صاحب کی انکواری سے بھی بچ نکلی۔ یہ احتیاط شاید ان لوگوں نے اس لئے کی ہے کہ کہیں مسافر اپنا سامان خرید کر باہر اسمگل نہ کر دیں۔ حالانکہ سامان اتنا مہنگا تھا کہ خریدنا ہی حماقت تھی۔ ایک ایک لپ اسٹک اور نیل پالش ۱۰۰، ۱۰۰ روپے کی تھی۔ پرفیومز تو بہر حال ہر جگہ مہنگی ہی ہوتی ہیں۔

اب فلائٹ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ آج ہمیں بحرالکاہل عبور کرنا تھا دنیا کا وسیع ترین، طویل ترین سمندر۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ بحرالکاہل کے ارد گرد کے ساحلوں کے لوگ کاہل ہی ہوں گے، بلکہ پڑھا بھی تھا کہ جتنی تجارت بحراوقیانوس کے ارد گرد کے ساحلی علاقوں میں ہوتی ہے وہ یہاں نہیں ہوتی۔ وہاں تجارتی راستے بھی زیادہ ہیں اور آمد و رفت کے آسان ذرائع بھی ہیں۔ یہاں ایک تو شمالی اور جنوبی امریکہ میں مغربی ساحلوں پر پہاڑوں کے وسیع سلسلے ہیں۔ کوہ راکیز اور کوہ ایڈنبر جو سدِ راہ ہیں۔ دوسرے اتنا بڑا سمندر جسکے ایک طرف مغربی تہذیب تو دوسری طرف مشرقی۔ پرانے زمانے میں ایک محاورہ ہوا کرتا تھا "مشرق اور مغرب کبھی نہیں مل سکتے"، مگر جناب PAN AM کا دیوزاد طیارہ تو روزانہ لدا لدا کر جاتا ہے اور مشرق کو مغرب سے ملاتا ہے۔ ابھی یہ فلائٹ نان سٹاپ تھی۔ مسلسل ۱۳½ گھنٹے سمندر پر سفر تھا۔ اسی دوران ہمیں DATE LINE

Marfat.com

بھی عبور کرنی تھی جس میں ہمارا ایک دن گم ہو جاتا تھا۔ دن کی گمشدگی کا تو ہمیں ہانگ کانگ جا کر پتہ چلا۔ سورج کے ساتھ ساتھ سفر کرتے کرتے ہم وہاں شام کے ۵ بجے پہنچے جب کہ اس وقت سان فرانسسکو میں اسی دن کی صبح کے ۴ بجے تھے۔ ساڑھے تیرہ گھنٹے کی فلائٹ نے کمر توڑ ڈالی۔ ہم دونوں تو خیر عمر رسیدہ تھے۔ سوتے جاگتے، کھاتے پیتے، پڑھتے وقت گزار دیا مگر بچوں والوں کے لئے سخت مصیبت تھی۔ وہ والدین کو بار بار تنگ کرتے۔ بار بار ایئر ہوسٹس کچھ نہ کچھ کھانے یا کھیلنے کے لئے لاتی رہی۔ کھڑکی سے سارا راستہ بس جہاز کا WING ہی نظر آتا رہا۔ ورنہ اوپر نیچے بادل۔ سان فرانسسکو کا شہر گزرتے ہی جو بادلوں کا سلسلہ شروع ہوا تو رات ہونے تک کچھ نظر نہ آیا۔ اب سلیم صاحب بھی گھبرا رہے تھے کہ کیا ضرورت تھی ہوائی کاٹنے کی۔ کم از کم وہاں آدھے سفر کے بعد سٹاپ تو کر لیتے۔ باہر ایک سا ماحول تھا۔ نہ پتہ زمین کا، نہ آسمان کا۔ علم ہے

بجلیاں روپوش طوفان دم بخود صحرا خاموش

جا رہے ہیں کس طرف اے لغزش مستانہ ہم

فضا میں لٹکے ہوتے جانے جہاز چل بھی رہا تھا یا نہیں۔ لگتا تھا سا کت و جامد ہے۔ بس اندر ہل چل تھی۔ راستے میں ایک دفعہ جہاز کے ڈولنے پر BELTS باندھنے کو کہا گیا۔ سلیم صاحب نے درود شریف پڑھنا شروع کر دیا۔ جھنجلا جھنجلا کر کہیں کہ اتنا لمبا سفر کیوں کر رہے ہیں۔ کہیں STOPPAGE کیوں نہیں لے لیتے۔ مگر چند منٹوں بعد ہی ماحول ٹھیک ہو گیا۔ سب ہی مسافروں میں قلفیاں تقسیم کی گئیں پھر وہی کھانے

Marfat.com

پینے کا سلسلہ چل نکلا۔ خدا خدا کرکے ہانگ کانگ آیا۔ ہانگ کانگ کے آنے سے کافی پہلے ہی روشنیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ شاید کچھ روشن جزیرے تھے جہاں جگمگاتی سڑکوں، رنگ و نور میں نہاتی عمارتوں اور سانپ کی طرح بل کھاتی شاہراہوں پر گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ بڑا خوبصورت منظر تھا۔ پھر ہانگ کانگ کا ہوائی اڈہ آ گیا۔ رات کے وقت روشنیوں سے جگمگاتا پورا ایئرپورٹ جھلملاتا ہوا شادی گھر لگ رہا تھا۔ سامنے سمندر میں بحری جہاز بھی نظر آیا۔ جہاز اور ایئرپورٹ کی بتیاں سمندر کے پانی میں منعکس ہو کر ستاروں بھرے کالے دوپٹے کا منظر پیش کر رہی تھیں۔

ایئرپورٹ پر اتر کر انفارمیشن سنٹر پہنچے اور FORTUNA ہوٹل کا انتخاب کر کے ٹیکسی پکڑی۔ باہر بڑی چہل پہل تھی۔ فارچونا ہوٹل نتھان روڈ پر واقع ہے جو ہانگ کانگ کی شہ رگ ہے۔ اتنی بارونق ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ رات ہو یا دن یہاں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ہر وقت لوگ پیدل آ جا رہے ہیں، بسیں چل رہی ہیں، گاڑیاں دوڑ رہی ہیں۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ رات کو اتنا محسوس نہ ہوا کیونکہ ہوٹل پہنچتے ہی پڑ کر سو گئے۔ ہمارا کمرہ چھٹی منزل پر تھا۔ صبح اٹھی تو میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور لرز کر رہ گئی۔ لوگ تو ۱۰۲ منزل تک جا چکے ہیں۔ مگر مجھے تو چھٹی منزل پر ہی ڈر لگ رہا ہے۔ سلیم صاحب نے فوراً نیچے جا کر مینجر سے کہا کہ میں بلندی پر نہیں رہ سکتا۔ مجھے کسی نچلی منزل پر کمرہ دیا جائے، جو تھوڑے

Marfat.com

سے انتظار کے بعد مل گیا۔ کمرہ ملنے پر شکریہ ادا کیا۔ اب پھر کال بک کروائی ہم دونوں نے بچوں سے بات کی اور کہا تم لوگوں کو علم نہیں مگر ہم نے ایک دن اور کم کر لیا ہے۔ بہر حال آپ لوگوں کے پاس تو ۶ ستمبر کو ہی پہنچیں گے۔ مگر ہماری ایک دن کی کوفت کم ہو گئی۔ زندگی میں ایک دن یوں گزر گیا جیسے گزرا ہی نہیں، ویسے تو بے شمار بے مصرف دن گزرے ہیں، مگر اس کے بے مصرف گزرنے پر خوشی ہوئی کہ بچوں سے ایک دن کی اور نزدیکی ہوئی۔ آج کل تو میرا یہ حال ہے سے

میں مسافر ہوں مگر ہوتا ہے یوں کچھ ان دنوں
بیٹھ رہتا ہوں میں، اکثر اپنا بستر باندھ کر!

دیارِ مصر سے نگری دولت کی

۳ ستمبر ۱۹۸۳ء

آج سلیم صاحب ہوٹل کا کارڈ جیب میں ڈال کر کسی پاکستانی ہوٹل کا پتہ کرنے صبح ہی نکل گئے۔ میں ڈرتی رہی کہ نیا ملک، نئی گزرگاہیں، کہیں راستہ ہی نہ بھول جائیں۔ مگر خداوندکریم کی مہربانی سے ان کو نہ صرف پاکستانی ہوٹل مل گیا بلکہ ہوٹل والے واقف نکلے۔ انہوں نے میرے لئے بھی ان کے ہاتھ تھرماس میں کڑک چائے بھیجی۔

گیارہ بجے تیار ہو کر باہر نکلے تو رونق اپنے عروج پر تھی۔ ہانگ کانگ اصل میں جزیرہ ہے اور کچھ علاقوں پر مشتمل ہے۔ جس طرف ہمارا ہوٹل تھا وہ کولون کہلاتا ہے اور جس طرف بڑے بڑے شاپنگ

Marfat.com

سنٹرز، سکولز اور ہوٹلز ہیں وہ ہانگ کانگ کہلاتا ہے۔ ہانگ کانگ میں بڑی مہنگائی ہے۔ چیزیں تو بس ایسی ہی ہیں جیسے ہمارے ہاں ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں گھڑی ہے جو وقت بتاتی ہے اور اس کی قیمت تین چار سو ہے۔ وہاں بھی گھڑی ہی ہوتی ہے اور وقت بھی بتاتی ہے مگر تین چار ہزار سے کم کیا ہوگی۔ ایک ایک کاٹن کی قمیض پر ایک ہزار ڈالر قیمت لکھی دیکھی میں نے چھو کر دیکھا شاید کرنٹ مارتی ہو کیونکہ زبانِ حال سے تو وہ کہہ رہی تھی ؎

بجلی بھری ہے میرے انگ انگ میں
جو بھی چھوئے گا جل جائے گا

مگر کچھ بھی نہ ہوا سمجھ نہ آیا کہ اس کاٹن میں کیا کمال ہے۔ رنگت بھی عام سی میٹریل بھی دیکھا بھالا۔ مگر قیمت کا تھا رنگ نرالا۔ واقعی وہاں دولت کی حکمرانی تھی ؎

دیارِ مصر میں دیکھا ہے ہم نے دولت کو
ستم ظریف پیغمبر خرید لیتی ہے

یہاں پیغمبروں کی خرید و فروخت تو نہیں ہو رہی تھی مگر یہ بھی دیارِ مصر سے کم نہیں تھا۔ دنیا جہاں کے چیدہ مال برائے فروخت موجود تھے اور خوب مہنگے داموں بک رہے تھے۔ LAND MARK، پرنس بلڈنگ یا SWISS HOUSE ARCADE جدھر بھی چلے جاؤ قیمتی سے قیمتی اشیاء موجود ہیں۔ دولت مندوں کی انا کا مسئلہ بنی ہوئیں کہ ہمت ہے تو خرید لو ورنہ ہم جیسوں لوگوں کی طرح گھوم پھر کر باہر نکل جاؤ۔ جیولری کی بھی بڑی بڑی دکانیں تھیں۔ زیور اتنا خوشنما،

Marfat.com

جیولرز اتنے چمکدار کہ حیرت سے انگلی کاٹ لی جائے تو خبر نہ ہو، مگر قیمتیں سُن کر دماغ الٹ جاتا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنی قیمت میں تو ہمارے ہاں اچھا بھلا مکان بن جاتا ہے جتنی قیمت کا ایک ایک سیٹ تھا۔ کوئی چھ لاکھ، کوئی سات لاکھ، واللہ علم ہم پاگل تھے یا وہ۔ مت پوچھئے کہ کیسی کیسی چیزیں دیکھیں۔ گھڑیاں دیکھیں جن کی CHAINS رنگ برنگ کے ریئل سٹونز سے جڑاؤ کی گئی۔ بعض پر سو ڈیڑھ سو ہیرا لگا ہوا۔ ہم نے پاکستان میں دس پانچ ہیرے بھی اپنی استطاعت سے پرے دیکھے تھے۔ دو تین ہیرے کی انگوٹھیاں پہننے والی عورتیں بھی بڑی سرمایہ دار سمجھی جاتی ہیں۔ وہاں اہلِ ثروت کے لئے ایک سے ایک بڑا چیلنج تھا کہ ہم نے اپنی قیمت بتا دی ہے۔ ہمت ہے تو ہاتھ بڑھاؤ۔ ہم دولت کی حشر سامانیوں کے پہلے ہی قائل تھے۔ مگر اب تو بندۂ بے دام ہاتھ باندھے غلام ہو گئے۔

بات ہو رہی تھی کولون اور ہانگ کانگ کی۔ کولون میں اسلامی مسجد، ہوائی اڈہ، ناتھان روڈ اور سب سے بڑھ کر ہمارا ہوٹل تھا—— ہانگ کانگ کا حال تو آپ کو بتا دیا۔ ویسے یہ پہاڑی علاقہ ہے جب کہ کولون میدانی ہے۔ کولون میں ایک بلڈنگ "چونگ بلڈنگ" ہے جہاں کے تقریباً سارے ہوٹل پاکستانیوں کے ہیں۔ دکانوں کے مالک بھی یہی لوگ ہیں۔ سلیم صاحب صبح کے وقت وہیں سے چائے لاتے تھے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے وہیں کھایا۔ بڑا مزہ آیا۔ سلیم صاحب بھی بس اب مزے میں ہیں۔ دیسی ہانڈی، تنوری روٹی، صبح کے وقت یہاں حلوہ پوری، آلو

Marfat.com

چھوٹے بھی مل جاتے ہیں۔ فارچونا ہوٹل میں ہم نے صرف پڑاؤ کیا، ناشتہ سے لے کر رات کا کھانا تک وہیں کھاتے تھے۔ وہاں تک جانے کے لئے کبھی تو ہوٹل سے پیدل چل پڑتے۔ راستہ میں تانکا جھانکی کرتے کبھی بس کے ذریعے جاتے۔ ایک بات مجھے بے حد عجیب لگی۔ بس ڈرائیور نہ ٹکٹ دیتا نہ رقم وصول کرتا۔ ڈرائیور کی سیٹ کے ساتھ ایک ڈبہ پڑا ہوتا ہے۔ ہر مسافر داخلے کے وقت اس میں چند سکے ڈال دیتا اور بس، نہ ڈرائیور گنتا نہ دیکھتا کہ کیا ڈالا ہے۔ میرا یہ حال تھا کہ اگر چینج ہوا تو ڈال دیا اگر نہ ہوا تو ایک ڈالر ڈال دیتی۔ سلیم صاحب کا دل چاہتا تو ڈال دیتے ورنہ سامنے ہی سیٹ پر ڈٹ جاتے کہ کر لو جو کرنا ہے۔ میرا کرایہ تو روزانہ بدلتا رہتا۔ کبھی چند سکے کبھی ڈالر، حالانکہ منزل ہمیشہ ایک ہی ہوتی۔

۴ ستمبر ۱۹۸۳ء

آج سوچا کہ اب پرسوں کراچی چلے جانا ہے تو کچھ خریداری کر لیں بچوں کی جو فرمائشیں رہ گئی ہیں وہ پوری کر دیں۔ آخر یہ ساری بندرگاہ ڈیوٹی فری ہے۔ آج کل تو برٹش کے زیرِ اثر ہے مگر جلد ہی چین اسے قبضے میں کرنے والا ہے۔ یہاں چارلس اور ڈیانا کی تصویریں بھی دکانوں میں لگی دیکھیں۔ برطانیہ نے یہ بندرگاہ سو سالہ لیز پر حاصل کی ہے جو ۲۰۰۰ء میں ختم ہونے والا ہے۔ ویسے بھی یہاں ۹۸ فیصد آبادی چینیوں کی ہے۔ زمین بھی اُن کی لوگ بھی وہیں کے مگر انگریز

Marfat.com

کی چالاکی دیکھو کہاں سے حکومت کرنے آیا ہے۔

ہوٹل سے نکلے تو راستہ بھول گئے۔ ویسے تو خیر راستہ بھولنے والی بات نہیں۔ ایک ہی لمبی سی ناتھان روڈ ہے جو سیدھی ہمارے ہوٹل سے فیری تک لے جاتی ہے جس سے سمندر جو کولون اور ہانگ کانگ کے درمیان ہے، پار کر کے آگے نکل جاتے ہیں۔ مگر ہم تو چونگ بلڈنگ بھولے تھے۔ وہ آگے تھی یا پیچھے رہ گئی، پتہ ہی نہیں چلا، سڑک کے کنارے ایک آدمی کو روک کر سلیم نے راستہ پوچھا تو وہ کہنے لگا "پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ راجہ سلیم تو نہیں"۔ جب سلیم صاحب نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بھینچ بھینچ کر گلے ملا ــــ کہ میں اور آپ کیمبل پور میں اکٹھے پڑھے ہیں۔ چلئے میرے ساتھ اور روزانہ کھانا میرے حساب میں کھایا کیجئے۔ سلیم لاکھ معذرت کریں مگر وہ کہاں چھوڑنے والا تھا۔ پھر ایسی شہرہ آفاق شخصیت بار بار تو ہاتھ آتی نہیں اس لئے وہ ہمیں چونگ کنگ بلڈنگ لے گیا۔ حلوہ پوری سے ناشتہ کروایا۔ ہوٹل والے سے کہا کہ ان سے کوئی رقم چارج نہیں کرنی۔ جو مانگیں وہ کھلانا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ سلیم صاحب نے کہا کہ میں آج یہاں ہوں کل پرسوں چلا جاؤں گا۔ مگر وہ یہ کہے کہ دو دن میں آپ نے دیکھا کیا۔ ابھی اور ٹھہریں۔ ہم نے اپنی مجبوری بتائی اور جان چھڑائی۔

STAR FERRY

ہانگ کانگ جانے کے لئے پہلے کولون سے سٹار فیری لینی پڑتی تھی۔

Marfat.com

فیری تک پہنچنے کے لئے ایک مقررہ رقم کے سکے ڈالنے پڑتے تھے، پھر راستہ کھلتا تھا۔ سلیم صاحب نے اپنے ۸۰ سنٹ کے سکے ڈالے اور آگے نکل گئے۔ میں نے ڈالے، میرے کم ہوگئے۔ راستہ بند رہا۔ اب سلیم اُدھر اور میں اِدھر، نہ ان کے پاس چینج نہ میرے پاس۔ تقریباً تمام ممالک میں کرنسی کے سکے بڑے اہم ہیں۔ فون کرنا ہے، ہائی وے سے گزرنا ہو، پونڈ یا ڈالر کی اتنی قدر نہیں جتنی سکوں کی ہے۔ آخر ایک انگریز نے میری پریشانی کو محسوس کیا اور میرے سکے ڈالے۔ راستہ کھلا اور دوسری طرف پہنچی اسے ڈالر دینا چاہا، مگر وہ NO, THANK YOU کر کے آگے بڑھ گیا۔ مشرقی ممالک میں بھی انگریز کا مرہونِ منت ہونا پڑا۔

اب ہم دونوں بے شمار دوسرے لوگوں کے ساتھ فیری میں بیٹھے اور ہانگ کانگ روانہ ہوتے۔ سبھی لوگ اتر گئے۔ ہم دونوں وہیں بیٹھے رہے، اور لوگ آگئے اور فیری دوبارہ کولون کی طرف چل نکلی۔ تمام لوگ اتر گئے مگر ہم بیٹھے رہے۔ پھر ہانگ کانگ آگیا۔ یوں پانچ چکر لگانے کے بعد ہانگ کانگ کی سائیڈ پر اترے۔

سلیم صاحب یونہی سیر کرنے کے لئے اور دیکھنے دکھانے کے لئے مجھے لے کر MANDARIN HOTEL پہنچے۔ دیواروں پر پیتل تلینے کے خوبصورت نقش، جگمگاتے فانوس اور چمکتے شینڈلیر، دیدہ زیب سینک بار، آرام دہ نشستیں، خوابناک ماحول، غرضیکہ جیب بھاری ہو تو دنیا کو جنت میں تبدیل ہوتے دیر نہیں لگتی۔

PAN AM کے دفتر گئے اور سیٹ بک کروائی، ہم سیدھے

کراچی پہنچنا چاہتے تھے مگر انہوں نے کہا کراچی ڈائریکٹ فلائٹ نہیں ہے۔ بینکاک کے راستے جاتے یا بمبئی تک۔ چنانچہ بنکاک ہی طے ہوا۔ گرمی یہاں بھی بے حد تھی۔ بہرحال گرمی تو سارے سفر میں ہمارا مقدر بنی ہوتی تھی۔ بھلا مقدر سے کیسے مفر ہے ؎

ستم دیکھتے ہیں کرم دیکھتے ہیں
جو قسمت دکھاتی ہے ہم دیکھتے ہیں

جس صبح لندن سے چلے تو دھند ہی دھند تھی۔ کشور کہنے لگی کہ بس دھند اور پھر برفباری۔ سردی شروع ہونے والی ہے۔ وہاں سے چلے نیوجرسی پہنچے۔ چلتے سمے وہاں بھی صبح کو دھند تھی۔ عذرا کہنے لگی کہ بس باجی اب سردی شروع ہو رہی ہے۔ سارا میدان، سڑک برف سے ڈھک جائے گی۔ مگر اپنے لئے تو گرمی ہمیشہ ہم سفر رہی۔

ہانگ کانگ کی آبادی دبلے پتلے چھوٹے قد کے چینیوں پر مشتمل ہے۔ لیکن کام کے لحاظ سے یہ لوگ دیو زاد ہیں۔ موٹا آدمی تو نظر ہی نہیں آتا۔ شاید SEA FOOD کے بے تحاشا استعمال کی وجہ سے یا ویسے ہی کام کی زیادتی کی وجہ سے چربی نہیں چڑھتی۔ ہماری آنکھیں تو موٹا آدمی دیکھنے کو ترس گئیں۔ شکر ہے ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ لیتے اور تسلی ہو جاتی تھی کہ دنیا میں ابھی موٹاپا موجود ہے۔ یہاں چونکہ سلیم صاحب کو دیسی کھانا ملنے کی پرابلم نہ تھی اس لئے خوب دل لگا ہوا تھا۔ چونگ کنگ بلڈنگ میں لاہور فاسٹ فوڈ، کشمیر فاسٹ فوڈ کی دکانوں پر ہندو مسلم کو اکٹھے بیٹھے کھانا کھاتے دیکھا۔ بالکل متحدہ

Marfat.com

ہندوستان کا سماں تھا۔ البتہ کشمیر فاسٹ فوڈ پہ تلاوتِ قرآن ہوتی رہتی تھی۔

بازار میں پھرتے پھراتے بچوں کی VIDEO GAMES لیں آج کل انہی کا زور ہے۔ دکاندار بھی فارغ اوقات میں یہ گیمز کھیل رہے ہوتے ہیں۔ کونوں میں کافی دکانیں ہندوؤں سکھوں اور مسلمانوں کی بھی ہیں۔ ساڑھیاں دوپٹے اکثر پھرتے اور شاپنگ کرتے نظر آتے۔ اس نگری میں انسان بور نہیں ہو سکتا۔ تنہائی اور اجنبیت بھی محسوس نہیں ہوتی جو غریب الدیاری کی پہلی خصوصیت ہے۔

شاپنگ سے فارغ ہوتے تو سمندر کنارے جا بیٹھے۔ YMCA کی خوبصورت عمارت سمندر کے رخ بنی ہوئی تھی۔ اندر گئے تو اپنے دو پاکستانی بھائی مل گئے۔ ایک کراچی کے اور دوسرے لاہور کے نکلے۔ کہنے لگے آپ کیوں ہوٹل میں ٹھہرے ہیں صرف YMCA کا کارڈ بنوا لیں دنیا کے تمام ملکوں میں ان کی عمارتیں ہیں بہت کم قیمت پر رہائش مل جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے غور نہیں کیا کہ ہم دونوں کسی طور بھی نوجوانوں میں شمار نہیں۔ کہنے لگے سب چلتا ہے۔ وہاں سے نکلے۔ رات ہو چکی تھی۔ ایک عمارت کے باہر بڑا خوبصورت فوارہ چل رہا تھا۔ بجلی کی رنگین روشنیوں کی SETTING اس طریق سے کی گئی تھی کہ آدھ گھنٹہ بیٹھنے کے باوجود اس کا ہر نمونہ پہلے سے مختلف تھا اور بتیاں بھی علیحدہ ہی طریق سے چمکیں۔ غرضیکہ ہر چیز میں ان کو کمال حاصل ہے۔

Marfat.com

بنکاک

THE CITY OF ANGELS

۵ستمبر ۱۹۸۳ء

آج نو بجے تھائی ائیر لائینز کی فلائٹ سے ہانگ کانگ سے بنکاک روانگی تھی۔ ائیرپورٹ پہنچے اور ساری روایتی باتوں سے فارغ ہوکر جہاز میں آ بیٹھے۔ تھائی ائیر لائین میں مشرقی مہمان نوازی کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ سب سے پہلے ایک دوشیزہ سر سے پاؤں تک گلابی لبادے میں ملبوس پھولوں کی ٹوکری لئے آگئی۔ اس نے ایک ایک پھول ہمارے لباس پر ٹانکا، مسکرائی اور خوش آمدید کہا پھر آگے چل دی۔ یہ سب بہت اچھا لگا۔ اس دفعہ سیٹ بھی اچھی ملی تھی۔ باہر نگاہ دوڑاتی تو نیلے سمندر سے جھانکتی کالی چٹانیں جا بجا بکھری پڑی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے سرسبز جزیرے بعض آباد بعض غیر آباد انسان کی چشم کرم کے منتظر نظر آتے۔ آسمان سفید بادلوں کے گالوں میں چھپا ہوا تھا۔ ساؤتھ چائینا سمندر کا نظارہ تو بے حد دلکش لگا۔

پھر جلد ہی گھنے کالے سیاہ بادل آگئے۔ پائلٹ نے اعلان کیا کہ سیٹ بیلٹ باندھ لیں۔ بادلوں کے اندر سے گزرتے وقت دھندسی

Marfat.com

چھا جاتی اور جہاز لڑکھڑاتا۔ مجھے تو یہ سارا منظر بڑا خوبصورت لگ رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ تک یہ بادلوں کا سلسلہ رہا۔ پھر کپتان نے اعلان کیا کہ ہم ویت نام کے ساحلی علاقے سے گزر رہے ہیں۔ نیچے دیکھا تو ساحل کے ساتھ ساتھ عمارتیں نظر آتیں اور پیچھے وسیع سرسبز میدان جس کے درمیان ایک دریا بہہ رہا تھا۔ اندازاً سوچا کہ میکانگ ہو گا لیکن جانے کون سا علاقہ اور کون سا دریا۔ سفر جاری تھا اور تھائی ایئر ہوسٹسز کی مہربانیاں بھی اپنے عروج پر تھیں۔ کبھی کچھ لاتیں، کبھی کچھ۔ جتنا ان کے ملک میں تنگ ہوتی اتنا ہی اِن کی ہوائی جہاز میں سروس سے خوش۔ ایک دو منٹ کے لئے بھی فارغ نہ بیٹھنے دیا۔ لباس بھی مختلف قسم کے تھے۔ کوئی گلابی پری تھی تو کوئی سبز کسی نے نیلا لبادہ پہنا ہوا تھا تو کسی نے پیلی ساڑھی باندھی تھی یعنی دیگر ایئر لائن سے مختلف اس لحاظ سے تھیں کہ ان کا کوئی مخصوص لباس نہ تھا۔

نیچے نگاہ کی تو زمین مختلف خانوں میں بٹی نظر آنے لگی۔ اب ہم بنکاک کے نواح میں آ گئے تھے۔ بنکاک جسے فرشتوں کا شہر (CITY OF ANGELS) کہتے ہیں کیونکہ بنکاک کے لفظی معنی یہی ہیں۔ مگر وہاں کے لوگوں کی حرکات دیکھو تو CITY OF DEVILS زیادہ مناسب رہے۔ ایئرپورٹ سے نکلے تو ٹیکسی ڈرائیوریوں چمٹے جیسے بھیڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہو۔ ایک ایک پیچھے لگا ہوا۔ رنگ برنگ کے لالچ دیتے ہوئے۔ ہم آپ کو یہ مہیا کریں گے، وہ دیں گے۔ بس آپ خود ہی سمجھ جائیں کہ کیا کچھ کی پیشکش تھی۔ وہ لوگ تو پاس بیٹھی بیویوں

Marfat.com

کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ بہرحال، ایک ٹیکسی لی اور NEW DENINSULA ہوٹل میں آن پہنچے۔ ہوٹل اچھا تھا۔ کرایہ بھی مناسب۔ جدید سہولتوں سے مرصع۔ ایئرپورٹ سے نکلتے ہی بارش شروع ہوگئی۔ سڑک کے کنارے گدلا پانی نالیوں کی صورت میں بہنے لگا۔ شہر کچھ ایسا خاص نہیں لگا۔ متوسط بلکہ غریب طبقہ زیادہ تھا۔ کمزور مدقوق قسم کے آدمی۔ کسی نے لنگی باندھی ہے، قمیض غائب۔ کسی کی قمیض پینٹ موجود ہے تو وہ بھی پھٹی ہوئی۔ بعض لوگ تو ننگے پاؤں بھی تھے۔ آمدنی کا بڑا ذریعہ ٹورزم ہے۔ لیکن ٹورزم کے پردے میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ بہرحال ہماری رات بڑے آرام سے گزری۔ نیلا کمرہ، نیلے پردے، نیلا قالین، نیلی چادریں، نیلا تولیہ، غرضیکہ نیل کمل کا محل تھا۔ ایئرکنڈیشنڈ ہونے کی وجہ سے بڑی گہری اور پرسکون نیند آئی۔

سلیم مجھے ہوٹل چھوڑ کر پاکستانی ہوٹل کا پتہ کرنے نکلے۔ اپنے ملک میں تو تھائی سوپ پی لیتے ہیں مگر یہاں ڈر لگتا تھا کیونکہ سلیم صاحب کے ایک دوست یہاں سوپ وغیرہ پی کر چار پانچ دن ہسپتال میں رہے۔ ہم لوگوں نے باہر کھانے میں بڑی احتیاط برتی تھی۔ اس لئے ایک دفعہ بھی ہاضمہ بگڑنے کی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ ہوٹل مل گیا تو سلیم صاحب آکر مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ کھانا کھا کر شاپنگ کی سوجھی۔ تھائی سلک لیا جو بڑا مہنگا تھا۔ امی کی خاطر ایک سوٹ لیا تھا مگر ان کو پہننا نصیب نہ ہوا۔ زندگی ہی نے وفا نہ کی۔

ہمارے ہوٹل میں ایک سکھ درزی کی دکان تھی۔ اس کا نام امریک سنگھ

Marfat.com

تھا۔ اس نے سلیم صاحب کو لالچ دیا کہ آپ ابھی کپڑا خرید لائیں میں دو گھنٹے میں آپ کو سفاری سوٹ تیار کر دوں گا۔ سلیم صاحب نے بازار سے دو سوٹ کا کپڑا لیا۔ اُس نے چار گھنٹے میں دو جوڑے تیار کر کے حوالے کئے۔ اصل میں اس نے ہوٹل سے کچھ دور ایک عمارت میں سات آٹھ درزی بٹھا رکھے تھے۔ ناپ خود لیتا اور کپڑا اور ناپ ان کو بھجوا دیتا۔ وہ سارے لگ لگا کر جلد از جلد سوٹ تیار کر دیتے۔

اس سے مجھے ایک اپنا واقعہ یاد آیا۔ چکوال ہوسٹل میں تھے اور میرے پاس سوئیٹر نہیں تھا۔ سردی شروع ہوگئی۔ اب گھر سے جا کر کوئی لاتے یا دے جاتے۔ اسی انتظار میں تھی میری سہیلوں نے کہا کہ تم اُون منگواؤ۔ ہم ایک دن میں تمہیں فل سلیوز سوئیٹر تیار کر کے دیتے ہیں۔ میں نے اون منگوائی۔ ایک نے پچھلا حصہ بنایا ایک نے اگلے دو حصے۔ ایک نے دو بازو بنائے۔ سی سلا کر دوسرے دن مجھے سوئیٹر پہنا دیا۔ امریک سنگھ بھی اپنے گاہکوں سے کچھ ایسا ہی سلوک کرتا تھا۔

ہوٹل والے ٹور بک کر کے دیتے تھے کہ جو قابلِ ذکر یا قابلِ دید جگہ دیکھنی مقصود ہو اس کے لئے اپنی بکنگ کروالو۔ سلیم صاحب کہنے لگے کچھ دیکھنا ہو تو ٹور بک کروا لیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ بس بہت ہو چکی سیر۔ اب تو کسی بات میں دل نہیں لگتا۔ آپ نے کہیں جانا ہو تو ہو آئیں میرا تو یہ حال ہے کہ ؎

عادت سی بنا لی ہے تم نے تو منیرؔ اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اکتاتے ہوئے رہنا

Marfat.com

سلیم صاحب اکیلے ہی شہر کی سیر کو نکل گئے۔ وہیں ان کو کوئی اپنے واقف کار بھی مل گئے۔ ان کا وقت بڑا اچھا گزرا۔ میں نے بھی فرصت جان کر جہلم کال بک کروائی۔ بچوں کو بتایا کہ آپ سب کل آپا خالہ کے ہمراہ پنڈی آجائیں۔ شام تک ہم آہی جائیں گے۔ سبھی بڑے خوش ہوئے فون کر کے ان کی آواز سن کر دل کو سکون ہوا۔ پھر جو سوئی تو رات آٹھ بجے آنکھ کھلی۔ وہ بھی سلیم صاحب کے فون سے کہ بور تو نہیں ہو رہی ہو۔ میں نے کہا نہیں، لیکن آپ یاد رکھیں کہ رات گیارہ بجے کی فلائٹ سے ہمیں اس شہر سے جانا ہے۔ کہنے لگے میں نو بجے پہنچ جاؤں گا۔

نو بجے سلیم صاحب واپس آتے تو میں سامان باندھے چلنے کو تیار بیٹھی تھی کہ کب آئیں اور کب روانہ ہوں۔ ٹیکسی ہمیں لے کر DON MUANG کے انٹرنیشنل ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہوئی۔ خدا کا شکر ہے کہ سفر کا اختتام بخیر و خوبی ہو رہا تھا۔ بنکاک سے کراچی کا سفر کالے اندھیرے کی دبیز چادر کے اندر طے ہوا۔ کراچی کا ہوائی اڈہ آیا تو نہ صرف یہ کہ نظر میں روشنیاں ہی روشنیاں تھیں بلکہ دل و دماغ بھی ان روشنیوں سے منور تھا۔ اندر باہر کا موسم ایک ہو رہا تھا۔ اپنا ملک اپنا وطن کس قدر پیارا ہے یہ کوئی اس وقت میرے دل سے پوچھتا۔ پاکستان کی فضا میں داخل ہوتے ہی اپنائیت اور محبت کے نرم گرم احساسات نے جسم و جان کے گرد ایک خوبصورت حصار قائم کر دیا۔ دل یہی چاہتا تھا کہ وطن کی سرزمین کو چوم چوم لوں۔

رات کے تین بجے کراچی پہنچے مگر یہاں ڈیڑھ بجا تھا۔ سلیم صاحب

Marfat.com

نے اپنے ایک دوست کو اطلاع کر دی تھی، وہ منتظر تھے۔ ان کے ساتھ گھر پہنچے، چائے کے ساتھ کچھ کھایا پیا اور پڑتے ہی سو گئے۔ خیال تھا کہ بنکاک میں، میں نے خوب آرام کر لیا ہے ساری تھکاوٹ اتار لی ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا تھکاوٹ تو انگ انگ میں رچ بس گئی تھی، آہستہ آہستہ ہی اترے گی۔

صبح کافی دیر سے نیند کھلی گھر والے ابھی تک سو رہے تھے۔ ہم جہاں کہیں گئے اکثر گھر والوں نے یہی وطیرہ رکھا کہ ہم سے بعد میں اٹھتے۔ نتیجتہً میں باورچی خانے میں گھس کر چائے ناشتہ خود بنایا کرتی تھی۔ لیکن اپنے ملک پاکستان میں یہ امید نہ تھی کہ خود ہی چائے بنانی پڑے گی۔ چنانچہ ہوا بھی یہ کہ ہمارے منہ ہاتھ دھونے تک چائے آگئی۔ نو بجے ناشتہ سے فارغ ہوتے تو میزبان کہنے لگے۔ "آج ۶ ستمبر ہے چھٹی ہے۔ چلئے میں آپ کو سیر کرواتا ہوں"۔ میں نے کہا "سیر کا نام نہ لیں سیر تو بڑی کی ہے"۔ کہنے لگے "وہ تو دوسرے ملکوں کی تھی آج اپنے دیس کے سب سے بڑے شہر کو بھی دیکھ لیں"۔ سلیم صاحب بھی ہاں میں ہاں ملانے لگے "کہ تم اکثر گلہ کرتی تھیں کہ میں نے کراچی نہیں دیکھا، سمندر نہیں دیکھا، چلو آج چلو۔"

چنانچہ گاڑی میں بیٹھ کر قائداعظم کے مقبرے، کلفٹن، زیب النساء سٹریٹ اور طارق روڈ کے چکر لگائے۔ اس دن چھٹی تھی، ہماری طرح اور بھی مخلوقِ خدا نکلی ہوئی تھی۔ اگرچہ باہر کے شہروں کے مقابلے میں کراچی پھیکا پھیکا سا لگا، اتنی رونق بھی نہ لگی مگر ان سب جگہوں پر پھرتے ہوئے

Marfat.com

مسرت و انبساط کی لہریں دل میں اٹھتی رہیں کہ یہ اپنا ملک ہے، اپنوں کا پیارا ملک ہے۔

واپسی پر دوپہر کا کھانا کھا کر سلیم صاحب تو آرام کے لئے لیٹ گئے۔ میں نے سامان میں سے بچوں کی چیزیں نکال کر علیحدہ علیحدہ پیک کیں کہ ہر ایک کو اس کا لفافہ پکڑا دوں گی۔ چاتے پی کر کراچی ایئرپورٹ پہ آ گئے۔ باہر ملکوں میں تو صرف گرمی تھی۔ یہاں پر بے پناہ گرمی تھی، پھر جہاز میں سوار ہوتے تو شاید ان کا ایئر کنڈیشنگ سسٹم خراب تھا۔ وہاں تو دل بے حد گھبرایا۔ خدا خدا کر کے اسلام آباد آیا۔ باہر نکلے تو شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ گھر پہنچے تو بچوں کو منتظر پایا۔ خدا تعالیٰ کا بزرگ و برتر کا شکر ادا کیا۔ پھر مہینوں گھرداری میں کچھ یوں الجھی کہ کچھ یاد نہ رہا۔ ایک دن سوچا کہ ؏

رنجِ سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو

تاکہ دل گھبراتے یا اکتاہٹ حملہ آور ہو یا بڑھاپے میں وقت گزارنا مشکل ہو تو یادِ سفر کر کے دل خوش کر لیا کریں گے۔ اور

یاد آئیں گی کسی شوریدہ سر کی وحشتیں

تو یوں صاحبِ سفرِ آرزو، لکھنے کی تحریک ہوئی ؂

Marfat.com